10.30

سوانح قائدِ ملت

حضرت مولانا مفتی محمود رح

مولانا
عبد القیوم حقانی

تذکرہ و سوانح
سیرت و اخلاق
تحصیلِ علم و تکمیل
درس و افادہ
ذوقِ علم و شوقِ مطالعہ
علمی انہماک
زہد و تقویٰ
عشقِ رسول و اہتمامِ سنت
تواضع و عبدیت
عظمت و توکل
بے نفسی و فنائیت
سیاسی بصیرت و عظمت
علمی و دینی و سیاسی کارنامے
حکمت و بصیرت
ظرافت و بذلہ سنجیاں
مرزائیت کا تعاقب
ردِ فرقِ باطلہ
اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد
اور مساعیٔ مسلسل
قید و بند کی صعوبتیں
الغرض
ایک تاریخ، ایک تحریک
اور ایک انقلاب کی داستان

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس
خالق آباد نوشہرہ، سرحد پاکستان

2006

سوانح قائد ملت

حضرت مولانا مفتی محمودؒ

تالیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

تذکرہ وسوانح، سیرت واخلاق، تحصیل علم وتکمیل، درس وافادہ، ذوق علم اور شوقِ مطالعہ، علمی انہماک، زہد وتقویٰ، عشقِ رسولؐ واہتمام سنت، تواضع وعبدیت، عزیمت وتوکل، بے نفسی وفنائیت، سیاسی بصیرت وعظمت، علمی ودینی اور سیاسی کارنامے، حکمت وبصیرت، لطائف وبذلہ سنجیاں، مرزائیت کا تعاقب وردِّ فرقِ باطلہ، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد اور مساعی مسلسل، قید وبند کی صعوبتیں الغرض

ایک، تاریخ، ایک تحریک اور ایک انقلاب کی داستان

ناشر

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، نوشہرہ، سرحد، پاکستان

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

84657

نام کتاب ---------- سوانح قائد ملت مولانا مفتی محمودؒ
تالیف ---------- مولانا عبدالقیوم حقانی
کمپوزنگ ---------- جان محمد جانؔ رُکن القاسم اکیڈمی
ضخامت ---------- 336 صفحات
تاریخِ طباعت اوّل ---------- ربیع الاول ۱۴۲۳ھ/ جون 2002ء
تاریخِ طباعت بارِ سوم ---------- صفر المظفر ۱۴۲۷/ مارچ 2006ء
قیمت ---------- 120 روپے
ناشر ---------- القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، نوشہرہ

ملنے کے پتے

☆ صدیقی ٹرسٹ، صدیقی ہاؤس المنظر اپارٹمنٹس 458 گارڈن ایسٹ، نزد لسبیلہ چوک کراچی
☆ مولانا سید محمد حقانی، مدرس جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد، ضلع نوشہرہ
☆ کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ کلاتھ مارکیٹ، راجہ بازار، راولپنڈی
☆ مکتبہ سید احمد شہید، ۱۰ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
☆ زم زم پبلشرز، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی
☆ مولانا خلیل الرحمٰن راشدی صاحب، جامعہ ابوہریرہ، چنوں موم ضلع سیالکوٹ

اس کے علاوہ اکوڑہ خٹک اور پشاور کے ہر کتب خانہ میں یہ کتاب دستیاب ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ نمبر
پیش لفظ -----	13
عرض مؤلف -----	17
اظہار تشکر و امتنان -----	22
آہ! شیرازہ اسلام پریشان دیدم۔	25

باب ۱

مضامین	صفحہ نمبر
خاندانی پس منظر، مشیتِ الٰہی کی فیصلے اور نظامِ تکوین کی تشکیل وانتخاب	27
خانقاہ یٰسین زئی کے سادات --	29
اور مفتی صاحب کا خاندان ---	//
شہاب الدین خان کی پیش کش۔	30
علمی وروحانی مرکز کی تشکیل --	//
سادات کا خاندان خیمہ زن --	31
حضرت خلیفہ محمد صدیقؒ ---	//
خلیفہ صاحب کی شادی -----	32
خانقاہ یٰسین زئی آمد --------	33
اپنے والد سے کسب فیض ----	//
شاہ عبدالعزیزؒ سے کسب علم ---	//
سفر ہند کے لئے روانگی -----	34
اساتذہ کی شفقتیں ------	//
مولانا امروہویؒ، اعطاءِ سند۔	35
ناداری میں صبر و استقامت ---	//
جامعہ عزیزیہ میں تدریسی خدمات	36
عبدالخیل میں قیام اور تدریس --	//
قاسم العلوم ملتان میں تقرر ----	37
علمی و سیاسی شخصیت کی تشکیل --	//
جمعیت علمائے اسلام کی قیادت۔	//
قدرت کا تکوینی نظام ------	38
حکیم لم یزل کا تکوینی انتخاب --	//
مشیتِ الٰہی کے فیصلے -------	39
پنیالہ کا انتخاب کیوں؟ ------	//
علم وعرفان کا ماہتاب ------	40
مقام امامت ---------	//

مضامین	صفحہ نمبر
تمام تر مساعی کا ہدف ------	40
مفتی صاحبؒ سے محبت کے تقاضے	41
باب ۲	
خاندان، ولادت، تعلیم ابتدائی حالات اور دلچسپ واقعات	42
خاندان ------	42
والدین ------	//
ولادت ------	43
ابتدائی تعلیم ------	//
والد صاحبؒ کی تربیت ونگرانی --	44
صرف ایک جملہ ------	45
اعلیٰ دینی تعلیم ------	46
مولانا امروہویؒ سے استناد ----	47
اساتذہ کرام ------	48
حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ	49
حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ	//
حضرت مولانا عجب نور صاحبؒ	50
حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ	51
حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحبؒ	51
حضرت مولانا سید عبدالعزیز شاہؒ	52
استاد کی نگاہ ودعا ------	53
اساتذہ سے تعلق اور غایت احترام	55
{محمود کا جواب پہلے بھی درست	--
تھا، اب بھی درست ہے}----	56
محمود تم ٹھیک کہتے تھے ----	57
فقاہت وبصیرت کا حسین امتزاج	//
"حمد اللہ" مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے۔	58
نماز میں انہماک ------	//
میں نے جمعہ پڑھا دیا ہے ----	60
باب ۳	
درس وتدریس، علمی انہماک وافادہ، ذوقِ ادب اور شوقِ مطالعہ	62
حمیتِ اسلامی کا حیرت انگیز واقعہ	63
مولوی محمود کی ایک شرط ----	64
باجرے کی روٹی ------	66

مضامین	صفحہ نمبر
کھیل اور ورزش	67
محبوب مشاغل	//
چاند ماری	//
قاسم العلوم ملتان میں آغاز تدریس	68
مفتی صاحبؒ مسند حدیث پر	69
اندازِ تدریس اور شوقِ مطالعہ	//
تدریسی انہماک	70
پختگی اور وسعت علم	71
دینی مدارس کی اصل روح	73
بیماری میں چھ گھنٹے درس	74
حضرت گنگوہیؒ کا واقعہ	//
طالبان علوم نبوت پر شفقت	//
اضافے کا مطالبہ، حکیمانہ طرز عمل	76
ایک شفیق اتالیق	77
سراپا شفقت	78
دورہ تفسیر	79
درس تفسیر کی ایک جھلک	//
دعوت وتبلیغ کی ترغیب وتاکید	80
مفتی صاحبؒ کی زندہ تصانیف	85
ذوق شعر وادب	86
مفتی کفایت اللہؒ کا مرثیہ	87
باب ۴	
تقویٰ وانابت، اتباعِ سنت مہمان نوازی، سادگی و تواضع اور فنائیت	90
عالم سے بڑھ کر عارف	91
نماز سے عشق	//
لاکھوں میں ایک	92
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز	93
اشاروں سے نماز پر موت کو ترجیح	//
مفتی صاحبؒ کا بلک بلک کر رونا	94
قرآن مجید سے تعلق ومحبت	95
اتباع سنت	96
اتباع سنت کا اہتمام	97
یہی ایک سجدہ ہی تو ہے	98
صحابہ کرامؓ سے محبت	99
صدقات نافلہ اور تبرعات	100
بچوں کی مٹھائی	//
مہمان نوازی	101
وزیر اعلیٰ نہیں، مفتی محمود ہوں	//

مضامین — صفحہ نمبر

ہم بہت غریب اور چھوٹے لوگ ہیں 102
نہ زیادہ غریب ہوں اور نہ بے مروت //
مہمان کا اکرام ---------- 103
دال نہ کھاؤں تو کیا کروں ---- 104
پرہیز انے ------------- 105
چینی ختم ہوگئی ------- //
تواضع کی انتہا -------- 106
بلندی اخلاق -------- 107
کارکنوں کا اکرام ------- 108
صبر وتحمل اور اکرام مسلم ----- //
دل کے غنی تھے -------- 109
دس ہزار کا چیک ------- //
اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے -- 110
وزیر اعظم بھٹو کا تحفہ مسترد کر دیا۔ 111
خالی چیک یا گندگی کا ٹوکرا --- 112
استغناء کی تلوار -------- 113
بددیانتی کا سبق -------- 114
جماعت کی امانت -------- 115
چنے کھانے سے انکار کر دیا --- 116
نشہ آور دوائی سے اجتناب --- //
طواف زیارت کا اعادہ ---- 117

باب ۵

اخلاص وتحمل، فقر وقناعت حکمت و تدبیر اور مخالفین سے حسن سلوک 119

شہرت وریا سے نفرت ----- 120
بزم محمود نہیں، بزم شیخ الہند ---- //
انکساری وتواضع -------- 122
ڈبے سے پیچھے ہٹ جائیے --- 123
کس چکر میں پڑ گئے ہو ----- 125
سرمایہ حیات ---------- 126
چار آنے کی دال اور چند روٹیاں 127
نہ کہیں نگاہ، نہ کوئی نگاہ میں ---- 129
محمود و ایاز ایک ہی صف میں۔ 130
قابل اعتماد سیکرٹری کون؟ ---- 131
سعودی حکومت کے مہمان --- 132
قرونِ اولیٰ کی سادگی ------ 134
تاریخ کے ابواب کا عنوان --- 135
میرے گھر سے یہ سامان نکلا --- 136
تحمل، حلم اور بردباری ----- 137

مضامین — صفحہ نمبر

وزیراعلیٰ گھاس کے فرش پر ---- 137
دلچسپ صورتِ حال ---- 139
وزیراعلیٰ کو خوب ڈانٹا ---- 140
سننا بھی مردانگی ہے ---- 142
میں نوکر ہوں ---- 143
فراست کا شرعی حکم ---- //
میرا گریباں حاضر ہے ---- 144
مفتی صاحبؒ آبدیدہ ہو گئے ---- //
زندگی کی کیا ضمانت ہے ---- 146
کون گورنر؟ کون وزیراعلیٰ؟ ---- //
تحمل اور بردباری ---- 148
والدین کے نکاح کے گواہ ---- 149
قبل از وقت بالغ ہو گیا ---- //
تدبر و تحمل اور حکمت و تدبیر ---- 151
سیاسی مخالفین سے حسن سلوک ---- 153
مردِ قلندر کی بارگاہ ---- 155

باب ٦

عشق رسولؐ، ختم نبوت سے والہانہ عقیدت اور فرق باطلہ کا تعاقب 157
محمد عربیؐ کا سلام ---- 158
خستہ دلوں کے لئے سرمایہ تسکین 159
محدث کو زیارت رسول ﷺ ---- 160
خواب میں فقہ کی طرف توجہ ---- //
محمد عربیؐ بلا رہے ہیں ---- 161
عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ ---- 162
وسیلہ نجات ---- //
اسلام کا اساسی عقیدہ ---- //
مرزا ناصر پر مفتی صاحبؒ کی جرح 163
سب کمیٹی ---- 167
مرزائیوں کا نام اقلیتوں میں ---- //
وزیراعظم بھٹو کی آخری مذموم کوشش 168
شیطان، ابلیس، خنزیر اور قادیانی ۔ 169
تاریخی فیصلہ ---- 170
تین سفارشات ---- 171
مبارک باد ---- //
{پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو کافر قرار دے دیا ----} 172
مولانا بنوریؒ کے سجدے ---- 173
{ایران میں شیعہ رہنماؤں سے دلچسپ مکالمے ----} 174
متین اور سنجیدہ گفتگو ---- 175
{ڈاکٹر دوالیبی کو رجم کے موضوع پر مسکت جواب ----} 176

مضامین	صفحہ نمبر
رجم کی حکمت کیا ہے؟	177
حضرت ماعزؓ کا اعتراف گناہ	178
غامدیہؓ کا واقعہ	179
اسلام دین حکمت ہے	180
زوردار عقلی دلائل	//
علماء کو چیلنج	181
مناقشہ	182
باب ۷	
علمی عظمت، فقہی مقام اور فقہی بصیرت کے چند نمونے	183
فقیہ النفس	183
وسعتِ مطالعہ	184
ملاقات پر تشکر و امتنان	185
مولوی محمود کون ہے؟	//
شیخ الہندؒ حضرت مدنیؒ کے صحیح جانشین	186
زیرک انسان	187
وہ اس دور کے آدمی نہیں تھے	//
مفتی اعظم پاکستان	188
طبعی اور فطری وصف	188
گوہر قابل	189
فقہی مسائل کی ترجیح دلائل پر ہے	//
علمی مجالس کے روح رواں	190
فتویٰ لکھنے میں معمول	191
میں مفتی ہوں	192
مشینی ذبیحہ	193
مفتی صاحبؒ کا فقہی استدلال	194
ناجائز کی سفارش کو جائز نہیں سمجھتا	196
ایک قابل اعتماد مفتی	197
طریق معلومات اور طرز استدلال	//
گٹر کا مسئلہ اور علماء سے مذاکرہ	198
فتاویٰ مفتی محمود	199
خاک شفا اور مٹی کھانے کا حکم	//
اہل علم کو گالیاں دینا	200
مسجد میں سپرے کا حکم	201
مسجد میں بجلی کنکشن لینے کا حکم	//
فقہی مسئلہ زندگی کا آخری کام	202

باب ۸

مضامین	صفحہ نمبر
محدثانہ جلالتِ قدر تصنیف وتالیف، دعوت وخطاب، زبان وادب اور درسی افادت	206
محدثانہ جلالتِ قدر	208
درسی افادات کی چند مثالیں	//
وضو کیساتھ گناہوں کے نکلنے کی تشریح	209
{حدیثِ قلتین کی آسان اور عام	--
فہم تشریح}	210
حدیث وضع جریدتین	212
تحریری افادات اور ادبی شہ پارے	213
زاد المنتہی کا مختصر تعارف	214
ملک وملت کے مسائل کا واحد حل	//
خلوص نیت	215
دستور کا تقدس	//
دیدہ بینا	216

مضامین	صفحہ نمبر
وعظ وتبلیغ	217
دعوت وخطابت	218
حضرت مفتی صاحب کی تقریر	//
منفرد خطیب	219
ایک حکیمانہ تدبیر	220
وعظ وتبلیغ فریضہ منصبی	222
عربی میں حضرت مفتی صاحبؒ	--
کے ہم پلہ	//
عربی ادب وخطابت	223
خطبات سے اقتباسات	224
نظام حیات	//
قومی بیداری کا وقت	225
سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جنگ	226
{امریکی سامراج، عالم اسلام کا	--
بڑا دشمن}	227
پورے کلمہ پر عمل کی ضرورت	228
اعمال تولے جائیں گے	229
دار العلوم دیوبند ایک تحریک	230
اسلامی نظام کی ترویج	231
مضبوط اسلامی آئین	232
علماء کا فرض	

مضامین — صفحہ نمبر

باب ۹

جرأت و بہادری، عزیمت و استقامت اور نفاذِ شریعت کے لئے جدو جہد 234
اہم جوہری وصف ---------- 234
عزیمت و استقامت ---------- 235
نڈر اور بے باک داعی ---------- 236
عزم و ہمت کا ہمالہ ---------- 237
کوہِ استقامت ---------- 239
گولیوں کی بوچھاڑ میں ---------- 241
مذہب و سیاست کا حسین امتزاج 242
روٹی مانگنا جرم نہیں ---------- //
تابناک تاریخی روایات ---------- 243
آمریت کے خلاف پہلی بغاوت -- 244
عائلی قوانین کے خلاف احتجاج --- //
قانون وراثت پر معرکۃ الاراء بحث 245
تحریک ختم نبوت ---------- 249
تحریک نظام مصطفیٰ ---------- 250
حب الوطنی ---------- //
سیاست کو بھی عبادت سمجھتے تھے۔ 251
حضرت مفتی صاحبؒ کا مشن۔ //

باب ۱۰

حکومت اور حکمت کا حسین امتزاج، منکرات کا سدِ باب، بلندی اخلاق اور بادشاہی میں فقیری 254
تنخواہ لینے سے انکار کر دیا ---- 256
قیمتی بنگلہ بھی ٹھکرا دیا ---- //
نرا مولوی، ذہن کے دریچے -- //
پُرامن اور مثالی دورِ حکومت --- 258
حکومت اور حکمت کی ایک عمدہ مثال //
{معروفات کی اشاعت اور --- --
منکرات کا سد باب ------} 261
تصویر درست نہیں ------- //
تصویر اور اکابر علماء دیو بند کا وتیرہ۔ 262
حضرت رازیؒ کا ارشاد ------- 263
مولانا مفتی کفایت اللہؒ کا ارشاد //
فوٹو کا جواز فریبِ نفس ہے --- 264

مضامین — صفحہ نمبر
اپنی تصویر ضائع کرادی۔۔۔۔۔۔ 264
شراب پر پابندی۔۔۔۔۔۔ 265
آخرت کا خسارہ برداشت نہیں۔ 266
جو شراب پیئے گا' وزیر نہیں رہے گا۔ //
سابق صدر یحیٰی خان پر شراب بند۔ 267
بلاسود قرضوں کا اجراء۔۔۔۔۔۔ //
سرکاری لباس۔۔۔۔۔۔ 268
,,بڑا صاحب،، کون ہے؟۔۔۔۔ //
تھانیدار کی آذان۔۔۔۔۔۔ 269
جس وقت جس نے چاہا آ جگایا۔۔ //
تمیز آقا و غلام نہ رہے۔۔۔۔۔۔ 270
درویش وزیر اعلیٰ کی بلند اخلاقی۔۔ //
وہ ڈرائیور کہاں ہے؟۔۔۔۔۔ 271
وزیر اعلیٰ پان کی دکان میں۔۔۔ 272
گاؤں کی کھلی فضا میں۔۔۔۔۔ //
وزیر اعلیٰ ایک چادر پر لیٹے رہے۔۔ 273
مفتی صاحبؒ کے معالج کا بیان۔ //
میں ٹیکسی میں آجاؤں گا۔۔۔۔ 274
پرائیویٹ روم کی فیس ادا نہیں کر سکتا //
حضرت مفتی صاحبؒ کا جائے نماز 275
ان کے پاس اپنی جیب بھی نہیں۔ //
وزارت علیاء سے استعفیٰ۔۔۔ 276
استعفیٰ میں تین منٹ۔۔۔۔ //
کرسی اقتدار پر تین حرف۔۔۔ 278

مضامین — صفحہ نمبر
محبوبیت و مقبولیت۔۔۔۔۔۔ 278
اماں جیؒ پر خصوصی عنایت۔۔۔۔ 279
مسلمان حکمرانوں کی مثال۔۔۔ 280

باب ۱۱

لطافت وظرافت' حاضر جوابی' علمی مباحثے اور لطیف چٹکلے 282
گل افشانی گفتار۔۔۔۔۔۔۔ 283
ہاتھ سے کھانا سنت ہے۔۔۔ 284
حکیمانہ' ظریفانہ مرقعے۔۔۔ //
تم بھی تو ضعیف ہو۔۔۔۔۔۔ //
اب دال۔۔۔۔۔۔۔۔ 285
میں تو رسول نہیں ہوں۔۔۔۔ //
محفل زعفران۔۔۔۔ //
طلبہ سے محبت اور بے تکلفی۔۔۔ 286
غریبوں کو کیوں تنگ کرتے ہیں 287
مجھے تو کونین نہیں ملتی۔۔۔۔۔ //
کلیوں کا تبسم۔۔۔۔۔ 288
آج ہم سب ثرید کھائیں گے۔ 289

مضامین — صفحہ نمبر
مبارک ہو بھائی پیدا ہوا ہے --- 290
چائے کھایئے --------- 291
پراسرار آدمی، پراسرار اشارے۔ 292
زہد خشک -------- 294
عملی ثبوت بھی ہونا چاہیے --- //
حاضر جوابی اور علمی گرفت --- 295
لکڑی کو سونا ثابت کر دیں --- 296
حریف کو ماننے بغیر چارہ کار نہ رہتا 297
پوری اسمبلی میں ایک بھی مرد نہیں۔ //
قومی اسمبلی کا ممبر کیسے بننا چاہیے۔ 299
فقہ اور قانون کا ماہر کون؟ ---- 300
صدر ضیاء الحق لاجواب ہو گئے -- 301
حرام اور پلید کا فرق ------ 302
بھٹو کے سوال کا جواب ----- //
واک آؤٹ کا شرعی ثبوت ---- 303
مسافر کی امامت -------- //
ہل اور تلوار -------- 304
آئندہ آپ کا مقابلہ نہیں کروں گا' 305

باب ۱۲

سفر آخرت 306
لطفِ الٰہی کا انتخاب ---- 309

مضامین — صفحہ نمبر
آخری حج کے لئے سفر --- 310
غلطی سے رجوع کر لوں گا --- 312
تین اعتراض -------- //
آسان ترین موت ----- 314
لائق رشک موت ------ 315
مفتی صاحبؒ سے آخری ملاقات 316
وقت کی پابندی ------ 317
افراد کا احرام ------- 318
پان چائے سے بدتر ------ //
چند منٹ کے مہمان ----- 319
فقہی نقطہ نظر سے گفتگو --- //
تین فقہی اشکالات ------ 320
پیغام اجل --------- 321
مبارک خاتمہ -------- 322
تہجد بھی قضا نہ ہوئی ---- 323
وفات سے قبل ------ 324
غسل اور نماز جنازہ ----- 325
آخری دیدار -------- 326
ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی کے تاثرات 328
شاید تیاری ہو جائے ---- 330
مفتی صاحبؒ زندہ رہیں گے۔ 331
زعیم جہاد و عزیمت کے --- 332
صدی کی موت ------- 334
کاروانِ عزیمت کا آخری جرنیل //
لافانی مرثیہ ------- 335

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از مجاہد کبیر شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب مدظلہ العالی

" مخدوم ومکرم استاذ العلماء المجاہد الکبیر شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب المدنی مدظلہم اپنے وقت کے عظیم محدّث، لائق ترین مدرس، مردِ قلندر اور اکابر علماء دیوبند کے علوم و معارف اور ان کے مسلکِ اعتدال کے امین ہیں۔ مرکزِ علم مادرِ علمی دیوبندِ ثانی جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے مسندِ حدیث کے صدر نشین ہیں۔ احقر کے علمی و دینی مساعی پر بے حد خوش ہوتے ہیں اور طالب علمانہ کاوشوں کی بے حد قدر فرماتے ہیں۔ ان سے ہمت افزائی، حوصلہ، تشجیع اور دعائیں ملتی رہتی ہیں۔

سوانح قائدِ ملت مولانا مفتی محمودؒ کے مسودات ان کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے پیش کئے تو حضرت نے نہ صرف یہ کہ انہیں ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا بلکہ اپنے مبارک ہاتھوں سے ایک وقیع مکتوب گرامی بھی تحریر فرمایا اور خصوصیت سے وقت نکال کر حضرت مفتی صاحبؒ سے متعلق اپنے مشاہدات، معلومات اور واقعات بھی قلم بند کرائے جو سوانح قائدِ ملت کے

مختلف ابواب میں بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح جوڑ دیئے گئے ہیں ۔ حضرت مدظلہ کی وقیع تحریر اس گنہ گار مولف کے لئے دنیا میں استناد اور آخرت میں نجات کا وسیلہ ہے ۔ حضرت کی اسی تحریر کو بطور تبرک کے سوانح قائدِ ملت کا پیش لفظ بنا دیا گیا ہے ۔"

صاحب المجد و الهمم فخر الأماثل حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی زاد کم الله تعالیٰ سعادةً و کرامة و تقبّل جهود کم الطیّبة فی سبیل خدمة الإسلام و المسلمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ! آپ کی تازہ ترین زرّین تصنیف "سوانح قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ " کے کمپوز شدہ ابواب اور مکتوبِ سامی صدہا مسرتوں و انبساطات کے باعث بنے ۔ آں محترم نے اس ناچیز کو اس عظیم الشان وقیع تالیف سے استفادہ و مطالعہ سے سرفراز فرمایا ۔ ہفتہ عشرہ سے طبیعت کمزور ہے ۔ کمر میں شدید درد اور وجع المفاصل کی وجہ سے طویل مطالعہ کے لئے بیٹھنا دشوار ہے مگر اس نادرۂ روزگار، شیخ اکبر، فقید المثال، عبقری، مقدس اور محبوب شخصیت کی پاکیزہ حیاتِ طیبہ کے عبرت آموز واقعات، اس کی عظمت و عزیمت، ثبات و استقلال، حق گوئی و بے باکی، جرأت و شجاعت، مثالی عمیق علم و معرفت کے کارنامہائے نمایاں پڑھنے کے لئے اولین فرصت میں بیٹھا اور والہانہ شوق و ذوق کے ساتھ آپ کی اس جدید بیش بہا تالیف کا مطالعہ شروع کیا ۔

بحمد اللہ تمام ارسال کردہ ذہبی اوراق ایک ہی نشست میں باصرہ نوازی کے

باعث بنے۔ مسلسل پڑھنے سے طبیعت درست ہوئی۔ دل و دماغ معطر ہوئے، آپ کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلیں۔

و رد الكتاب بما أقرّ الأعينا و شفى القلوب فنِلْن غاياتِ المُنىٰ
و تقاسم الناس المسّرة بينهم قسماً و كان أجلهم حظاً أنا

(کتاب کے ورود سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، بیمار دلوں کو شفا ملی اور بلند و عظیم مقاصد حاصل ہوئے، لوگوں نے آپس میں خوشیاں بانٹیں اور مجھے ان مسرتوں میں سب سے زیادہ حصہ ملا)

بندہ کو زبدۃ العلماء، صفوۃ المشائخ حضرت مولانا مفتی محمود قدس سرہ کے سوانح حیات اور مبارک تذکروں پر بیس سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں، مختلف رسائل و جرائد کے پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ لاقوۃ اِلا باللہ، آپ کی مایہ ناز انمول تالیف "سوانح قائدِ ملت" سب سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کے تصانیف پر گوئے سبقت لے گئی ہے۔ آپ نے اپنے خداداد ملکۂ تصنیف و تالیف، ادبی قوتِ تحریر کی بدولت اس مردِ قلندر، فقیہ العصر، شیخ الکل فی الکل عبقری شخصیت کی معطر و منور حیاتِ طیبہ کے تمام جوانب، پوری جامعیت کے ساتھ عجیب دلکش ترتیب، روح پرور تبویب، شستہ و شگفتہ و سلیس و فصیح اور بلیغ پیرایہ میں زینتِ قرطاس فرما دیئے ہیں اور جا بجا قدسی صفات مصلحین، علمائے ربانیین اور عظیم المرتبت اکابر کے فرمودات و ارشادات کے جواہر پاروں سے اس نادر کتاب کی جاذبیت و افادیت میں اضافہ فرما دیا ہے۔

ایسے ہمہ گیر، مجسمۂ اخلاقِ حسنہ، جامع الصفات شخصیت کے تمام اہم بصیرت افروز اقوال و افعال، بے داغ زندگی کے احوال و وقائع کو کتابی شکل میں جمع کرنا رہتی

دنیا تک اربابِ فکر و نظر عموماً اور حضرت مفتی صاحبؒ کے ہزاروں تلامذہ، خوشہ چینوں اور لاکھوں وابستگان عقیدت پر احسان عظیم ہے۔

بحمد اللہ آپ کی موقر کتاب میں حضرت مفتی صاحبؒ کے اکثر و بیشتر عجیب و غریب سبق آموز واقعات ایسے ہیں جو حضرتؒ کی سوانح حیات پر مشتمل دیگر کتابوں میں نہیں ہیں۔ بندہ کو بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے بعض احوال معلوم ہیں جو ان کی کسی سوانحی کتاب میں درج نہیں ہیں۔ اگر آپ اپنے کسی مندوب کو مامور فرمادیں تو میں ان کو املاءً سنادوں گا تاکہ آپ کی اس گرانقدر کتاب کے ذریعہ محبانِ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے مزید سکون واطمینان کا ذریعہ بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمل میں مزید برکتیں نازل فرمادے اور ان دینی، مذہبی، علمی، تبلیغی مساعی جمیلہ کو شرفِ پذیرائی عطا فرمادے اور ان پیہم و مسلسل خدمات سے آپ کے میزان حسنات کو بھردے۔

وما ذلك علىٰ الله بعزيز وهو علىٰ كل شئ قدير و بالإجابة جدير، و صلّى الله تعالىٰ علىٰ أشرف رسله و خاتم أنبيائه و علىٰ آله و أصحابه أجمعين الطيّبين الطّاهرين۔

خادم الطلبا

شیر علی شاہ المدنی

شیخ الحدیث دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۱۵/۲/۱۴۲۳ھ

عرض مولف

الحمد لحضرة الجلالة و الصلوٰة و السلام علیٰ خاتم الرسالة

قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قدس سرہ العزیز کو ہم سے جدا ہوئے تقریبا بائیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ ان کی حیات و خدمات، شخصیت و کردار، افکار و اعمال، قیادت و سیادت، تالیف و تصنیف، فتاویٰ، خطبات و تقاریر اور سیاست و حکومت پر متعدد کتابیں اور بعض جرائد کے خصوصی نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں اور آج تک مختلف زاویوں اور عنوانات کے تحت یہ سلسلہ تا ایں دم بڑے ذوق و اہتمام کے ساتھ جاری ہے۔ یہ تمام کاوشیں قابل قدر، لائق ستائش اور قابل استفادہ ہونے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر بے حد نافع بھی ہیں اور ضروری بھی۔ مگر پھر بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی کتاب زندگی پر ایک ایسی جامع سوانح مرتب کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جس سے پڑھنے والوں کو سیرت و افکار میں جلا، اخلاص وللّٰہیت میں ارتقا، فکر و عمل میں انگیخت اور رواں دواں زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بھرپور رہنمائی یکجا مل سکے۔ جبکہ حضرت مفتی صاحبؒ سیرت و کردار اور افکار و خدمات کے حوالے سے آج بھی مسلمانوں کے دلوں میں زندہ و تابندہ ہیں۔

" سوانح قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ " کی ترتیب و اشاعت کا یہی ہدف ہے۔ حضرت قائد ملتؒ فقیہ النفس مفتی تھے، مفسر تھے، محدّث تھے، عارف کامل اور

شب زندہ دار عابد تھے، مبلغ و داعی تھے، عوام کے محبوب رہنما اور دینی سیاست کے امام تھے۔ الغرض دینی اور سیاسی لحاظ سے بہت بلند مقام کے حامل تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت کے حوالے سے لوگوں کو ہم کئی خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے خانہ میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کی معیت میں شب و روز گذارے اور ان کی صحبتوں، مجلسوں، خلوت، جلوت اور سفر و حضر کی رفاقتوں اور کفش برداریوں کی سعادت حاصل کرتے رہے۔

دوسرے خانہ میں وہ لوگ ہیں جو حضرت مفتی صاحبؒ سے متعارف تو ہیں، انہیں اپنا سیاسی قائد اور دینی رہنما بھی سمجھتے ہیں لیکن انہیں حضرت مفتی صاحبؒ کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

تیسرے خانہ میں وہ لوگ ہیں جو حضرت مفتی صاحبؒ سے غائبانہ تعارف رکھتے ہیں، وہ بھی صرف نام کی حد تک۔ اب ظاہر ہے ہر شخص کے تاثرات مختلف ہوں گے۔ کوئی انہیں مفسر سمجھتا ہے تو کوئی مسندِ حدیث کا تاجدار، کوئی انہیں مسجد کا خطیب و امام جانتا ہے تو کوئی حجازی لہجے میں قرآن پڑھنے والا بہترین مجود و قاری، کسی کی نظر میں وہ فقیہ ملت اور دینی پیشوا ہیں تو کسی کی نگاہ میں وہ عارفِ کامل اور اہل اللہ میں سے ہیں۔ بہت سے لوگ ایک کامیاب پارلیمنٹرین اور مخلص سیاستدان کے طور پر ان کی خدمات سے آگاہ ہیں تو کئی لوگ انہیں بالکل اہمیت دینے کے لئے تیار ہی نہیں کہ ہر شخص کا ہر شخص کے نزدیک محبوب اور معیوب ہونا ضروری نہیں۔ درجات کا تفاوت ہر شخص کے علم، سوچ اور مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔

" سوانح قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ " کی ترتیب و تالیف میں اصل مقصد یہ پیش نظر رہا ہے کہ ایک عام انسان کو عقل و شعور کی ابتدا سے لے کر آخر حیات تک جن جن مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کو بھی ان تمام راستوں سے گذرتا ہوا دکھایا جائے۔ تحصیل علم، اسفار، اسباق، فقر و غربت، افلاس و ناداری، زہد و عبادت، ریاضت و مجاہدہ، دعوت و تبلیغ، جہاد اور سیاست و حکومت۔ الغرض ہر شعبہ زندگی اور تینوں خانوں میں بٹے ہوئے لوگوں کے لئے حضرت مفتی صاحبؒ کی سوانح حیات میں فکر و عمل کی دعوت کا وافر سامان موجود ہو تا کہ حضرت قائد ملتؒ کی زندگی کے تمام گوشے سب کے سامنے آجائیں اور اصل حقیقت (کہ حضرت مفتی صاحبؒ اپنی تمام تر عظمتوں کے باوجود ایک انسان اور سچے مسلمان تھے) کو پہچان کر فکر و عمل کی صلاحیتوں کو جلا دی جا سکے۔

ہمیں یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ پیش نظر " سوانح قائد ملت " حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی پر ہر لحاظ سے جامع، مفصل، ہمہ جہتی اور تحقیقی تاریخ ہے جس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے آباؤ اجداد، خاندانی تاریخ سے لے کر ہمہ پہلو سوانحی نقوش کو اجاگر کیا گیا ہو۔ تاہم اصل ہدف کے اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر طالبان علوم نبوت اپنے زمانہ تحصیل علم میں حضرت مفتی صاحبؒ کی سوانح اور عملی زندگی سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، اساتذہ و مدرسین طریق تدریس اور طریق تعلیم میں انہیں رہبر اور رہنما دیکھنا چاہتے ہیں، اگر محدثین مسندِ حدیث پر درسی افادات کے حوالے سے ان کی انفرادیت، خصوصیات جاننا چاہتے ہیں۔ اہل علم ان کے علمی، تدریسی، تالیفی، تاریخی،

تحقیقی اور تقریری جواہر پارے تلاش کرنا چاہتے ہیں اور اہل سیاست آپ کے مدبرانہ سیاسی فیصلوں اور حکمت و بصیرت کے نقوش سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایسے حضرات کو سب کچھ نہ سہی تو بہت کچھ مواد اس سوانح میں ملے گا۔

لطف چمن ہے بادۂ گلگوں ہے یار ہے
اب موسم بہار میں مانگوں خدا سے کیا؟

* * *

ہمارا موضوع بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی سیرت و کردار کے وہ روشن پہلو اور کتاب زندگی کے وہ تابناک ابواب ہیں جنہیں پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت میں اہم خصائص اور اوصاف کون کون سے ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے ستاروں میں خورشید کی حیثیت حاصل کر لی۔

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

اور اب ان کے قائم فرمودہ نشان راہ پر چل کر تلاش منزل کی مساعی میں مصروف رہا جا سکے۔

بلاشبہ حضرت مفتی صاحبؒ کے پیغامات، ارشادات، افادات، دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات و حکایات ہمارے لئے مینارۂ نور، مرکز رشد و ہدایت، منبع علوم و فنون، منبع فیوض و برکات، ذخیرہ گفتار و کردار اور جہالت کے اندھیروں کے مقابلے میں ہدایت و رہنمائی کے چراغ کا درجہ رکھتے ہیں اور یہی ہمارا مقصد ہے کہ "سوانح قائدِ ملت" تمام انسانیت بالخصوص مسلمانوں کی سیرت و اعمال کو اسلامی عقائد و نظریات اور

اسلامی افکار و کردار کے سانچوں میں ڈھال دے۔

اس لئے ہم نے محض مناقب، فضائل، مدح سرائی، القاب آرائی، مبالغہ آمیزی، کشف و کرامات اور مبشرات و منامات سے حتی الوسع اجتناب کیا ہے اور حتی المقدور وہ پہلو سامنے لائے ہیں جو محرک فکر و عمل اور باعث انقلاب اسلامی ہوں، جنہیں پڑھ کر قارئین کے ذہن میں عمل کا داعیہ پیدا ہو۔ شخصیت سے زیادہ ہم نے حضرت مفتی صاحبؒ کی فکر، کردار، اعمال اور ان کے مشن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات، حکایات اور روایات کو اس انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر شخص کے ذہن میں صاحب سوانح کی پیروی اور نقش قدم پر چلنے کا عزم، اشتیاق اور ہمت پیدا ہو، اپنی کمزوریوں کا احساس ہو اور عمل نافع کا شوق پیدا ہو۔

تیری عنایتوں کا مجھے اعتراف ہے
مجھ کو میری حیات کا مقصد بتا دیا

عبدالقیوم حقانی
جامعہ ابی ہریرہ خالق آباد
نوشہرہ، صوبہ سرحد، پاکستان
۳۰ / اپریل ۲۰۰۲ء

اظہار تشکر و امتنان

سوانح قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی تصنیف کا ارادہ تو اسی وقت سے کرلیا تھا جب حضرت مفتی صاحبؒ کا سانحہ ارتحال پیش آیا مگر تکوینی طور پر ہر چیز کا اپنا وقت مقدر ہوتا ہے۔ پھر اس کے محرکات بھی پیدا ہوجاتے ہیں، دواعی بھی اور اسباب بھی۔

☆ جانشین قائدِ ملتؒ، المجاہد الکبیر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہ امیر جمعیت علمائے اسلام کا تہہ دل سے ممنون اور شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوصف کتاب کے مطالعہ ونظر ثانی کے لئے وقت نکالا۔ بعض واقعات اور تاریخی حوالہ جات کی اپنے قلم سے اصلاح بھی فرمائی جو اصل کتاب میں قوسین میں ان کے حوالہ سے درج کردی گئی اور کتابت شدہ مسودات اپنے ساتھ لاکر بنفسِ نفیس جامعہ ابوہریرہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا۔ **واجرھم علی اللہ**۔

☆ مخدوم ومکرم برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد عبداللہ صاحب نائب امیر جمعیت علماء اسلام صوبہ سرحد، اپنے مخلص ساتھی، مہربان دوست، علم پرور عالم دین و شفیق، علمی سفر میں ہر جگہ معاون ورفیق بلکہ بعض مرحلوں میں تو ہاتھ سے پکڑ کر بہ اصرار اس سٹیج پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں تصنیف وتالیف یا کسی بھی علمی کام میں اشتغال مجبوری

84659

نہیں بلکہ طبعی ضرورت بن جاتی ہے۔ "سوانح قائدِ ملت" کے سلسلے میں بھی انہوں نے جس طرح خلوص، محبت، کمال عنایت وتوجہ، والہیت اور **وارفتگی** کی حد تک اصرار کیا اور پھر عملاً جس طرح بھرپور تعاون فرمایا اس کی مثالیں موجودہ دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

☆ اپنے مخلص رفیق کار، جواں سال عالم دین حضرت مولانا حافظ عمادالدین محمود رکن القاسم اکیڈمی وممبر مرکزی جنرل کونسل جمعیت علماء اسلام نے مواد کے حصول، نقل وانتخاب اور اخذ وترتیب میں میرا دایاں بازو بن کر اپنے ذاتی کام سے بھی بڑھ کر دلچسپی لی اور بار بار پروف ریڈنگ کرکر کے مقدور بھر تصحیح کا بھی بھرپور اہتمام فرمایا۔

☆ کمپوزنگ کی تمام تر ذمہ داری حافظ حبیب الرحمٰن نے تنہا اپنے سر لی۔ دن رات ایک کر کے کمپوزنگ، بار بار تصحیح کے صعب آزما مرحلوں کے باوصف اپنا کام ہمت، استقامت اور خندہ جبینی سے انجام دیتے رہے اور الحمدللہ کہ کامیاب ہوئے۔

یہ مخلص کارکنوں کے جذبۂ خدمت و اشاعت، حضرت مفتی صاحبؒ سے عقیدت ومحبت کی برکت تھی یا خود صاحبِ سوانح کی کرامت کہ تیرہ (۱۳) اپریل کو باقاعدہ طور پر سوانح پر کام کا آغاز ہوا اور ۳۰/اپریل کو (صرف اٹھارہ دن میں) کام کی تکمیل ہوئی۔ "سوانح قائدِ ملت" کی تصنیف وتالیف، اخذ ونقل اور ترتیب واشاعت گویا پھر "صحبتِ شیخ" کی سعادت حاصل ہوئی۔ صحبتِ شیخ کے یہ مبارک لمحات زندگی کی حسین یادیں ہیں جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی، کبھی دل نثار ہوتا

اللہ کریم ان سب کو اپنی عظمت شان ہی کے شایان شان اجر عظیم سے نوازے جنہوں نے کسی بھی حیثیت سے سوانح قائدِ ملت کی تکمیل و اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ **واجرهم على الله ۔**

عبدالقیوم حقانی

آہ! شیرازۂ اسلام پریشاں دیدم

قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی ایک فارسی نظم، عالمی حالات اور عالم اسلام کی زبوں حالی پر حضرت مفتی صاحب کا دردِ دل، بے چینی واضطراب اور دعا وفریاد۔

حیف دیروز کہ من سوئے گلستان دیدم
ہمچو شبنم گل و بلبل ہمہ گریاں دیدم
جانب شام و عراق و سوئے ایراں دیدم
ہمہ آفاق پر از فتنہ دوراں دیدم
مصر دربستۂ زنجیر غلامیست ہنوز
شاہ البانیہ را بے سرو ساماں دیدم
نغمہ سنجان خراسان و حجاز و شیراز
ہمہ را از غم صیاد ہراساں دیدم
بنی عباس دریں عہد نہ آلِ سفیان
نہ بہ کاشانۂ آں دولتِ عثمان دیدم
ماہِ انور بہ بخارا شدہ درخاکِ نہاں
آہ بے رونقیٔ محفل ترکاں دیدم
برد حب وطن احساسِ بقائے ملت
قوم را بے خبر از سکتہ قرآن دیدم
سبزہ پامال و خزاں دیدہ شدہ برگ و ثمر
آہ شیرازۂ اسلام پریشاں دیدم

نہ شبِ ماہ نہ گلشن نہ بہارِ لب جو
نہ سر شاخ گل مرغ خوش الحاں دیدم
مدتے شد کہ درانبوہِ وطن قافلہ را
مبتلائے المِ شام غریباں دیدم
بنگر اے شاہِ اممؐ سوئے لباس امّت
جامۂ ہست نہ دامن نہ گریباں دیدم
آں حریمے کہ دراں درشبِ معراج شہا
قد بے سایۂ تو سر و خراماں دیدم
ارضِ پاکش شدہ جولانگہ بیداد یہود
ہمہ آغشتہ بخوں نعشِ مسلماں دیدم
آں زمینے کہ نشانِ کف پایت بودہ
برہماں خاک عرب گنج شہیداں دیدم
رام شد حلقۂ گردابِ یم نیل و فرات
کشتی دجلہ و بغداد بہ طوفاں دیدم
ہر بلائیکہ شد از گردش دوراں پیدا
آہ برباد کن قومِ مسلماں دیدم
فتنۂ روس کہ آورد بلائے الحاد
دشمن ملت و غارتگرِ ایماں دیدم
بصرہ خالی زحسنؒ ہست زنعمانؒ کوفہ
مسجد و خانقہ و مدرسہ ویراں دیدم
بشنو فریاد زمحمودِ دل افگار و حزیں
کہ گرفتار بہ بندِ غم و حرماں دیدم

باب : ۱

خاندانی پسِ منظر، مشیتِ الٰہی کے فیصلے اور نظامِ تکوین کی تشکیل و انتخاب

" سوانح قائدِ ملتؒ " تکمیل کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے و جانشین اور ان کے مشن کے علمبردار مخدوم و مکرم حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم امیر جمعیت علماء اسلام پاکستان کی خدمت میں پیش کی گئی۔ مسودات چند روز ان کے مطالعہ میں رہے۔ 9 / جون کو موصوف خود بنفسِ نفیس جامعہ ابو ہریرہ تشریف لائے۔ کتاب کے مسودات بھی ساتھ لائے۔ کتاب کی تالیف پر بے حد خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا۔ کمپوز شدہ مسودات میں اصلاح بھی فرمائی۔ بعض مفید مشوروں سے بھی نوازا اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

" حضرت مفتی صاحبؒ کی تخلیق و وجود، تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں دراصل قدرت کے اپنے نظام تکوین کی تکمیل ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی سیرت و سوانح میں یہ ایک مستقل باب ہے

جہاں اسباب و وسائل سے ہٹ کر نظر رب الاسباب اور رب الوسائل پر جاتی ہے۔ اس حقیقت تک رسائی تب ہوگی جب تمام خاندانی پس منظر سامنے لایا جائے۔ بہتر ہوگا کہ اس سلسلہ میں خانقاہ یٰسین زئی شریف کے موجودہ سجادہ نشین مخدوم و مکرم حضرت مولانا محمود صاحب مدظلہ سے خاندانی پس منظر کی تفصیلات حاصل کی جائیں۔ چونکہ تمام تر واقعات ان کے چشم دید ہیں اس لئے اس وقت ان سے زیادہ اس حقیقت کو بیان کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔"

چنانچہ حسب ہدایت ذیل کی تحریر ان کے تفصیلی بیان کی تلخیص ہے جو حضرت امیر جمعیت کے حکم پر لکھی گئی اور اب سوانح قائد ملت کا باب اول بنادی گئی ہے۔ (عبد القیوم حقانی)

مسبب الاسباب نے اپنے تکوینی نظام کے تحت دنیائے رنگ و بو میں دین مبین کی خدمت و پاسبانی کے لئے مختلف شخصیات اور رجال کار کو پیدا فرمایا اور انہیں یہ سعادت بخشی کہ انہوں نے اپنے سوز دروں اور اپنے خونِ جگر سے گلشن اسلام کی آبیاری کی۔

رب ذوالجلال نے ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک قصبہ پنیالہ سے دین اسلام کی خدمت، ترویج و اشاعت اور غلبہ کے لئے حضرت خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ کے ہاں قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو پیدا فرمایا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے والدین کو کیا خبر تھی کہ ہمارا یہ لختِ جگر، نورِ نظر اور جگر گوشہ ایک دن مخدوم جہانیاں بنے گا۔ اگر ان کو علام

الغیوب انہی ایام میں مطلع کر دیتا کہ آپ کا نور بصر ایک موقع پر عالم، قاری، حافظ، فقیہ، محدث، مفسر، متکلم، داعی وخطیب سے لے کر ملک کا نامور سیاسی و مذہبی قائد بنے گا اور دنیا کے بڑے بڑے صاحبانِ جاہ وثروت، حاملانِ علوم نبوت اس کی پیشوائی کو ذریعہ نجات وکامرانی یقین کریں گے تو از مادہ بوسیدہ گدڑی، پنگھوڑا، چارپائی اور شیرخوارگی کے تمام سامان، کھلونے اور دیگر چیزیں آج تبرکات کی صورت میں محفوظ ہوتیں۔ کس کو کیا خبر تھی کہ اس چھوٹے سے دیہاتی ماحول میں کسی گوہر یکتا کے قدم اس سرزمین کو بابرکت بنا رہے ہیں۔

خانقاہ یٰسین زئی کے سادات اور حضرت مفتی صاحب کا خاندان:

تاریخی روایات کے مطابق قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور پنیالہ کی خانقاہ یٰسین زئی شریف کے صاحبان (سادات) کا خاندان ایک ہی ہے جسے عرف عام میں "پاوندے" کہا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر ان دونوں خاندانوں کا تعلق قندھار سے ہے۔ خانقاہ یٰسین زئی کے موجودہ سجادہ نشین جناب حضرت مولانا محمود صاحب نے ایک ملاقات میں خوب تفصیلات بیان فرمائیں۔ ذیل میں وہی تلخیصاً نذر قارئین ہیں۔

> حضرت مفتی صاحبؒ کے والد محترم خلیفہ محمد صدیق مرحوم اور ہمارے (صاحبان) خاندان کے جدِ امجد حضرت مولانا احمد گل صاحبؒ آپس میں اچھے دوست تھے۔ زمانہ قدیم میں دونوں خاندانوں کے افراد افغانستان سے عیسیٰ خیل (میانوالی) کے راستے پاکستان آتے جاتے تھے۔ دونوں خاندانوں کے افراد عیسیٰ خیل پہنچ کر اپنے پڑاؤ ڈالتے۔ یہاں اپنے عزیز و اقارب اور رشتہ داروں سے ملتے اور پھر آگے پنیالہ اور دیگر علاقوں کی طرف

نکل جاتے اور کاروبارِ زندگی میں مصروف ہو جاتے۔ یہ وہ دور تھا جب افغانستان کا دارالحکومت قندھار تھا۔

جناب شہاب الدین خان کی پیشکش:

پنیالے میں ایک نہایت شریف انسان جناب شہاب الدین خان، جو علاقہ بھر کے معزز سردار اور خان تھے۔ جنہیں دستِ تکوین نے عظیم علمی و دینی اور روحانی خدمت کے لئے چن لیا تھا۔ ان کے حضرت مولانا احمد گل صاحبؒ سے قلبی مراسم اور عقیدت کا معاملہ نہایت قوی تھا۔ وہ حضرت مولانا احمد گل صاحبؒ سے باطنی تربیت اور روحانی فیض حاصل کرتے تھے۔ شہاب الدین خان کا خاندان، عزیز و اقارب اور رشتہ دار اب بھی پنیالہ میں قیام پذیر ہیں۔ خان صاحب مرحوم نے ایک مرتبہ حضرت مولانا احمد گل صاحبؒ کی خدمت میں نہایت ادب و احترام سے عرض کیا حضرت! آپ افغانستان سے پاکستان اور پاکستان سے افغانستان مہینوں مسلسل سفر کی تکالیف اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ مستقل طور پر ہمارے ہاں پنیالہ میں اقامت اختیار فرمالیں۔

ایک علمی و روحانی مرکز کی تشکیل:

آپ کے قیام سے پنیالہ ایک علمی و روحانی مرکزِ رشد و ہدایت بن جائے گا اور ہم گناہ گاروں کو بھی اور عامۃ المسلمین کو بھی کسب فیض اور تحصیلِ نفع میں سہولت ہوگی۔ آپ کو بھی ایک جگہ بیٹھ کر خدمتِ علم اور اشاعتِ فیض میں آسانی ہو جائے گی۔ میں اس مبارک کام کے لئے اپنی کچھ اراضی پیش کرنا

چاہتا ہوں گر قبول افتد۔

سادات کے خاندان نے پڑاؤ ڈال دیا:

حضرت مولانا احمد گل صاحبؒ نے خان صاحب مرحوم کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ حضرت مولانا احمد گل صاحبؒ نے یہ نہ سوچا کہ زمین کیسی ہے؟ کتنی ہے؟ باغات ہیں یا نہیں، قابل کاشت بھی ہے یا نہیں؟ گذر اوقات بھی ہو گا یا نہیں۔ بظاہر ایک بنجر زمین پر انہوں نے پڑاؤ ڈال دیا۔ ان کا قیام کیا تھا؟ ایک خانقاہ کی تشکیل اور تکوینی طور پر علوم و معارف کی تقسیم کے ساتھ ساتھ پس منظر میں دست قدرت مستقبل میں قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی تعلیم و تربیت کا آغاز کار چاہتی تھی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے والد خلیفہ محمد صدیقؒ:

حضرت مفتی صاحبؒ کے والد ماجد حضرت مولانا خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ، حضرت مولانا احمد گل صاحبؒ کے رفیق کار، ہم دم اور ہم سفر تھے۔ وہ غریب و فقیر، درویش خدامست، قانع و صابر اور متوکل مزاج، سیدھے سادے اور مخلص مسلمان تھے۔ ان کی نیکی اور اتباعِ سنت کا یہ عالم تھا کہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے زندگی بھر استنجا کے لئے مٹی کا ڈھیلا بھی کبھی دائیں ہاتھ سے نہیں اٹھایا۔ ان کے ہاں وسائل نہ ہونے کے برابر تھے لیکن ان کی نظر وسائل پر نہیں ربّ الوسائل پر تھی۔ وہ حضرت مولانا احمد گل صاحب کی صحبت و رفاقت اور خدمت کے ساتھ ان سے علم ظاہری اور علم باطنی میں کسب فیض کرتے تھے۔ وہ جوہر قابل تو تھے ہی سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ شیخ کی صحبت

ونظرِ عنایت نے انہیں مصفا کر دیا اور خلافت سے سرفراز فرمایا۔ وہ اپنے شیخ کے رنگ میں اس قدر رنگ گئے کہ لفظِ خلیفہ ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

خلیفہ محمد صدیق ؒ کی شادی:

حضرت شیخ مولانا احمد گل صاحب ؒ کے ایماء اور حکم پر مروت قوم کے بعض معززین نے خلیفہ محمد صدیق کی شادی کا انتظام کرایا۔ خلیفہ صاحب کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام احمد رکھا گیا۔ احمد طبیعت کے سادہ اور متواضع و خلیق انسان تھے۔ اکثر بیمار رہتے اور بالآخر مسلسل بیماری سے ان کا انتقال ہو گیا۔

پنیالہ کے مولانا شیر محمد کی دختر سے ان کا دوسرا نکاح ہوا۔ اس سے اللہ نے انہیں دو بیٹے عنایت فرمائے۔ ایک محمد اور دوسرے محمود۔ دونوں بھائی انتہائی صالح، قوی الاستعداد اور لائق انسان تھے۔ خصوصاً محمود کو اللہ پاک نے جوہر قابل بنایا تھا۔ بلا کی ذہانت، حوصلہ و تدبر، بلند عزائم، حکمت و تدبیر انہیں فطرتاً دی گئی تھی۔

حضرت مفتی صاحب ؒ کو وہاب حقیقی نے اپنی عطا و بخشش سے جو وافر حصہ عطا فرمایا اس میں جہاں دینے والے کی جود و بخشش کا کمال ہے وہاں لینے والے کی طلب صادق کے ساتھ ساتھ والدین کی دعائیں اور حضرت مفتی صاحب ؒ کے اساتذہ کی تربیت کا بڑا دخل ہے۔

پنیالہ سے خانقاہ یٰسین زئی آمد:

حضرت خلیفہ محمد صدیق ؒ اوائل میں پنیالہ میں قیام پذیر ہوئے۔ خلیفہ صاحبؒ توحید کے علم بردار، اعمالِ صالحہ، سنتِ رسولؐ اور اکابر علماءِ دیوبند کے مسلکِ اعتدال کے داعی اور ترجمان تھے۔ بس اتنا ہی جرم تھا کہ رسم و رواج کے ٹھیکیداروں اور بدعت وضلالت کے داعیوں اور جاہل پیروں نے حضرت خلیفہ محمد صدیق ؒ کو ستانا شروع کردیا، اذیتیں پہنچائیں، پریشان کیا اور زندگی اجیرن بنانے کی ہر مذموم کوشش کی۔ صاحبان کے خاندانی، علمی اور روحانی شیخ حضرت مولانا احمد گل صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے اور خانقاہ یٰسین زئی کے جانشین حضرت مولانا سید عبدالحلیم شاہؒ نے انہیں اپنے ہاں مدعو فرمایا تو خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ نے یہ دعوت قبول کرتے ہوئے خاندان کے تمام افراد سمیت ان کے گھر کے متصل دوسرے گھر میں ڈیرہ ڈال دیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا اپنے والد سے کسبِ فیض:

ان کے لائق فرزند (حضرت مولانا مفتی) محمودؒ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ مڈل تک پنیالہ سکول میں پڑھتے رہے۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں انہوں نے اپنے گھر میں اپنے والد خلیفہ محمد صدیق ؒ سے پڑھیں۔

مولانا سید عبدالعزیز شاہؒ سے کسبِ علم:

مزید دینی تعلیم کی تحصیل کے لئے وہ حضرت مولانا سید عبدالحلیم شاہؒ کے

بھائی حضرت مولانا عبدالعزیز شاہؒ کے پاس ابا خیل (لکی مروت) چلے گئے اور ان سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

سفرِ ہندوستان کا مشورہ اور روانگی:

حضرت مفتی صاحبؒ کی ذہانت، ذوق وشوقِ علم اور کمالِ محبت کے پیشِ نظر ان کے شفیق استاد اور مربی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے انہیں باصرار فرمایا کہ اللہ پاک نے تمہیں قوی حافظہ دیا ہے، شوقِ علم اور ذوقِ مطالعہ سے نوازا ہے لہٰذا تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم مزید دینی تعلیم کے لئے ہندوستان چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے مشورہ سے مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مدرسہ شاہی مراد آباد کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ تھے۔ یہاں حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ مولانا سید عبدالحلیم شاہؒ کے صاحبزادہ گان حضرت مولانا حامد صاحب اور احقر (حضرت مولانا محمود صاحب) اور حضرت مولانا عبدالعزیز شاہؒ کے دو صاحبزادے مولانا یار محمد اور مولانا جان محمد بھی شریکِ سفر اور شریکِ درس تھے۔

اساتذہ کی شفقتیں:

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ نے بے مثال عقلِ سلیم، عمدہ فہم اور افہام و تفہیم کی بہترین صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ انہیں علوم و معارف اور مسائل دینیہ کثرت سے یاد تھے۔ ان کی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے ان کے اساتذہ بھی ان سے محبت اور شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ کا امتحان و اعطاءِ سند:

ایک مرتبہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ (جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے ہم پلہ عالم دین اور محدّث تھے) تعطیلات کے ایام میں تشریف لائے اور انہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے پوچھا کیا تم نے تحصیل علم مکمل کرلیا ہے؟ تو حضرت مفتی صاحبؒ نے مثبت جواب دیا۔ تب حضرت مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ نے بعض احادیث اور ان سے مستنبط مسائل میں حضرت مفتی صاحبؒ کا امتحان لیکر انہیں اپنی طرف سے حدیث کی سند عطا فرمائی۔

غربت و ناداری میں صبر و استقامت:

حضرت مفتی صاحبؒ علم و فضل، درس و تدریس اور خدمت و اشاعت دین کے عظیم ترین منصب پر فائز ہونے کے باوجود فقیر منش انسان اور بوریا نشین عالم دین تھے۔ ان کے گھر میں انتہائی غربت تھی۔ ان کے گھر میں گندم کی روٹی کا تو تصور بھی نہیں تھا۔ باجرے کی روٹی بھی کبھی کبھار پکتی تھی۔ ایک مرتبہ میرے بڑے بھائی نے ہم تینوں بھائیوں کو بلایا اور فرمایا تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے گھر میں گندم کی روٹی پکتی ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ کے گھر میں نہ گندم ہے اور نہ گندم کا آٹا۔ ہم تو گندم کی روٹی کھارہے ہیں اور مفتی صاحبؒ کے گھر میں باجرے کی روٹی پک رہی ہے جبکہ ہمارا (خانقاہ یٰسین زئی کا سادات خاندان) اور ان کا رشتہ مضبوط بلکہ بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ چنانچہ ہم نے بھائی صاحب کی تجویز اور حکم پر اپنے اپنے گھر سے ایک ایک من گندم جمع کی اور حضرت مفتی صاحبؒ کے گھر پہنچادی۔

جامعہ عزیزیہ میں تدریسی خدمات:

جناب حضرت مولانا محمود صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

میرے چچا جان حضرت مولانا سید عبدالعزیز شاہ صاحبؒ نابینا تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں دل کی بصیرت سے نوازا تھا۔ بہت سادہ طبع اور درویش منش انسان تھے۔ شرح جامی اور ہدایہ وغیرہ پڑھاتے تھے۔ ان کی نگاہِ بصیرت و فراست نے بھانپ لیا کہ یہ ہونہار، مستقبل کا شیخ الحدیث اور مفتی اعظم بننے والا ہے اور اسے دنیائے معرفت و طریقت اور دریائے سیاست کا شناور اور امام و قائد بننا ہے اس لئے جب حضرت مفتی صاحبؒ ہندوستان سے تکمیل علم کے بعد واپس آئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور ان کے صاحبزادوں اور دیگر احباب نے اجلاس بلایا اور فیصلہ کیا کہ علاقے میں ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے۔ چنانچہ ضلع لکی مروت کے گاؤں ابا خیل میں ایک دینی مدرسہ جامعہ عزیزیہ کے نام سے قائم کیا گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے یہاں تین سال تک پڑھایا۔ طلبہ کی بھی کثرت تھی لیکن غربت و افلاس اور وسائل کی عدم دستیابی کی وجہ سے مدرسہ بند کر دیا گیا اور حضرت مفتی صاحبؒ عیسیٰ خیل کے ایک دینی مدرسہ میں تدریس کے لئے چلے گئے۔

عبدالخیل میں قیام اور تدریس:

یہاں سے کچھ عرصہ بعد حضرت مفتی صاحبؒ مستعفی ہو کر واپس عبدالخیل آئے اور صاحبان کی تجویز اور حکم پر حضرت مفتی صاحبؒ نے یہاں مسجد کی امامت اور درس کا انتظام سنبھال لیا۔ علاقہ بھر سے طلباء ان کے پاس پڑھنے

کے لئے آتے تھے۔ مقیم طلبہ کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔

مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں تقرر:

ان کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد جناب حضرت مولانا محمد موسیٰ خان روحانی البازی اس وقت مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں زیر تعلیم تھے۔ انہوں نے ملتان میں اپنے اساتذہ کے سامنے حضرت مفتی صاحبؒ کی تدریسی صلاحیت اور علمی عظمت کا ذکر کیا تو مدرسہ کے ارباب انتظام واہتمام نے حضرت مفتی صاحب کو اپنے مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھانے کی دعوت دی اور حضرت مفتی صاحبؒ ملتان تشریف لے گئے۔

علمی وسیاسی شخصیت کی تشکیل وتعمیر:

یہاں سے حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی وسیاسی ترقی کا سفر شروع ہوا اور ملتان آنے کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اس میں خود ان کی اپنی محنت، سعی وتوجہ اور دوڑ دھوپ کا بہت کچھ ہاتھ تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی وسیاسی زندگی کا آغاز یہاں سے ہوا۔

جمعیت علماء اسلام کی قیادت:

انہوں نے اپنی فکری وعلمی صلاحیتوں سے بھرپور کام لے کر علمی حلقوں سے نہ صرف زبانی خراج تحسین حاصل کیا بلکہ عملاً ملک کی بڑی سیاسی اور مذہبی جماعت جمعیت علماء اسلام کی قیادت سنبھال لی۔ وہ شدید درسی مصروفیات کے باوجود سیاسی جلسوں میں تقریریں کرتے۔ جمعیت کے اجلاس بلاتے،

باہر سے آئے ہوئے مشاہیر اور وفود سے ملتے۔ ان کے اعزاز میں دعوتوں اور استقبالیوں کا اہتمام کرتے۔ مذہب و سیاست کے عنوان سے معنون ہر جلسہ میں مفتی صاحب کو مدعو کیا جاتا۔

قدرت کا تکوینی نظام:

اس طرح انہوں نے سیاسی اور علمی میدان میں اپنی شخصیت کا لوہا منوایا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے شیخ الحدیث، مفتی، سیاسی قائد اور وزیر اعلیٰ سرحد سے لیکر قائدِ حزبِ اختلاف، امام انقلاب اور قائدِ ملت بن گئے۔ قدرت کا اپنا ایک تکوینی نظام ہے جو پس پردہ اپنی حکمت کے تحت کام کر رہا ہے۔

حکیمِ لم یزل کا تکوینی انتخاب:

حضرت مولانا یوسف لدھیانوی فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ شانہ کے لطف و کرم اور اس کی قدرت کاملہ کا تماشہ دیکھو کہ تھانہ بھون کے ایک شیخ زادے کو اٹھاتے ہیں اور اسے عرب و عجم کا شیخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی بنا دیتے ہیں۔ گنگوہ کے ایک انصاری خاندان کے ایک فرد پر نظر عنایت ہوتی ہے اسے قطبیت کبریٰ کے مقام پر فائز کر کے امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی بنا دیا جاتا ہے۔ کشمیر کی سنگلاخ سرزمین سے ایک گمنام خاندان کے ایک فرد کو لایا جاتا ہے اور علوم نبوت کا پورا کتب خانہ اس کے سینے میں انڈیل کر اسے امام العصر مولانا انور شاہؒ بنا دیا جاتا ہے۔ گوجرانوالہ کے ایک گاؤں سے ایک نو مسلم کو لاتے ہیں اور اسے ولایتِ کبریٰ اور مقامِ صدیقیت پر فائز کر کے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ بنا دیتے ہیں۔

مشیتِ الٰہی کے فیصلے:

اور ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک غیر معروف قصبہ سے ایک فرد کو کھینچتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے عالم، حافظ، قاری، فقیہ، مفتی، محدث، متکلم اور وزیر اعلیٰ سرحد سے لیکر قائدِ حزبِ اختلاف تک بنا دیتے ہیں۔ اس صدی کے اکابر کے ابتدائی حالات کا مشاہدہ کیجئے، خود حضرت مفتی صاحبؒ کے خاندانی پسِ منظر پر نظر ڈالیئے تو بظاہر اسباب کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اس نونہال کا سایہ ایک عالم پر محیط ہوگا۔ اس سے واضح ہوا کہ مشیتِ الٰہی حفظ دین اور پاسبانی ملت کا انتظام ظاہری اسباب سے بالاتر کرتی ہے اور لطف الٰہی خود ایسے افراد کا انتخاب کرتا ہے جن سے دین قیم کی خدمت کا کام لیا جائے۔

علاقہ پنیالہ کا انتخاب کیوں؟

ڈیرہ اسماعیل خان سے تقریباً ۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر قصبہ پنیالہ کے ایک صدی قبل کے حالات پر ذرا نگاہ ڈالیئے اور طیارۂ خیال سے اس زمانے کے سماں پر پرواز کیجئے تو لق و دق صحرا، ریت کے تودے، بلند ٹیلے، کہیں کہیں لیموں اور کھجور کے باغات اور وسیع و عریض غیر آباد زمینیں انسانی عقل کو حیران و پریشان کر دیتی ہیں۔ اس تمدنی غربت پر دینی زوال مستزاد ہے۔ دل کے نہاں خانوں میں غیر اللہ کے صنم سجے ہوئے ہیں۔ جہالت و ضلالت نے عقلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے، شرک و بدعت نے اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں، رسوم و رواج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی اسلامی روایات سسک رہی ہیں، خان ازم کا تسلط ہے، کجروی کا ایک سیلاب ہے، مخلوق کی بندگی کا منظر ہے۔ دین سے بے بہرہ دینی پیشوا، بے بصیرت مریدوں کے یہاں سالانہ چکر لگاتے ہیں اور

اعمال کے بجائے اموال، نذرانوں اور اپنے ساتھ تعلق ارادت کو آخرت میں نجات کی ضمانت بتلاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے فرمان..................

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

علم و عرفان کا ماہتاب:

کوئی منزل ہے نہ کوئی رہنما، کوئی دلِ بینا ہے نہ فکرِ ہدایت آشنا۔ مشیتِ الٰہی نے اپنے تکوینی نظام کے تحت اس قافلہ انسانی کی رہنمائی کے لئے پنیالہ کی سرزمین میں مفتی محمودؒ کے نام سے علم و عرفان کا ایک ماہتاب طلوع فرمایا جو اپنے ایک ہاتھ میں نورِ علم کی شمع تھامے ہوئے ہے تو دوسرے ہاتھ میں اتباعِ سنت کا علم۔ جس کی نگاہ بلند، سخن دل نواز اور جان پرسوز ہے۔

مقام امامت:

اور اسے نقاشِ ازل نے ایسی صلاحیتیں ودیعت فرمائیں کہ انہی صلاحیتوں نے انہیں امامت کا بلند مقام عطا فرمایا اور وہ بڑے بڑے مشاہیر علماء کی موجودگی میں قیادت و سیادت کے حقدار ٹھہرے۔

تمام تر مساعی کا ہدف:

انہوں نے پوری زندگی ایک انتھک سپہ سالار کی حیثیت سے گذاری۔ نفاذِ اسلام کی جد و جہد اور ملک و قوم کی خیر خواہی میں انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں

برداشت کیں۔ وہ ملک وقوم کے بہی خواہ تھے اور ملک میں عملاً دین اسلام کا غلبہ، سربلندی اور نفاذ چاہتے تھے۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہی تھی کہ قرآن وسنت ملک کا سپریم لاء بن جائے اور عملاً اسلام اس ملک کا دستور اور قانون ہو۔ لیکن ان کی زندگی میں یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور وہ یہ خواہش لئے ہوئے اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے محبت کے تقاضے:

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آج بھی زندہ و جاوید ہیں کیونکہ ان کا مشن زندہ ہے۔ ان کی حق پسندی اور صداقت ہمارے لئے پیغام عمل ہے۔ جس خدا کے دین وشریعت کے وہ مبلغ تھے وہ خدا ہمیں آج بھی اپنے دین کی طرف بلا رہا ہے اور وہ دین متین ہماری تغافل شعاریوں پہ نوحہ کناں ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ سے محبت اور عقیدت اس صورت میں قائم رکھی جاسکتی ہے کہ ان کے مقصد اور ان کے مشن کو سمجھا جائے، اس پر عمل کیا جائے اور اس کو آگے بڑھایا جائے۔

باب : ۲

خاندان، ولادت، تعلیم، ابتدائی حالات اور دلچسپ واقعات

خاندان:

قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق افغان قوم کے مشہور قبیلے ناصر کی شاخ یحییٰ خیل کے علم خاندان سے تھا۔ آپ کے والد کا نام محمد صدیق تھا۔ صدیق بن محمد دراز بن گلستان بن عمر بن محمد بن موسیٰ بن عالم۔ یحییٰ خیل خانہ بدوش افغانوں کا ایک قبیلہ تھا۔ یہ لوگ سردیوں میں ہندوستان آ کر آباد ہو جاتے اور گرمیوں میں افغانستان میں خیمہ زن ہوتے۔ خانہ بدوش لوگ دن بھر سفر کرتے ہیں، جہاں شام ہوتی ہے وہیں اپنے اونٹوں، گھوڑوں اور گدھوں سے اتر کر کھلے آسمان کے نیچے پڑاؤ ڈال دیتے ہیں اور یہی کچھ یحییٰ خیل قبیلے کا مقدر اور معمول تھا۔ "صبح کہیں شام کہیں"

والدین:

حضرت مفتی صاحبؒ کے والد حضرت خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ علم سے لگاؤ اور خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے شرح جامی، رسائل منطق، علم فقہ اور علم قرأت اور

دیگر متعدد دینی کتب اپنے شیخ حضرت مولانا سید احمد گل شاہ صاحبؒ سے پڑھیں۔ حضرت مولانا سید احمد گل شاہ صاحبؒ کا تعلق سادات قندھار کے قبیلے یٰسین زئی سے تھا۔ پنیالہ کے علاقے میں ان کے عقیدت مندوں اور مریدوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ درویشوں اور دینی علوم کے طلباء کی ایک بڑی جماعت ہر وقت حضرت موصوف کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے والد جناب خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ کا شمار بھی حضرت مولانا سید احمد گل شاہؒ کے خاص خلفاء اور مریدوں میں ہوتا تھا۔ خانقاہ یٰسین زئی کے تمام لوگ ادب واحترام کی وجہ سے انہیں خلیفہ صاحب کہتے تھے۔ حضرت مولانا سید احمد گل شاہ صاحب نے انہیں خلافت بھی عطا فرمائی تھی جبکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی والدہ محترمہ ایک بہت بڑے عالم دین مولانا ملا گل خان کی بیٹی تھیں۔

ولادت:

حضرت مفتی صاحبؒ ڈیرہ اسماعیل خان سے ۳۵ میل شمال کی جانب ایک قدیم اور دور افتادہ گاؤں پنیالہ میں پیر کی رات ۱۶/ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ بمطابق ۱۵/ فروری ۱۹۱۹ء پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم:

حضرت مفتی صاحبؒ جب پانچ سال کے ہوئے تو انہیں پنیالہ کے مڈل سکول میں داخل کرادیا گیا۔ مفتی صاحبؒ خاصے ذہین تھے۔ ذہانت کی وجہ سے سکول کے تمام اساتذہ ان سے بڑی محبت کرتے۔ جب مفتی صاحبؒ نے مڈل کا امتحان پاس کیا تو سکول کے ہیڈ ماسٹر خود بنفس نفیس جناب خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ کے پاس آئے اور کہا:

" آپ کا بیٹا محمود بڑا ذہین ہے اور لائق ہے، اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری

رہنا چاہیئے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو اس کے تعلیمی اخراجات میں برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن آپ کے والد نے انکار کر دیا اور کہا مجھے اپنے لڑکے کو انگریزی تعلیم دلانے کا شوق نہیں، میں اسے دینی تعلیم دینا چاہتا ہوں۔"

یہی وجہ تھی کہ سکول کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا سلسلہ بھی حضرت مفتی صاحب نے جاری رکھا۔ ناظرہ قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد اور ماموں مولوی شیر محمد سے پڑھیں۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ضلع بنوں کی تحصیل لکی کے ایک گاؤں اباخیل کے دینی مدرسہ میں داخلہ لیا اور مولانا سید عبدالعزیز شاہ سے درسی کتابیں کافیہ وغیرہ پڑھنا شروع کیں۔ چند مہینے پڑھنے کے بعد واپس پنیالہ آئے اور اپنے والد خلیفہ محمد صدیق، ماموں مولوی شیر محمد اور مولوی غلام رسول سے شرح جامی، ہدایہ اولین، حسامی اور سلم العلوم تک کتابیں پڑھیں۔

تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں والد کی نگرانی:

حضرت مفتی صاحب کے والد ان کی ہر قدم پر نگرانی فرمایا کرتے تھے اور اخلاق و عادات اور تعلیم کے بارے میں ذرا سی سستی اور غفلت بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ انہی دنوں کا ایک واقعہ ایک دفعہ خلیفہ محمد صاحب نے بیان کیا کہ:

> " گھر کا پانی بھرنا احمد اور محمود کے ذمہ ہوتا تھا، اس طرح کبھی کبھار والد صاحب جنگل سے لکڑی جمع کرنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم تینوں بھائیوں کو والد صاحب نے جنگل سے لکڑی اکٹھی کرنے کے لئے بھیجا۔ ہم جب والد صاحب کی نظروں سے غائب ہو گئے تو پنیالہ کے بازار کا

رخ کیا اور آپس میں یہ مشورہ کیا کہ بازار کی سیر کرلیں۔ بعد میں واپسی پر گھر جاتے ہوئے لکڑی اکٹھی کرلیں گے۔ ہم نے بازار کی خوب سیر کی اور واپسی پر کافی لکڑی جمع کی اور گھر لے گئے۔ خیال تھا والد صاحب خوب تحسین فرمائیں گے لیکن انہوں نے جواب طلبی شروع کردی کہ بازار کیوں گئے تھے؟ ہم نے یہ الزام تسلیم کرنے سے انکار کیا لیکن انہوں نے تو ہمارا پیچھا کیا تھا۔ جہاں جہاں ہم بازار میں کھڑے تھے یا جس جس گلی سے گزرے تھے وہ تمام نشانیاں بتلادیں۔ پس پھر کیا تھا انہوں نے سب سے پہلے احمد کو اور پھر محمود کو پیٹنا شروع کیا۔ جب میری باری آئی تو انہوں نے میری کم عمری کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے معاف کردیا۔" (ترجمان اسلام مفتی محمود نمبر، ص ۳۲)

انسانی زندگی میں کئی مراحل آتے ہیں۔ ان مراحل میں سب سے اہم اور نازک مرحلہ پیدائش سے لے کر شعور کی عمر تک اور پھر پختگی تک کا ہے۔ اس عمر کے اندر بگڑنے یا بننے کا زیادہ تر مدار بچے کی تربیت کے حسن و قبح پر موقوف ہوتا ہے۔ اس لئے والدین جو اصلی مربی ہوتے ہیں انہیں بچے کی تربیت کی اہم ذمہ داری سے پوری توجہ و انہماک سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے کیونکہ انسانی زندگی کو سنوارنے اور اس کو معقول و مناسب دائرے میں محدود کرنے کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بنیادی بلکہ اولین اہمیت رکھتی ہے۔

صرف ایک جملہ:

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم فرمایا کرتے۔

" اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ملت کے لئے ایک پوسٹر بنانا ہے اور صرف ایک

جملہ کی گنجائش ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو میں کہوں گا کہ "**ما تعبدون من بعدی**" لکھ دو پوسٹر کے نیچے۔ لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے اپنا جائزہ لے، محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ اپنے بچوں کے لئے، اپنی آئندہ نسل کے لئے یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے یا نہیں کہ "**ما تعبدون من بعدی**" میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟

میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں؟ اور یہ سوال افراد کے پیمانے پر، خاندان کے پیمانے پر، برادری کے پیمانے پر، معاشرے کے پیمانے پر، محلّہ کے پیمانے پر، قصبہ کے پیمانے پر اور آخر میں میں کہتا ہوں ملت کے پیمانے پر ہمارے دلوں پر نقش ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستے پر چلے گی، وہ کس گروہ اور ملت کی پیرو ہوگی؟ کس کی پرستش کرے گی؟ کن عقائد کو مانے گی......؟"

اعلیٰ دینی تعلیم:

جب حضرت مفتی صاحبؒ ہدایہ اولین، سلم العلوم اور شرح جامی پڑھ رہے تھے اس دور میں ہندوستان کے مدارس خصوصاً دارالعلوم دیوبند کی علمی عظمت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ فنون کی تعلیم کے لئے مرادآباد کے شاہی مدرسے کی بہت شہرت تھی۔ مدرسہ شاہی شہر کے وسط میں ایک مسجد کے گرد بنایا گیا تھا۔ یہ مسجد شاہی دور کی تھی۔ اس مدرسے کی بنیاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے رکھی تھی۔ اس کا دوسرا نام جامعہ قاسمیہ

ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس مدرسے کا نام مدرسۃ الغربا رکھا تھا۔ یہ نام وہاں پتھر پر کندہ ہے۔ اس مدرسے سے بڑے بڑے جبال علم فارغ التحصیل ہوئے۔ حضرت نانوتویؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ احمدؒ صاحب، مولانا کفایت اللہؒ، مولانا عبدالغفور غزنویؒ اور حضرت مولانا محمودؒ اسی مدرسہ کے فیض یافتہ اور فاضل تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے پہلے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا لیکن والد محترم خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ کے حکم اور خواہش پر دیوبند چھوڑ کر مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں داخلہ لے لیا۔ یہاں داخلہ لینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت مولانا سید احمد گل شاہؒ کے جانشین پیر طریقت حضرت مولانا سید عبدالحلیم صاحب جو کہ حضرت مفتی صاحب کے والد کے پیر و مرشد بھی تھے، ان کے دو صاحبزادے محمد اور عبدالحمید یہاں داخل تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے یہاں مدرسہ شاہی میں چھ سال گذارے۔ درس نظامی کے ساتھ ساتھ قرات سبعہ عشرہ بھی یہاں پڑھی۔ دورہ حدیث کے سال ابتدائی چار مہینے یہاں گذارے لیکن درمیان میں بعض ناگزیر وجوہات کی بنیاد پر امروہہ کے مدرسہ اسلامیہ میں داخل ہوئے۔ اس مدرسہ میں باقاعدہ سند دینے کا انتظام نہیں تھا۔

مولانا امروہویؒ سے استناد:

تعلیمی سال کے اختتام پر حضرت مفتی صاحبؒ اپنے دورہ حدیث کے دو ساتھیوں مولوی جان محمدؒ اور مولوی سعد اللہ جانؒ کے ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرحمن امروہویؒ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تحریری سند کی درخواست کی۔ مولانا نے ان کا امتحان لیا اور اپنے دست مبارک سے درج ذیل تحریر بہ طور سند عطا فرمائی۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ و کفٰی و سلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی اما بعد فقد طلب منی اخونا فی اللّٰہ المولوی المحمود ابن المولوی محمد صدیق الساکن فی بلدة بنیالہ من مضافات دیرہ اسمٰعیل خان ان یروی عنی الاحادیث فسمعت بعض مواضع البخاری فرائیتہ اھلا لان یجازیٰ بما اجازنا بہ مشایخنا الکریم حضرتنا مولانا الجنجوھی و حضرتنا مولانا القاسم النانوتوی و حضرتنا مولانا الحسین ابن الحسن الخزرجی ۔ ان تروی عنی الاحادیث بشرائط المعتبرة عند اھل العزة و اوصیہ بتقوی اللّٰہ فی السر والعلن والاجتناب عن المعاصی ما ظھر منھا و ما بطن و ان لا یغفل عن خدمة الدین والنصح للّٰہ ولرسولہ و للمؤمنین و ان لا ینسانی من الدعاء فی العسرة والرخاء و اخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ۔

حررہ ببنانہ و اجازہ بلسانہ عبدہ و ابن عبدہ و ابن امتہ عبدالرحمٰن ابن الفاضل الامین مولانا عنایة اللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ وارضاہ ۔

سنة احدی و ستین بعد الف و ثلاث مائة من الھجرة النبویة علٰی صاحبھا الف الف صلوٰة و سلام و برکتہ و تحیتہ ۔

اس کے بعد دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی مراد آباد کے اساتذہ کی طرف سے بھی حضرت مفتی صاحبؒ کو اسناد دے دی گئیں ۔

اساتذہ کرام:

حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے والد خلیفہ محمد صدیق صاحبؒ، ماموں مولانا

شیر محمد پنیالویؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ، مولانا شیر محمد قندھاریؒ، مولانا غلام رسولؒ، مولانا فخر الدینؒ، حضرت مولانا محمد اسماعیل سنبھلیؒ، مولانا محمد میاں صاحبؒ، مولانا عجب نور صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالغفور صاحبؒ ترکی غزنوی، حضرت مولانا محمد رضا صاحبؒ حضرت قاری عبداللہ صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے اساتذہ کا تذکرہ بھی فائدہ سے خالی نہیں اس لئے اجمالاً ان کے اساتذہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت مولانا غلام رسولؒ صاحب:

حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ پنیالہ کے قریب شیخ بدین میں درس و تدریس کا کام کرتے تھے اور یہاں کی مسجد کے امام و خطیب بھی تھے۔ مفتی صاحبؒ نے ان سے منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم پڑھی۔

۲۔ حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ:

مولانا فخر الدین صاحبؒ ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ قومیت کے لحاظ سے سید تھے۔ مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کی طرح گورے چٹے اور حسین تھے۔ سر سے پاؤں تک ان کے بال سفید تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے سامنے جب ان کا ذکر خیر ہوتا تو حضرت مفتی صاحبؒ عقیدت و محبت کے ساتھ بہت دیر تک ان کا تذکرہ فرماتے رہتے اور ان کی بے تکلف اردو اور عربی کی تعریف کرتے۔ مشکوۃ شریف سے لے کر آخر تک دار العلوم دیوبند میں پڑھتے رہے۔ دار العلوم دیوبند میں ہی تدریس کا آغاز کیا۔ پھر مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم صاحب کی درخواست پر مدرسہ شاہی میں پڑھانا شروع کیا۔ معقولات و فلکیات کی مشکل کتابیں پڑھاتے رہے۔ دار العلوم

دیو بند میں حضرت مدنی رحمہ اللہ کے وصال کے بعد آپ دار العلوم دیو بند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے۔ ۱۹۷۲ء میں مراد آباد میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

۳۔ حضرت مولانا عجب نور صاحبؒ:

حضرت مفتی صاحبؒ کے استاذ جلیل حضرت مولانا عجب نور صاحبؒ تھے۔ موصوف بنوں کے رہنے والے تھے۔ فلکیات میں بہت ماہر تھے۔ علم فلکیات کی کتاب تصریح پڑھاتے وقت مابین السطور بھی پڑھایا کرتے تھے۔ بہت جسیم اور جہیر الصوت تھے۔ مدرسہ شاہی میں ۱۹۴۴ء میں انہیں حدیث کی مشہور کتاب مسلم شریف دی گئی۔ مولانا موصوف سے مفتی صاحبؒ نے فلسفہ، منطق کی بڑی کتابیں، فلکیات کی کتابیں اور فقہ حنفی کی مشہور عالم کتاب ہدایہ اخیرین پڑھی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لے آئے اور مدرسہ معراج العلوم بنوں کی بنیاد رکھی۔

سیدی واستاذی المحترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی مجالس میں مولانا عجب نور صاحبؒ کا بہت تذکرہ کیا کرتے تھے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:

> " مولانا عجب نور صاحبؒ بڑے متقی اور نیک انسان تھے۔ جید عالم اور قدیم وجدید علوم کے ماہر استاد تھے۔ ہمارے دیو بند کی طالب علمی کے زمانہ میں ان کی علمی عظمتوں کا چرچا ہم سنا کرتے تھے۔ مرحوم کو مجھ سے خصوصی شفقت تھی اور دار العلوم حقانیہ کی ترقی وبقا اور استحکام کے لئے ہر وقت دعا گو رہتے تھے۔ " (صحبتے با اہل حق، ص ۵۸)

۴۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ:

مولانا سید محمد میاںؒ کا تاریخی نام مظفر میاں ہے۔ دیوبند کے مشہور خاندان سادات رضویہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں کافی عرصہ تک مدرس اور مفتی کی حیثیت سے کام کیا۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں تعلیم کے دوران مفتی صاحبؒ حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ سے بہت متاثر تھے۔ فارغ اوقات میں ان کی مجلس میں بیٹھتے اور تحریری کام میں ان کی معاونت کرتے۔ جس زمانے میں مفتی صاحبؒ مولانا محمد میاں صاحبؒ سے پڑھ رہے تھے ان دنوں مولانا موصوف علمائے ہند کا شاندار ماضی لکھ رہے تھے۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی مولانا موصوف کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ بھی مولانا موصوف بہت سی کتابوں کے مصنف اور مؤرخ تھے۔ ان کی سیاسی اور تصنیفی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان سے حدیث کی اہم کتاب ترمذی شریف پڑھی اور علم ادب عربی کی تمام کتابیں پڑھیں۔ مولانا سید محمد میاں صاحبؒ ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو فوت ہوئے اور دہلی میں مدفون ہوئے۔

۵۔ حضرت مولانا قاری محمد عبداللہ صاحبؒ:

حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحبؒ تھانہ بھون (جو قرأت و تجوید میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے بھی استاذ تھے) کے رہنے والے تھے۔ علم قرات پر کمال درجے کا عبور تھا۔ موصوف کو اللہ نے نہایت اعلیٰ سیاسی بصیرت بھی عطا فرمائی تھی۔ انگریز کے دورِ حکومت میں تحریک آزادی میں انہوں نے ایک فعال کارکن کی حیثیت سے کام کیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ جامعہ قاسمیہ میں قرات و تجوید کے

مدرس تھے۔ مفتی صاحبؒ نے ان سے قرأت سبعہ عشرہ پڑھی۔

۶۔ حضرت مولانا سید عبدالعزیز شاہؒ:

حضرت مولانا سید عبدالعزیز شاہؒ نابینا تھے لیکن خدا نے انہیں علم و معرفت میں نہایت بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ اپنے بھائی مولانا سید عبدالحلیم شاہ (حضرت سید احمد گل شاہ کے بڑے فرزند) سے سلوک کی تکمیل کر کے اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں اپنے بھائی سے اجازت لے کر ضلع بنوں کی تحصیل لکی کے ایک گاؤں ابا خیل چلے گئے۔ وہاں سلسلہ مجددیہ کی ترویج و اشاعت میں مصروف رہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور چند مہینے اسباق پڑھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو بعد میں خلافت بھی عطا کی۔

> "صاحبزادہ محمود فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے پوچھا کہ آپ نے مفتی صاحب کو ایسے ہی خلافت دے دی یا کچھ جواہر بھی ان کے اندر ہیں؟ فرمانے لگے کہ علمی لیاقت کے ساتھ ساتھ ان میں سلوک کی استعداد بھی پوری پوری ہے اور مفتی صاحب علوم باطنی میں بہت آگے ہیں۔"

حضرت مفتی صاحبؒ کو طالب علمی کے دور میں ایسے اساتذہ ملے جو اپنے وقت کے جنیدؒ، شبلیؒ، رومیؒ، شیخ سعدیؒ اور بایزیدؒ تھے۔ ان عظیم ہستیوں کے سایہ عاطفت میں آپ نے تربیت کے مراحل طے کئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مفتی صاحبؒ کے تمام اساتذہ اعلیٰ درجے کے اہل علم اور صاحبِ کمال تھے مگر کسی صاحب کمال اور اہل علم سے اخذ و استفادہ اور کسبِ فیض حاصل کرنا شاگرد کی اپنی صلاحیت و استعداد پر بھی

موقوف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت مفتی صاحبؒ بھی بڑے صاحب کمال اور ذہین تھے اور انہوں نے اپنے اساتذہ سے کسبِ فیض میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ علوم دینیہ میں جب تک اساتذہ خوش نہ ہوں یا طالب علم کے دل میں اساتذہ کی محبت و عظمت نہ ہو اس وقت تک علم حاصل کرنے والے سے آگے سلسلہ فیض نہیں چلتا۔ حضرت مفتی صاحبؒ سے اساتذہ بہت خوش تھے کیونکہ وہ اپنے اساتذہ کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ انہیں اپنے اساتذہ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ اسی عقیدت نے انہیں مرجع خلائق اور مرجع عقیدت بنا دیا تھا۔ مفتی صاحبؒ کی ذاتی عظمت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا دل و جان سے احترام کرتے تھے۔ طلبہ برادری کے نفع کے لئے ایک دلچسپ تاریخی واقعہ بھی عرض کئے دیتا ہوں۔

استاذ کی نگاہ و دعا:

معروف دانشور شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

" میرا عقیدہ ہے کہ استادوں کی نگاہ اور دعا دونوں اثر کرتی ہیں۔ دھرم رتن سکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے، سندھی نژاد، انتہائی خلیق، نیک دل شریف اور وضعدار۔ ان کی بیوی نہایت خوبصورت اور کچھ زیادہ عمر کی نہ تھیں، کالج میں پڑھتی تھیں، ہم لوگ گھر لوٹتے تو کالج سے واپس آ رہی ہوتیں، راستہ میں آمنا سامنا ہوتا۔ "بھلے مانس حیا کرو" ماسٹر دھرم رتن کا تکیہ کلام تھا۔ وہ طلبہ کو بدنی سزا دینے کے خلاف تھے۔ بڑے سے بڑے قصور پر ڈانٹ ڈپٹ کر کے چپ ہو جاتے۔ ہماری جماعت کے تین طلبہ بے قابو تھے۔ ان تینوں نے ان کی اہلیہ کو چھیڑنا شروع کیا، وہ گذر رہی ہوتی تو "بھلے مانس حیا کرو" کا آوازہ

کستے، قہقہے لگاتے اور وہ کنی کترا کر نکل جاتیں۔ آخر ایک دن خاوند سے شکایت کی، ماسٹر صاحب نے اگلے روز مولوی نیاز محمد کو علیحدہ بلوا کر سارا قصہ بیان کیا۔ وہ چاہتے تو ان طلبہ کو سکول سے خارج کر سکتے تھے لیکن ان کی شرافت نے عفو سے کام لیا اور ان کے نزدیک یہ علاج بھی نہ تھا۔ مولوی صاحب نے ان تینوں کو بلا کر دوستانہ انداز میں سمجھایا اور یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کے بارے میں اس سے کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ بظاہر تو ان تینوں نے آئندہ باز رہنے کا وعدہ کر لیا لیکن ہفتہ بعد پھر وہی مصرع طرح اور اس پر گرہ لگنے لگی۔ جب پانی سر سے گذر گیا تو ماسٹر دھرم رتن نے بھری جماعت میں ڈانٹا لیکن ان کے چونچلوں کا ترشح جاری رہا۔ ماسٹر دھرم رتن کا جی کھٹا ہو گیا تو تینوں کو اکٹھا کیا اور طلبہ کے روبرو کہا کہ جس نے استاد کی عزت پر ہاتھ ڈالا وہ ہمیشہ بدقسمت رہا۔ یاد رکھو ایم اے بھی کر لو گے تو عزت وتوقیر کبھی حاصل نہ ہوگی، استاد کی بددعا خالی نہیں جاتی۔ ان تینوں میں سے ایک نے ایم اے کیا، خوار ہی رہا، تمام گھناؤنی عادتیں اس میں سرائیت کی ہوئی ہیں۔ دوسرا نوجوان جو ایک انسپکٹر پولیس کا لڑکا تھا، اس حالت کو پہنچا کہ چانڈو خانوں میں اس کی زندگی گذر رہی ہے، کبھی صاحبِ جائیداد تھا، آج ٹکے ٹکے کا محتاج ہے۔ آواز کسنے میں یہی پیش پیش تھا۔ تیسرا نوجوان بی اے کرنے کے بعد کٹا ہوا پتنگ ہو گیا، آج تک سکون سے محروم ہے۔

(بوئے گل نالہ دل دودِ چراغ محفل، ص ۱۷)

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں کہ: "علم و بصیرت اگر

چاہتے ہو تو یہ علو و ترفع کیوں؟ روشنی کے طالب ہو تو جہاں سے ملے لے لو، یہ نہ دیکھو کہ چراغ شمع کافوری ہے یا مٹی کا دیا؟"

مولانا آزادؒ کی یہ مختصر تحریر فکر انگیز، بصیرت افروز، ایمان پرور، معلومات کا خزانہ، افادات کا گنجینہ اور نوخیز طلباء، راہ نوردان علم و عرفان کی خدمت میں تحفہ فکر و عمل ہے۔ **الیس منکم رجل عقیل فهیم۔**

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے تمام اساتذہ کا ادب و احترام فرماتے اور اکثر اساتذہ اور اکابر کے تذکرہ سے ان کی محفل آباد رہتی۔ اساتذہ کا تذکرہ زبان پر جاری رہتا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی نظر میں اپنے اساتذہ اور بزرگوں کو پوری طرح سمولیا تھا اور وہی ان کے یہاں مثالی شخصیات تھیں۔

اساتذہ سے تعلق اور غایت احترام:

" حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد متعدد مقامات پر گئے۔ مراد آباد میں مادر علمی تشریف لے گئے، وہاں ہر ہر درسگاہ میں کچھ کچھ دیر ٹھہرے اور بتلاتے رہے کہ میں نے یہاں فلاں استاذ سے یہ کتاب پڑھی تھی۔ دارالحدیث میں ان سے عرض کیا گیا کہ طلبہ کو بخاری شریف کی حدیث پڑھادیں۔ انہوں نے منظور کرلیا لیکن جب سبق پڑھانے لگے تو درمیان میں نہ بیٹھے۔ اس جگہ سے ہٹ کر بیٹھے جہاں استاذ مکرم مولانا سید فخر الدین صاحبؒ بیٹھ کر سبق پڑھایا کرتے تھے اور یہ وجہ طلبہ کو بتلا بھی دی۔ یہ مثال آج کے دور میں طالبان علوم دینیہ کے لئے قابل تقلید سبق ہے۔" (ترجمان اسلام مفتی محمود نمبر، ص ۹۲)

حضرت مفتی صاحبؒ کو شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے باضابطہ نسبتِ تلمذ حاصل نہیں تھی۔ مارچ ۱۹۸۰ء میں جب حضرت مفتی صاحب دیوبند گئے تو حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا نانوتویؒ، مولانا محمود الحسنؒ کے مزارات پر حاضری دی لیکن حضرت مدنی رحمہ اللہ کے مزار مبارک پر بہت دیر ٹھہرے اور روتے رہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس حضرت مدنی رحمہ اللہ کی ا سان کے موضوع پر تقاریر کی صاف آواز میں چند کیسٹیں بھی تھیں وہ ہر وقت انہیں اپنے ساتھ رکھتے اور سنتے رہتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے اساتذہ بھی مفتی صاحبؒ کی ذہانت، خدمت اور ادب کی وجہ سے ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔

محمود کا جواب پہلے بھی درست تھا اور اب بھی درست ہے:

ذیل میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ذہانت اور بچپن کے چند دلچسپ واقعات نذر قارئین ہیں۔

" حضرت مولانا عجب نور صاحبؒ نے طلباء کو سامنے بٹھا کر خیالی شرح عقائد کا امتحان لینے کے لئے کچھ سوالات لکھوائے اور جوابات لکھنے کے لئے کہا۔ ان طلباء میں مفتی صاحبؒ اور مولانا میرک شاہ صاحبؒ بھی تھے جو مفتی صاحبؒ کے ہم درس ہونے کے ساتھ ساتھ چھوٹی کتابوں کے مدرس بھی تھے۔ جوابات موصول ہونے پر مولانا عجب نور صاحبؒ نے غصہ کے عالم میں کہا دوبارہ لکھو۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے دوبارہ لکھنے سے انکار کر دیا لیکن استاذ نے جب لکھنے پر اصرار کیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے وہی پہلا جواب

دوبارہ لکھ دیا۔ مولانا عجب نورؒ نے جوابات ملاحظہ فرمانے کے بعد پھر حکم دیا کہ ایک بار پھر لکھو۔ مفتی صاحبؒ نے تیسری بار بھی وہی جواب لکھا۔ میرک شاہ صاحب قابل ہونے کے باوجود جواب درست نہ لکھ سکے۔

اس پر مولانا عجب نور صاحبؒ نے مولانا میرک شاہ صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ محمود کا جواب پہلی مرتبہ بھی درست تھا اور اب بھی درست ہے۔ میں نے یہ سب کچھ تمہارے لئے کیا ہے مگر تم نے اب بھی غلط جواب لکھا ہے۔"

محمود! تم ٹھیک کہتے تھے:

" ایک مرتبہ افغانستان کے مولانا عبدالغفور صاحبؒ "صدرا" پڑھا رہے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ نے دوران سبق کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ استاذ نے غصہ میں کہا "تم کہاں سے آگئے؟ جو میں پڑھا رہا ہوں یہی ٹھیک ہے لیکن دوسرے دن جب سبق پڑھانے بیٹھے تو مولانا عبدالغفور صاحبؒ نے فرمایا محمود! تم ٹھیک کہتے تھے، میں نے غلط پڑھایا تھا۔"

(ترجمان اسلام مفتی محمود نمبر، ص ۴۱)

فقاہت و بصیرت کا حسین امتزاج:

حضرت مفتی صاحبؒ کی ذہانت کی وجہ سے تمام اساتذہ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ خود حضرت مفتی صاحبؒ نے تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا جب کوئی شخص مجھ سے بات کرتا ہے تو میں اس کا صرف پہلا جملہ سن کر پوری بات کا اندازہ کر لیتا ہوں۔ پھر فرمایا علماء نے لکھا ہے کہ بھاری جسم والا انسان عموماً کم ذہن ہوتا ہے الا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ۔

لیکن خود حضرت مفتی صاحبؒ بھی ذہانت، فقاہت، بصیرت اور جسامت کے موزوں اور حسین امتزاج میں امام محمدؒ کا پرتو اور عکس تھے۔

"حمد اللہ" مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے:

شیخ الحدیث حضرت مولانا موسیٰ خان روحانی البازی رحمہ اللہ علیہ فرماتے تھے:

" میں نے اپنے شیخ حضرت مولانا مفتی محمودؒ جیسا حافظہ کسی کا نہیں دیکھا۔ مراد آباد میں " کتاب حمد اللہ " کا تحریری امتحان تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے امتحان سے قبل ممتحن سے کہا میری تلاشی لے لو کیوں کہ " حمد اللہ " مجھے لفظ بہ لفظ بمع حواشی کے زبانی یاد ہے، کہیں تم بعد میں یہ شبہ نہ کرو کہ محمود نے کتاب سے نقل کی ہے۔ (استاذ نے کہا: کوشش کرو کہ عبارت تمہاری اپنی ہو۔ چنانچہ کتاب کی عبارت من وعن لکھنے کی بجائے اپنی عبارت بنا کر تینوں سوالوں کے جواب لکھے۔ اس وقت پرچہ کے کل نمبر ۵۰ ہوا کرتے تھے۔ استاذ نے ۵۰ کے بجائے ۵۵ نمبر دیئے۔ اساتذہ کی مجلس میں ان نمبروں پر اعتراض ہوا تو استاذ نے کہا ان کا پرچہ نکال کر آپ حضرات دیکھ لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تمام اساتذہ نے ان نمبروں پر اطمینان کیا۔ پرچہ دیکھنے والے استاذ نے کہا کہ میں چاہتا تھا اسے دگنے یعنی ۱۰۰ نمبر دوں لیکن شاید آپ حضرات قبول نہ کرتے۔ محمود نے تو تینوں سواالات کو جس طرح حل کیا ہے، ملا حمد اللہ سے اچھا حل کیا ہے …… از مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ)

نماز میں انہماک:

ذہانت کے ساتھ ساتھ عام بچوں کی طرح حضرت مفتی صاحبؒ نے بچپن

میں شرارتیں بھی کیں لیکن ان کی شرارتوں میں بھی ذہانت کا عنصر زیادہ حاوی نظر آتا ہے۔"

محمد شریف کیانی صاحب رقم طراز ہیں:

" خانقاہ یاسین زئی میں مولانا سید عبدالحلیم کے لڑکے صاحبزادہ محمد اور صاحبزادہ عبدالحمید ان کے ہم عمر تھے۔ ان کی عمروں میں بہت کم فرق تھا۔ فارغ اوقات میں باہم مل جل کر کھیلتے۔ کبھی کبھی آپس میں الجھ پڑتے اور جھڑپ بھی ہو جاتی۔ صاحبزادہ محمد (غالباً یہ عبدالحمید صاحب تھے کیونکہ دونوں ہم سن بھی تھے اور میں نے واقعہ بھی ان کے حوالے سے سنا ہے..... از مولانا فضل الرحمن مدظلہ) اور حضرت مفتی صاحبؒ چونکہ قریب قریب ہم عمر تھے اس لئے زیادہ تر معر کے انہی کے رہتے۔ ایک بار مسجد میں نماز کے دوران امام نماز پڑھا رہے تھے کہ ان دونوں نے پچھلی صف میں لڑنا شروع کر دیا۔ ان کا جھگڑا نماز کے دوران برابر جاری رہا لیکن جونہی امام نے سلام پھیرا یہ دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمود نے بھاگ کر دوسرے کمرے میں نماز کی نیت باندھ لی۔ صاحبزادہ محمد کھڑکی سے کود کر باہر نکل گئے۔ امام صاحب کو شک تو تھا کہ یہی دونوں لڑکے ہوں گے لیکن چونکہ آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اس لئے تذبذب میں تھے، انہیں ڈھونڈتے ہوئے اور تلاش کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا محمود بڑے انہماک سے نماز میں مصروف ہیں اور صاحبزادہ محمد وہاں موجود ہی نہیں۔ سوچ میں پڑ گئے کہ نماز کے دوران پچھلی صف میں لڑا کون تھا۔ محمود تو اکیلا نماز پڑھ رہا ہے۔ لگتا ہے مجھ سے سننے

میں کچھ غلطی ہوگئی ہے یا میں سٹھیا گیا ہوں۔ "

(قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر، ص ٢٩)

میں نے جمعہ پڑھا دیا ہے:

" مولوی غلام رسولؒ، حضرت مفتی صاحبؒ کے اساتذہ میں سے تھے اور سلم العلوم حضرت مفتی صاحبؒ کو پڑھاتے تھے۔ مولوی صاحب موصوف شیخ بدین کی مسجد کے امام تھے۔ (شیخ بدین، بیز واور پنیالہ کے درمیان اونچے پہاڑ کا نام ہے جہاں سے اس علاقہ کے شمالی پہاڑ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ پہاڑ گرمیوں میں سرد ہے۔ اوپر ایک گاؤں شیخ بدین کے نام سے ہے۔ کسی زمانے میں یہ انگریزی فوج اور پولیس کا موسمی ہیڈ کوارٹر ہوا کرتا تھا۔ اس وقت ایک مسلمان افسر نے مولوی غلام رسول صاحب کو اطلاع کی کہ آج جمعہ کی نماز پڑھانی ہے۔ مولوی صاحب کے نزدیک چند گھروں پر مشتمل اس گاؤں میں نماز جمعہ جائز نہ تھی مگر انگریز کی حکومت میں افسر کو انکار کرنا بھی مشکل تھا چنانچہ ہاں کر دی۔ یہ واقعہ میں نے خود بھی مولانا غلام رسول صاحب سے سنا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ چھوٹی عمر کے تھے لیکن بلا کے ذہین تھے، سوچا کہ اگر استاذ نے جمعہ پڑھا دیا تو جواز جمعہ فی القریٰ کے لئے دلیل بن جائے گا اس لئے خود ہی یہ فریضہ سرانجام دے دیا اور اس طرح بڑی مشکل سے علماء کو نجات دلا دی............ از مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ) چنانچہ مولانا غلام رسول صاحبؒ تیز تیز قدم اٹھاتے آرہے ہیں کہ راستے میں محمود (مفتی محمود صاحبؒ) مل گئے۔ ان سے جمعہ کی نماز کے بارے میں استفسار کیا۔ محمود نے جواب دیا آپ پریشان نہ ہوں، میں نے جمعہ پڑھا دیا ہے۔ مولوی غلام

رسولؒ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولے اچھا یہ تو بتاؤ جمعے کا خطبہ آتا تھا، اس میں کیا پڑھا تم نے؟ محمود مسکرائے پھر جواب دیا آپ نے سلم العلوم کے جو سبق پڑھائے تھے وہ یاد تھے، پہلے خطبے میں کل کا سبق سنا دیا، دوسرے میں آج کا۔ (میری یادداشت میں یہ کتاب کافیہ تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو ازبر یاد تھی۔ آدھا کافیہ پہلے خطبہ میں اور آدھا کافیہ دوسرے خطبہ میں سنا دیا...... از مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ) یہ جواب سن کر مت پوچھئے کہ مولوی غلام رسولؒ کا کیا حال ہوا۔ چند لمحے تو ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے کیونکہ سلم العلوم منطق کی کتاب تھی اور اس کا جمعے کے خطبے سے دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ سنبھلے تو اس اثناء میں محمود نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ وہ زیر لب مسکرا کر رہ گئے۔ مفتی محمودؒ ان دنوں بمشکل بارہ سال کے ہوں گے۔" (قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر ص ۳۲)

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ نے ذکاوت و ذہانت اور طبعی وقار ودیعت فرمایا تھا۔ اس بنا پر آپ زمانہ طالب علمی میں اپنی جماعت میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہتے تھے۔ خوش قسمتی سے آپ کے اساتذہ نے جس انداز سے آپ کی تعلیمی اور اخلاقی تربیت کی اس نے شروع ہی میں آپ کو شاہراہ ترقی پر کھڑا کر دیا اور پوری زندگی میں یہ تربیت آپ کی رہنما ثابت ہوئی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو جو صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں یقیناً وہ وہبی تھیں۔ اس قحط الرجال کے دور میں ایسی شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں لیکن جب پیدا ہوتی ہیں تو ایسے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں جن سے آئندہ آنے والی نسلیں رہنمائی حاصل کرتی رہتی ہیں۔

ہر دل کو نہیں ملتی متاع غم جاناں
ہر ظرف، محبت کا سزاوار کہاں ہے

باب : ۳

درس و تدریس، علمی انہماک و افادہ

ذوقِ ادب اور شوقِ مطالعہ

درس و تدریس ایک عبادت ہے، ایک لازوال سعادت ہے۔ عرفان حق اور خدارسی کا ایک زینہ ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ہمارے اکابر کا تعلیم و تدریس کی نشر و اشاعت سے ایسا شغف تھا کہ برصغیر پاک و ہند کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا بچا ہو جہاں اسفار کی سختیاں اور مشقتیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر کے انہوں نے **خیرکم من تعلم القرآن و علمه** کا پیغام نہ پہنچایا ہو۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی انہی نابغہ روزگار اور فقید المثال علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ مسند تدریس کے تاجدار تھے۔ دقیق و غامض مضامین کے سمجھانے کا بہترین ملکہ خداوند عالم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ موصوف نے ایک عرصہ تک مختلف علوم و فنون کی چھوٹی بڑی متعدد کتابوں کے درس کے ساتھ ساتھ کافی عرصہ تک قاسم العلوم ملتان میں حدیث کی مشہور کتاب بخاری شریف کا درس بھی دیا۔ تدریس کی لائن میں آپ کو شان محبوبیت حاصل تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا تدریسی

سفر مدرسہ معین الاسلام عیسیٰ خیل ضلع میانوالی سے شروع ہوا اور بہت قلیل عرصے میں ملتان کے سب سے بڑے دینی تعلیمی ادارے قاسم العلوم میں صدر مدرس، شیخ الحدیث اور مفتی کے منصب و مسند کو رونق بخشتا ہوا قاسم العلوم کے اہتمام پر اختتام پذیر ہوا۔

حمیت اسلامی کا حیرت انگیز واقعہ:

حضرت مفتی صاحبؒ جب مراد آباد سے فارغ التحصیل ہو کر وطن واپس تشریف لائے تو کم از کم دو سال فارغ رہے۔ ان کی فراغت کے زمانے میں گھر کے مالی حالات بہت پریشان کن تھے۔ ان کے بڑے بھائی بیمار تھے اور اہل خانہ پر اکثر فاقے گزرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس حالت سے سخت دل گرفتہ اور پریشان تھے۔ وہ اپنے گھر والوں پر گزرنے والے فاقے نہیں دیکھ سکتے تھے اور تدریس کے لئے کسی موزوں جگہ کے متلاشی تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ان کے پاس مرزائیوں کے قادیان سے آدمی پہنچے اور ڈیرہ اسماعیل خان کے چند بڑے لوگوں سے بھی سفارش کروائی کہ ہم ایک بہت بڑا دینی مدرسہ بنا چکے ہیں، اس میں ایک معقولی یعنی منطق و فلسفہ پڑھانے والے استاد کی ضرورت ہے۔ انہیں شاید مراد آباد وغیرہ سے مفتی صاحبؒ کے معقولی ہونے کا علم ہو چکا تھا اسی لئے وہ ان کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کو سو روپے ماہانہ تنخواہ دینے کی پیشکش کی جو اس وقت کے حساب سے بہت زیادہ تنخواہ تھی اور بہت کم لوگ اتنی تنخواہ پاتے تھے مگر حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی انتہائی غربت کے باوجود اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس پیشکش کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں مسلمانوں کے مقابلے میں مرزائیوں کو معقولی بناؤں۔ چند مخلص اور ہمدرد لوگوں اور دوستوں نے سمجھایا

کہ ملازمت تو غیر مسلموں کی بھی درست ہے، آپ نے پیسے لینے ہیں اور تعلیم دینی ہے، کسی مسلمان کو تو مرزائی نہیں بنانا، پھر آپ کی مجبوری بھی ہے کہ آپ اس ملازمت کو قبول کرلیں مگر حضرت مفتی صاحبؒ انکار پر جمے رہے۔ آخر کار وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد مدرسہ معین الاسلام عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں پندرہ روپے ماہوار تنخواہ پر بغرض تدریس ان کی تقرری ہوئی۔ تقریباً تین سال تک حضرت مفتی صاحبؒ یہاں پڑھاتے رہے۔ اسی دوران ان کی شہرتِ تدریس دور دور تک پھیلتی چلی گئی اور دور دور سے طلباء ان کے پاس آنے لگے۔ اس کے بعد مفتی صاحبؒ کچھ عرصہ کے لئے ابا خیل ضلع بنوں چلے گئے۔ دو سال تک مفتی صاحبؒ نے یہاں پڑھایا لیکن یہ مدرسہ فنڈز کی کمی کی وجہ سے بند کر دیا گیا تو حضرت مفتی صاحبؒ عبدالخیل تشریف لے گئے۔ عبدالخیل جانے کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔

قومی ڈائجسٹ کے نائب مدیر محمد شریف کیانی لکھتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالعزیز کے ساتھ نماز استسقاء میں شرکت کے لئے عبدالخیل آئے۔

مولوی محمود کی ایک شرط:

سید عبدالعزیز شاہ نے نماز پڑھائی، پھر بارش کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی بعد میں محمود سے تقریر کے لئے کہا گیا۔ نوجوان محمود نے کچھ ایسے دل نشین انداز میں تقریر شروع کی اور عام فہم طریقے سے پیچیدہ دینی مسائل پر روشنی ڈالی کہ ایک ایک لفظ سننے والوں کے دل میں اترتا چلا گیا۔ تقریر ختم ہوئی تو سب لوگ اس نوجوان مولوی کے

علم و فضل کے قائل ہو چکے تھے۔ پہلے وہ اسے شاہ صاحب کا ایک عام سا شاگرد سمجھتے تھے، اب انہوں نے ایک نئے انداز سے سوچنا شروع کر دیا۔ عبدالخیل میں ایک امام ہوا کرتے تھے...... مولوی صالح محمد ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سے ان کی مسجد ویران اور غیر آباد تھی۔ انہوں نے سوچا اس نوجوان مولوی کو کسی طرح یہاں کی مسجد سنبھالنے پر راضی کرنا چاہیئے۔ اس کی تقریر سننے کے بعد انہیں گاؤں میں ایک نئے امام مسجد کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ نوجوان مولوی سے بات کی تو اس نے کوئی واضح جواب نہ دیا، اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال دیا۔ سید عبدالعزیز شاہ ایک دو دن ٹھہرنے کے بعد واپس چلے گئے تو گاؤں والوں نے ایک وفد بنایا۔ اس میں تین آدمی تھے۔ محمود کے سسر نیاز محمد بھی اس وفد میں شامل تھے۔ وفد نے سید عبدالعزیز شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یہ نوجوان مولوی ہمیں دے دیا جائے۔ ہمیں گاؤں کی مسجد کے لئے ایک پیش امام کی ضرورت ہے۔ محمود بھی محفل میں موجود تھے۔ سید عبدالعزیز شاہ یہ درخواست سن کر زیرِ لب مسکرائے اور محمود کی طرف دیکھا۔ محمود نے اپنے مرشد کا عندیہ پا کر کہنا شروع کیا:

" مجھے عبدالخیل جانے اور وہاں کی مسجد سنبھالنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میری ایک شرط ہے، گاؤں والے اسے پورا کر دیں یا تسلیم کر لیں تو میں ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔ وفد کے ارکان کے چہرے کھل اٹھے، بے تابی سے کہا ہمیں کچھ سنے بغیر آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ محمود نے کہا نہیں، پہلے میری بات پوری سن لیجئے، اس کے بعد کوئی فیصلہ کیجئے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی شرط کے متعلق بتایا۔ شرط یہ تھی کہ میرے ساتھ ۵۰، ۶۰ طالب علم ہیں، کچھ

یہاں کے ہیں، کچھ باہر سے دور دراز علاقوں سے چل کر دینی علم حاصل کرنے آئے ہیں۔ گاؤں والے میرے ساتھ ان سب کی رہائش اور کھانے کا بندوبست کرنے کا وعدہ کریں تاکہ میں عبدالخیل میں درس و تدریس کا کام جاری رکھ سکوں۔ یہ شرط مان لی گئی۔"

باجرے کی روٹی:

محمود اور ان کے طالب علم عبدالخیل میں آ گئے۔ مسجد آباد ہو گئی۔ پانچوں وقت اذان کی آواز گونجنے لگی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گاؤں والوں نے ایک بڑی سی حویلی ان کے حوالے کر دی۔ یہی ان کا مدرسہ اور یہی ان کی رہائش گاہ تھی۔ کھانے کے وقت لڑکے سالن اور روٹی گاؤں کے مختلف گھروں سے مانگ کر لے آتے۔ ان دنوں چونکہ غربت عام تھی اس لئے زیادہ تر باجرے ہی کی روٹی کھانے کو ملتی۔ گندم ایک تو ویسے ہی کم پیدا ہوتی اور دوسرے سردیوں میں اس کا حصول اور بھی دشوار ہوتا۔

" ایک بار محمود نے گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور کہا باجرے کی روٹی کھا کر میں درس و تدریس کا کام نہیں کر سکتا، اس سے مجھے جسمانی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اگر آپ لوگ کچھ ہمت کریں تو گندم اکٹھی کر لیں۔ اس پر گاؤں والوں نے تمام گاؤں سے گندم اکٹھی کرنی شروع کی۔ تین چار سو گھر تھے لیکن کوشش کے باوجود وہ تین چار ٹوپے (وزن کا مخصوص پیمانہ جو تقریباً ۵۰ کلو بنتا ہے) سے زیادہ گندم اکٹھی نہ کر سکے۔ انہوں نے وہی لا کر محمود کے سامنے ڈھیر کر دی۔"

کھیل اور ورزش:

عبدالخیل میں محمود کی مصروفیات صرف پڑھنے پڑھانے تک ہی محدود نہیں تھیں، فارغ وقت میں ورزش اور کھیل وتفریح کا اہتمام بھی ہوتا۔ اپنے طلباء کی اور اپنی صحت کا بے حد خیال رکھتے۔ عصر کی نماز کے بعد روزانہ ایک والی بال لے کر گاؤں سے باہر نکل جاتے۔ طالب علم بھی ان کے ہمراہ ہوتے۔ کھلی جگہ میں شام تک آپس میں والی بال کا مقابلہ ہوتا۔ کھیل کا کھیل، ورزش کی ورزش۔ والی بال اتنی باقاعدگی اور شوق سے کھیلتے کہ جلد ہی گاؤں میں ان کا نام ہی مولوی والی بال والا مشہور ہو گیا۔ (قومی ڈائجسٹ، ۴۴)

محبوب مشاغل:

والی بال، اونٹ سواری اور شکار حضرت مفتی صاحبؒ کے محبوب مشغلے تھے۔ نشانہ بازی میں انہیں خاص کمال حاصل تھا۔

> " حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک مرتبہ رانا مبارک علی سے فرمایا میرا نشانہ اتنا اچھا ہے کہ تم ٹیڈی پیسہ اگر کہیں بھی پھینک دو میں اسے نشانہ بنا لوں گا۔ رانا مبارک علی نے مزاحاً کہا مجھے ایسے یقین نہیں آتا، نشانہ لگا کر دکھائیے۔ چنانچہ رانا صاحب نے چند گز کے فاصلے پر پیسہ رکھا اور مفتی صاحب نے اسے اڑا دیا۔"

چاندماری:

عید کے دن عبدالخیل اور مضافات میں نوجوانوں کا خاص کھیل چاند ماری ہوتی تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی اپنے شاگردوں اور متعلقین کے ہمراہ چاند ماری (نشانہ

بازی) کیا کرتے۔ ان کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا لیکن ان تمام مشغلوں کو حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک اہم مقصد (نوجوانوں کی سیرت سازی) کے لئے استعمال فرمایا۔ اس ذریعہ سے گاؤں کے بہت سے نوجوانوں کا حضرت مفتی صاحبؒ سے تعلق پیدا ہوا۔ ان کی نشست و برخاست حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس ہونے لگی۔ کافی نوجوانوں کے اخلاق سدھر گئے۔ بعض نے باقاعدہ حضرت مفتی صاحبؒ کے حلقۂ درس میں شمولیت اختیار کر لی۔

قاسم العلوم ملتان میں آغاز تدریس:

عبدالخیل تدریس کے دوران حضرت مفتی صاحبؒ معاشی طور پر پریشان اور تنگدست تھے۔ جو کچھ میسر آتا وہی کھا لیتے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے شاگردِ رشید مرحوم مولانا محمد موسیٰ روحانی البازی بیان فرماتے ہیں میں عبدالخیل میں مفتی صاحبؒ سے کتابیں پڑھتا اور ہر جگہ، ہر حال میں ان کے ساتھ رہتا۔ جب میں بڑی کتابیں پڑھنے کے لئے مدرسہ قاسم العلوم گیا تو حضرت مفتی صاحبؒ سے پڑھی ہوئی کتابیں مجھے ساری کی ساری زبانی یاد تھیں۔ میں نے قاسم العلوم میں داخلے کا امتحان صدرا، حمد اللہ اور خیالی جیسی مشکل کتابوں میں زبانی دیا۔ ممتحن نے حیران ہو کر قاسم العلوم کے صدر مدرس مولانا عبدالخالق کو بتایا کہ ایک پٹھان لڑکا آیا ہے جسے سب کتابیں زبانی یاد ہیں۔ جب اسباق شروع ہوئے تو معلوم ہوا کہ مدرسے میں ایک استاد کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنے استاد مولانا مفتی محمودؒ کا نام پیش کیا۔ چونکہ استاد میری ذہانت اور لیاقت کے معترف ہو گئے تھے اس لئے وہ کہنے لگے کہ اس کا استاد یقیناً قابل آدمی ہو گا۔ انہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کو خط لکھا۔ مفتی صاحبؒ ملتان آ گئے اور تدریس

شروع کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مولانا عبدالخالق نے فتوے کا کام بھی ان کے حوالے کر دیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے تدریس اور افتاء کا کام ساتھ ساتھ جاری رکھا۔

مفتی صاحب مسند حدیث پر:

جب حضرت مولانا عبدالخالق صاحب فوت ہوئے تو ان کے نائب کے طور پر حضرت مفتی صاحبؒ کو شیخ الحدیث کے منصب سے نوازا گیا۔ بعض علماء کا خیال تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ لاکھ ذہین سہی لیکن دورہ حدیث نہیں پڑھا سکیں گے کیونکہ یہ کام مسلسل مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ دینی مدارس کے طلباء اکثر یہ شعر پڑھتے رہتے ہیں............

بن دیکھے جو مدارس میں پڑھاتے ہیں بخاری
آتا ہے بخار ان کو بخاری نہیں آتی

لیکن تھوڑے عرصے میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے ناقدین کو رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے نہ صرف مولانا عبدالخالق کے خلا کو پر کیا بلکہ طلباء کو ان کی کمی ہی محسوس نہ ہونے دی۔

انداز تدریس اور شوق مطالعہ:

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے زمانے کے عظیم محدث، دریائے سیاست کے بہترین شناور، بلند پایہ مفتی، وسیع النظر عالم، بہترین مدرس اور استاد تھے۔ آپ کے انداز تدریس، انداز بیان، تفہیم و تشریح، تحقیق و بیان مذاہب، علمی انہماک اور ذوق و شوق مطالعہ کا نہ تو استقصاء ممکن ہے اور نہ الفاظ کے سانچہ میں انہیں ڈھالا جا سکتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا طرز تعلیم دوسرے اساتذہ سے مختلف ہوتا۔ وہ بات سمجھانے

کے لئے آسان زبان استعمال فرماتے۔ بات مختصر جملوں میں کہتے اور طلبہ کو رٹا لگانے سے بے نیاز کر دیتے۔ حدیث کی کتابوں میں اپنے وقت کے تمام محدثین سے طرز تدریس جداگانہ رکھتے۔ حدیث سے مسائل کا استخراج اور طرز استدلال بڑا عجیب ہوتا۔ وہ اپنی درس گاہ میں صرف محقق مدرس اور محقق عالم ہوتے اور بس۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنی درس گاہ میں علم اور صرف علم کے ترجمان ہوتے تھے۔ انہوں نے کبھی مدرسے کی حدود میں سیاسی امور پر گفتگو نہیں کی۔ درس حدیث کے دوران سیاست ان کے ہاں شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتی۔ طلباء کو مطمئن کرنے کے لئے رات بھر بخاری شریف کا مطالعہ کرتے اور اس حال میں صبح کی اذان ہو جاتی۔ علوم حدیث کے شائقین کے قافلے در قافلے کابل وقندھار سے، کراچی اور خیبر سے، ایران وتوران سے الغرض دنیا کے ہر کونے سے آتے اور حضرت مفتی صاحبؒ ان کی علمی پیاس بجھاتے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے قاسم العلوم ملتان میں علم وعرفان کی ایسی شمع روشن کی جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں طلباء اور علماء کے قلوب منور ہوئے۔

داغ سا دوسرا نہ دیکھو گے
گل ہزاروں ہیں ایک صورت کے

تدریسی انہماک:

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی زرولی خان صاحب رقم طراز ہیں:

'' یہ ہمارے اکابر کی خاص شان اور خاص مقام تھا جو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔ شیخ الحدیث اسی شان کے تھے۔ ایک دفعہ ہمارے نیوٹاؤن کے طلبہ نے مجھ سے کہا کہ مفتی صاحب سے

ملوائیں۔ میرا خود کبھی ملتان جانا نہیں ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ سے شوق ملاقات کے جذبات میں ہم روانہ ہو گئے۔ جب وہاں پہنچے پرانے قاسم العلوم میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آج حضرت مفتی صاحبؒ تشریف نہیں لائے۔ جب باہر نکلے ایک سائیکل اسٹینڈ والے نے کہا کہ نہیں، مفتی صاحب تو صبح سے پڑھا رہے ہیں۔ ہم جب گئے تو دیکھا دارالحدیث باہر تک بھرا ہوا تھا۔ ہم بھی بیٹھ گئے۔ دیکھا تو دو چار سیاستدان بھی جن کے نام لینا مناسب نہیں، بیٹھے ہوئے ہیں۔ انتظار میں ہیں، جب درس ختم ہوا پونے ایک بجے کے قریب میں نے طالب علموں سے پوچھا کہ کتنا درس ہوا۔ کہا کہ چار گھنٹے۔ بخاری شریف پڑھاتے رہے ہیں اور حضرت مفتی صاحبؒ ہر ہر حدیث پر ایسا کلام کرتے تھے جیسے ہم اوائل شوال میں کرتے ہیں اور سال بالکل ختم ہو رہا تھا اور یہ حضرت مفتی صاحبؒ کی کرامت تھی کہ آخر تک کتاب پر ایک امام اور ماہر فن کی طرح حاوی رہتے اور ان کا سبق ایسا راسخ ہوتا تھا کہ تکرار اور مطالعہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اس سے علم کے ابواب کھلتے تھے اور سینہ در سینہ علم ایسا برستا تھا جیسے حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر کے دوران آسمان سے علم جھڑ رہا ہو، برس رہا ہو اور سینے بھرے جا رہے ہوں۔''

(مفتی محمود ایک قومی رہنما، ص ۲۳۲)

پختگی اور وسعت علم:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی بیان فرماتے ہیں:

'' یہ حضرت مفتی صاحبؒ کی انتہائی نمایاں خصوصیت تھی کہ سیاسیات

میں اس درجہ انہماک کے باوجود ان کا علمی استحضار اور علمی ذوق پوری طرح برقرار رہا۔ جب کبھی کسی علمی مسئلے کی بات آتی تو معلوم ہوتا کہ اس کے تمام مالہ و ماعلیہ پوری طرح حضرت مفتی صاحبؒ کی نگاہ میں ہیں اور جب اس موضوع پر بات کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی علمی کتاب کا درس ہو رہا ہے، خاص طور سے احادیث انہیں صرف مفہوماً نہیں لفظاً و متناً بہت یاد تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحبؒ سے ملاقات کے لئے دارالعلوم تشریف لائے تو اپنی تقریر کی تمہید ہی میں مشہور عربی مقولے **"الامر فوق الادب"** پر ایسی فاضلانہ تقریر فرمائی اور اس موضوع پر احادیث و آثار سے ایسے متعارض واقعات بیان فرمائے جن کی طرف پہلے کبھی نظر نہیں گئی تھی۔ عربی زبان و ادب سے بھی مفتی صاحب کو دلچسپی اور مناسبت تھی اور عربی میں گفتگو بلا تکلف روانی کے ساتھ فرماتے تھے۔

سیاسی مصروفیات کے باوجود اس علمی ذوق اور علمی پختگی ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ جس ماحول میں گئے وہاں اپنی ذہانت، طباعی اور علمی وسعت کا لوہا منوایا۔ بات دراصل یہ تھی کہ مفتی صاحب ایک طویل عرصے تک خالص علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اپنی علمی استعداد کو پختہ کیا اور معلومات کو وسعت دی۔ اس کے بعد عملی سیاست میں داخل ہوئے۔ جو لوگ علم میں پختگی حاصل کیے بغیر سیاست ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں، حضرت مفتی محمود صاحبؒ ان سے یکسر مختلف تھے اور ان کا طرز عمل اس معاملے میں مشعل راہ ہے۔"

(ترجمان اسلام مفتی محمود نمبر، ص ۱۷۷)

دینی مدارس کی اصل روح:

آج ہمارے دینی مدارس کو بھی تعلیم و تربیت کی اصل روح پر توجہ دینی چاہیئے۔ بدقسمتی سے آج نہ اساتذہ میں وہ روح باقی ہے اور نہ طلبہ میں، ورنہ ابھی ماضی قریب میں جن علوم کو پڑھ کر امت میں حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت سہارنپوریؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت مفتی کفایت اللہؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ، اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ وغیرہ سینکڑوں ایسے پیدا ہوئے ہوں جنہوں نے ایک عالم کو سیراب کیا اور جو آسمان علم و ہدایت کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ہوں، جن کے علوم نے اس آخری دور میں سمرقند و بخارا اور بغداد کی یاد تازہ کردی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اب انہی علوم کو پڑھ کر ویسی شخصیتیں پیدا نہ ہوں۔

ہمارے مدارس سے متوقع نتائج توقعات سے بڑھ کر برآمد ہوتے اگر تعلیم کو تجارت بنانے سے گریز کیا جاتا۔ چنانچہ اکثر یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ ایک جگہ عمر کا ایک حصہ گذارنے کے بعد جیسے ہی زیادہ رقم کی جگہ ملتی ہے تو اس جگہ سے چلے جاتے ہیں۔ خواہ جہاں سے جارہے ہیں وہاں دین کا کتنا ہی نقصان ہو جائے۔ حالانکہ علمِ دین، تعلیماتِ نبوی اور روحانی ترقی کا مدار فنائیت پر ہے۔ اپنی ذات، خواہشات اور مفادات کے قربان کر دینے اور پیکرِ تسلم و رضا بن جانے سے برکات کا ظہور ہوتا ہے۔

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

بیماری میں چھ گھنٹے درس:

حضرت مفتی صاحبؒ طلباء کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے سبق کا ناغہ بالکل نہیں کرتے تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی سبق ضرور پڑھاتے۔ ایک بار وہ اس قدر بیمار ہو گئے کہ ڈاکٹروں نے کہا اگر آپ نے آرام نہ کیا تو آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ خود طلبہ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے درخواست کی کہ آپ آرام فرمالیں۔ سبق کی چھٹی کرلیں تو حضرت مفتی صاحبؒ نے جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا:

> "میں اپنی زندگی بچانے کے لئے ان غریب طلباء کی زندگی برباد کردوں۔ بحیثیت استاد میں نے ان کے مستقبل کی ذمہ داری لی ہے۔ بیماری کی حالت میں بھی حضرت مفتی صاحبؒ لگاتار چھ گھنٹے پڑھاتے تھے۔"

حضرت گنگوہیؒ کا واقعہ:

اگر ہمارے اسلاف اس قدر محنت اور مشقت نہ کرتے تو مدارس کا یہ جال آج نظر نہ آتا۔ حضرت گنگوہیؒ کے متعلق منقول ہے کہ صحن مسجد میں درس دے رہے تھے۔ بارش ہونے لگی، طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر اندر چلے گئے۔ حضرت نے سب طلبہ کے جوتے اٹھائے اور حفاظت کی جگہ رکھ دیے۔

طالبان علوم نبوت پر شفقت:

طالبان علوم نبوت سے حضرت مفتی صاحبؒ کی شفقت کے چند واقعات ملاحظہ فرمائیں۔ حافظ نور احمد صاحب فرماتے ہیں:

" مجھے یاد ہے کہ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں ایک خیر محمد نامی باورچی ہوا کرتا تھا۔ حضرت نے ایک دفعہ اس کے ذمہ صبح کی نماز کے لئے طلباء کو جگانے کا کام لگا دیا۔ کئی طلباء بے چارے رات کو دیر تک مطالعہ میں مصروف رہنے کی وجہ سے علی الصبح اٹھنے میں سستی کرتے تھے۔ مذکورہ بالا باورچی صاحب مخلص ہونے کے ساتھ کچھ طبعاً سخت بھی تھے اور حکمت و تدبر سے کام لینا تو بہرحال اساتذہ ہی کی بات ہے۔ اس نے طلباء کو جگانے میں کچھ سختی اور تشدد سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی طالب علم سے اس کی تکرار ہو گئی۔ باورچی صاحب نے حضرت مفتی صاحبؒ سے اس کی شکایت کی اور کچھ مزید سختی اور تشدد کرنے کے لئے اختیارات کی درخواست کی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے انہیں حکیمانہ راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ تو فرشی ہو کر عرشی لوگوں کے خلاف باتیں کرتا ہے اور ان پر سختی کرنے کے لئے اختیارات مانگتا ہے۔ تجھے تشدد کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ تو تو سرِ شام عشاء کی نماز پڑھ کر سو جاتا ہے اور یہ بیچارے ہر روز رات بارہ بجے تک کتب بینی یعنی مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں اور صبح کی نماز میں شمولیت کرتے ہیں الا ماشاءاللہ کوئی اکا دکا رہ جائے تو اور بات ہے۔ تو ہر روز رات کو بارہ بجے تک بیدار رہ کر دیکھ، تو کیسے متواتر صبح کی نماز میں شرکت کرتا ہے۔ جا آئندہ تجھے تشدد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ نرمی سے کام لو، حکمت سے اور محبت سے۔ طلباء کے حق میں ایسی بات حضرت مفتی صاحبؒ جیسا شفیق استاد ہی کر سکتا ہے۔" (بحوالہ ترجمان اسلام، ص ۳۱۶)

وظیفے میں اضافے کے مطالبہ پر حکیمانہ طرز عمل:

حافظ نور احمد صاحب ایک اور واقعہ کے راوی ہیں۔ فرماتے ہیں:

" ایک مرتبہ قاسم العلوم کے طلبہ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی عدم موجودگی میں ماہانہ وظیفے کے اضافے کا مطالبہ کر دیا۔ یہ بات یاد رہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی موجودگی میں حضرتؒ سے شرم کے مارے کسی طالب کو کسی مطالبہ کی جرات نہ ہوتی تھی بلکہ اس کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ اس لئے مطالبات کے جتنے بھی واقعات آپ دیکھیں یا سنیں گے وہ سب حضرتؒ کی مدرسہ میں عدم موجودگی ہی کے ہوں گے۔ بہر حال طلبہ کے اس مطالبہ کو مدرسہ کی انتظامیہ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی مدرسہ میں تشریف آوری پر حضرتؒ کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرتؒ نے تمام طلبہ کا دارالحدیث میں اجلاس بلایا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ کا مطالبہ موجودہ مہنگائی کے لحاظ سے بالکل بجا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کا باہمی تعلق ایسا ہوتا ہے جیسا کہ باپ اور بیٹے کا آپس میں ہوتا ہے۔ بیٹا باپ سے مطالبہ کرتا ہے تو باپ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھتا ہے۔ اگر جیب اس کی اجازت دیتی ہے تو وہ اس کا مطالبہ پورا کر دیتا ہے ورنہ اس سے عذر کر دیتا ہے اور دوسرے وقت کا وعدہ کرتا ہے۔ اب آپ حضرات کے مطالبہ پر میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا ہے یعنی مدرسہ کے خزانہ میں تو اس وقت آپ کا مطالبہ پورا کرنے میں قدرے دقت ہو گی البتہ اس کے بعد جونہی یہ عذر رفع ہو جائے گا آپ کا مطالبہ پورا کر دیا جائے گا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی اس مشفقانہ تقریر کو سن کر طلبہ نہایت متاثر

ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارا اب کوئی مطالبہ نہیں، آپ جب مناسب سمجھیں اور جیسے مناسب ہو ویسے ہی فرمادیں۔ اس کے بعد حضرتؒ نے اساتذہ کے اجلاس میں فرمایا کہ وظیفہ میں اب ہی اضافہ کر دیا جاتا مگر شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے وہ عزیز طلبہ کے ذہن میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کرے گا کہ دیکھا تم نے اساتذہ سے اپنا مطالبہ قوت کے بل بوتے پر تسلیم کرالیا۔ اگر یہ بات طلبہ کے ذہن میں آگئی تو ان کے مستقبل کو مخدوش کر کے رکھ دے گی اور ان کے لئے نہایت نقصان دہ ثابت ہوگی۔ لہٰذا میں عشرہ ڈیڑھ کے بعد جب دوسری مرتبہ آؤں گا تو ان کے وظیفہ میں اضافہ کر دیا جائے گا۔"

(ترجمان اسلام، ص ۱۷ ۳)

ایک شفیق اتالیق:

حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنے طلبہ سے بہت محبت اور شفقت تھی۔ ان کا طلباء سے ہمیشہ ایسے تعلق رہا جیسا کسی باپ کا اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اپنا کنبہ سمجھتے، ان کو اپنے مسائل میں شریک کرتے اور خود ان کے مسائل میں شریک ہوتے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا موسیٰ روحانی البازی راوی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

" دوران تعلیم مفتی صاحبؒ کا اپنے تلامذہ سے سلوک ایک سخت گیر استاد کا نہیں بلکہ ایک شفیق باپ کا سا ہوتا تھا۔ ان کا رویہ طلبا کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ ہم ان کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن وہ ہمارے ساتھ ایک دوست کی طرح گھل مل کر باتیں کرتے تھے۔ بسا اوقات تو طالب علم ضرورت سے زیادہ

شوخیاں دکھاتے اور کبھی کبھار مذاق بھی کرتے مگر وہ طلبہ کی ایسی شوخیوں سے ناراض نہ ہوتے۔

میں ان سے کہتا حضرت! آپ طلبہ کو اتنا بے تکلف نہ ہونے دیں۔ اس پر حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ان غریبوں کا اور کون ہے جس سے وہ مذاق کریں گے۔ امراء کے بچے ہوتے تو دنیا کی ہر نعمت میسر ہوتی اور عیش کر رہے ہوتے لیکن دین پڑھنے والے عموماً غرباء کے بچے ہوتے ہیں۔ گھروں سے دور پردیس میں آ کر خدا کا دین پڑھتے ہیں، اگر ہم بھی ان کے لئے جلاد بن جائیں تو ان کی زندگیوں میں محرومیوں کے سوا کچھ نہیں رہے گا۔"

(قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر، ص ۱۸۶)

سراپا شفقت:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ استاد کو بردبار اور حلیم الطبع ہونا چاہیئے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ دوسرا دیکھے تو سمجھے کہ یہ تمہاری اولاد ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے عنقریب تمہارے لئے زمین مسخر کردی جائے گی اور تمہارے پاس کم عمر آئیں گے جو علم کے بھوکے اور پیاسے ہوں گے، تفقہ فی الدین کے خواہشمند ہوں گے اور تم سے سیکھنا چاہیں گے پس جب وہ آئیں تو انہیں تعلیم دینا، مہربانی سے پیش آنا، ان کی آؤ بھگت کرنا اور حدیث بتانا۔

حضرت مفتی صاحبؒ طلبہ کے لئے سراپا شفقت اور پیکرِ مروت تھے۔ وہ اکثر و بیشتر اپنے طلبہ کے ساتھ کھانا کھاتے۔ ان کے ساتھ بیٹھتے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی

اپنے تلامذہ کے ساتھ شفقت و مروت کی داستان تو بہت طویل ہے۔ بطور نمونہ یہ چند جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔

دورہ تفسیر:

حضرت مفتی صاحبؒ نے ۱۹۷۶ء میں پہلی بار قاسم العلوم لاہور میں دورہ تفسیر شروع کیا۔ حضرت مولانا محمد یوسف (جامعہ اشرفیہ) اس دورہ تفسیر کی روداد بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " اس دورے کی خصوصیت یہ تھی پہلی بار تفسیر قرآن کتابی انداز میں پڑھائی گئی۔ یہ تمام مفسرین سے مختلف انداز تھا جو حضرت مفتی صاحبؒ نے اختیار کیا۔ کتابی اور تفسیری طرز تعلیم میں یہ فرق ہوتا ہے کہ تفسیری طرز تعلیم میں آیت کے ربط، شان نزول اور لغوی ومعنوی مباحث کو بیان کیا جاتا ہے جبکہ کتابی طرز تعلیم میں آیت کا مقصد، اس کے تحت آنے والے مسائل، زندگی اور مستنبط ہونے والے ہر فقہی مسائل کو سمجھایا جاتا ہے اور یہی چیز علم کے لئے ضروری ہے۔ تفسیری طریق تعلیم میں ربط اور شان نزول کو جو اولیت دی جاتی ہے اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آیات کے مقاصد پر بحث کی جائے جو معلم اور **متعلم** ہی کی نہیں، عام آدمی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ بات ہمیں پہلی بار حضرت مفتی صاحبؒ سے دورہ تفسیر پڑھ کر سمجھ میں آئی۔"

(قومی ڈائجسٹ مفتی محمود نمبر، ص ۲۰۲)

درس تفسیر کی ایک جھلک:

حضرت مفتی صاحبؒ نے راولپنڈی میں مسجد کرتار پورہ میں درس قرآن دیا

جسے حضرت مولانا سعید الرحمٰن علوی مرحوم نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے محفوظ کیا۔ افادہ عام کے لئے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

دعوت وتبلیغ کی ترغیب وتاکید:

﴿ یایها الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمک من الناس ان الله لا یهدی القوم الکافرین ﴾ (المائدہ، آیت نمبر ۶۷، پارہ ۶)

(ترجمہ) اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف آپ کے ربّ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔ اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو آپؐ نے اللہ کی طرف سے سپرد فریضہ رسالت کا حق ادا نہیں کیا اور آپؐ کو اللہ تعالیٰ لوگوں سے بچالے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اللہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ اے میرے پیغمبر نازل کردہ پیغامات کو بلاکم وکاست لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد تین باتیں ارشاد فرمائیں۔

۱۔ **و ان لم تفعل فما بلغت رسالته .**

۲۔ **والله یعصمک من الناس۔**

۳۔ **ان الله لا یهدی القوم الکافرین۔**

حکم تبلیغ کے بعد یہ تین باتیں کیوں ارشاد فرمائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مبلغ فریضہ تبلیغ میں تین وجہ سے کوتاہی کرسکتا ہے۔ اسے تبلیغ کی اہمیت کا احساس نہ ہو۔ چنانچہ اس احساس کو تیز کرنے کے لئے تبلیغ پر ابھارنے کے لئے اور تبلیغ

کی اہمیت سمجھانے کے لئے پہلی بات ارشاد فرمائی کہ اگر خدانخواستہ آپ ؐ نے ایسا نہ کیا تو آپ ؐ نے گویا رسالت کی تبلیغ نہیں کی۔ چونکہ **بلغ ما انزل** میں امر کا صیغہ ہے اور امر کی مختلف اقسام ہوتی ہیں اس لئے ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے بھی کم درجہ کا امر سمجھتا اور تبلیغ سے پہلو تہی کرتا اس لئے اہمیت جتلانے کے لئے اور یہ بتلانے کے لئے کہ یہ امر وجوب کے لئے ہے خداوند قدوس نے پہلی بات ارشاد فرمائی ﴿ **و ان لم تفعل فما بلغت رسالته** ﴾۔

دوسری وجہ کوتاہی کی مصائب و مشکلات ہیں کیونکہ تبلیغ کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے، مشکلات کا پہاڑ سامنے ہوتا ہے۔ خود حکیم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جو ﴿ **ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة** ...... **الخ**﴾ کے تحت تبلیغ فرماتے تھے، انہیں بھی اتنے دکھ سہنے پڑے کہ بیان سے باہر ہیں۔ پہلی بار جب آپ ؐ نے صفا پر وعظ فرمایا تو حقیقی چچا یوں گویا ہوا "**تبا لک اجمعتنا لهذا**" (معاذ اللہ) کوڑے کرکٹ پھینکے گئے۔ حرم میں نماز پڑھتے ہوئے سجدہ میں کمر مبارک پر اوجھڑی پھینک دی گئی، چادر ڈال کر گلے کو دبایا گیا۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دشمنوں کو آ کر ہٹایا اور فرمایا "**اتقتلون رجلاً ان یقول ربی اللہ**" اہل مکہ کی یہ حالت دیکھ کر آپ ؐ طائف تشریف لے گئے۔ سرداران بنی ثقیف نے مہمان داری کا احساس بھی نہ کیا جو عرب میں دوست دشمن کے لئے ضروری ہے اور وہ سلوک کیا کہ الامان! رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اقدس سے خون بہا، بستی چھوڑنی پڑی، وغیر ذالک۔

اس لئے فرمایا ﴿ واللہ یعصمک من الناس ﴾ لوگوں سے ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی سخت حالات میں پہریدار مقرر فرمایا تھا، اس آیت مبارکہ کے بعد آپؐ نے اسے ہٹادیا۔ آپؐ کو شہادت کی اتنی تمنا تھی کہ فرمایا "والذی نفسی بیدہ لو ددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احییٰ ثم اقتل ...... الخ" لیکن چونکہ حفاظت کا وعدہ تھا اس لئے ظاہری شہادت (کہ دشمن کے ہاتھ سے قتل) نہ ملی۔

آج کچھ لوگ مشکلات کے سبب ہی کہہ دیتے ہیں کہ ہم رخصت پر عمل کرتے ہوئے تبلیغ نہیں کرتے حالانکہ یہ عذر لنگ ہے، یہ حکم جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اسی طرح قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے ہے اور یہ اسی وعدہ کا ثمرہ ہے کہ آج کے انتہائی نازک دور میں خدا ہماری مدد فرما رہا ہے اور ہم بچے ہوئے ہیں۔ ورنہ حالات سے سب ہی واقف ہیں۔ پیغمبر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد ہے کہ " سیکون بعدی ثلثون کذابون دجالون یزعم کلھم نبی اللہ و انا خاتم النبیین لا نبی بعدی " لیکن آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ ختم نبوت کے اعلان پر کیا کچھ نہیں سہنا پڑتا۔ یہ حفاظتِ خداوندی ہے ورنہ حشر سامنے ہے۔ مولانا ہزاروی کا کیا جرم تھا کہ پنڈی سے انہیں ضلع بدر کیا۔ بہر حال مشکلات کا مداوا یوں کیا کہ ہم لوگوں سے تمہاری حفاظت کریں گے۔

کوتاہی کا تیسرا سبب یہ ہے کہ جب مانتا کوئی نہیں تو کیا کریں گے۔ اس

طرح مایوس ہوکر بیٹھ جاتے ہیں، حوصلے پست ہوجاتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تبلیغ فرمائی لیکن کیا ہوا؟ ﴿ رب انی دعوت قومی لیلا و نهاراً. فلم یزدهم دعآء ی الا فراراً ﴾ آخر تنگ ہوکر دعا فرمائی ﴿ رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً ﴾ اللہ نے فرمایا اب فیصلہ ہوچکا ہے، اس کے بعد ان ظالموں کے متعلق مجھ سے کوئی سوال نہ کیا جائے گا ﴿ لا تخاطبنی فی الذین ظلموا انهم مغرقون ﴾ بہرحال اس کوتاہی کا ازالہ فرمایا کہ اس وجہ سے مایوس نہ ہونا کیونکہ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، حوصلہ اس وقت چھوڑنا چاہیئے جب کام اپنے ہاتھ ہو۔ جب کام اللہ کے ہاتھ ہے تو ہمت ہارنے کا کیا مطلب؟ " ان قلوب بنی آدم بین اصابع اللّٰہ یقلب اللّٰہ کیف یشآء " مقلب القلوب خدا کی ذات ہے، ہمیں کوشش کا حکم ہے۔ ہونا نہ ہونا اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے یہ اعتراض کہ ۲۱ سال ہوگئے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بے سود ہے۔ ہمیں حکم ہے ﴿ و قاتلوهم حتٰی لا تکون فتنة و یکون الدین للّٰه ﴾ اگر ۲۱ سال کوشش سے کچھ نہیں ہوا تو ہمارے حوصلے پست نہیں ہونے چاہئیں۔ ۲۱ سو سال ہوجائیں اور ہماری عمریں بڑھ جائیں تب بھی ہمارے حوصلے پست نہ ہوں گے انشاءاللہ۔ کیونکہ فرمان ہے ﴿ ان اللّٰه لا یهدی القوم الکا فرین ﴾ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ وعدے صرف حضور علیہ السلام کے ساتھ ہیں؟ نہیں، یہ قیامت تک کے لئے ہیں۔ سب مبلغین کے لئے ہیں اور خدا کا وعدہ ہی ہمیں بچا رہا ہے۔ یہاں علماء کو

غدار کہا جاتا ہے، ففتھ کالم کہا جاتا ہے اور کہنے والوں کا ماضی سامنے ہے۔ علماء نے انگریز سامراج کے ساتھ آزادی کی جنگ لڑی، جیل آباد کیے، جزیرہ انڈیمان کو بسایا، مالٹا کو رونق بخشی، لال قلعہ سے مسجد جامع تک تختہ ہائے دار کا خیر مقدم کیا اور یہ انگریز سے ملکر غلامی کی زنجیریں مضبوط کر رہے تھے۔ عمارت سے دلچسپی اسے ہوتی ہے جو مقاصد سے دلچسپی رکھتا ہو۔ مثلاً مسجد سے دلچسپی اسے ہوگی جو نماز پڑھتے ہوں، درس وغیرہ کا شوق رکھتے ہوں۔ نماز اذان سے لاتعلق لوگوں کو مسجد سے کیا تعلق؟ اسی طرح پاکستان چونکہ اسلام کے لئے بنا تھا اس لئے اس سے انہیں دلچسپی ہوگی جو اسلام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور جو ۲۱ سال سے اسلام کے راستہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں انہیں اسلام سے کیا تعلق؟ اور جب اسلام سے تعلق نہیں تو پاکستان سے کیا تعلق؟ بات صاف ہے اسلام کا دوست پاکستان کا دوست، اسلام کا دشمن پاکستان کا دشمن۔ ﴿و اللہ یعصمک من الناس﴾ کا کرشمہ ہے کہ علماء مارشل لاء میں بھی دندناتے رہے اور اب بھی دندنا رہے ہیں اور انشاء اللہ دندناتے رہیں گے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ﴿ کتب اللہ لاغلبن انا و رسلی﴾ آگے فرمایا ﴿ قل یا اھل الکتاب ...... الخ ﴾ اے اہل کتاب جب تک تم تورات و انجیل اور اس کے علاوہ دوسری منزّل من اللہ کتابوں کو عملاً قائم نہ کرو گے تمہاری حیثیت کچھ نہ ہوگی۔ اس میں ﴿ ما انزل ﴾ سے اسلام مراد ہے۔ اب یار لوگ کہتے ہیں کہ اسلام قائم کریں تو امریکہ گندم نہ دے گا حالانکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ گندم کا مسئلہ حل فرما چکے ہیں۔

﴿ولو انهم اقاموا التورٰة والانجيل و اما انزل اليهم من ربهم لاكلوا من فوقهم و من تحت ارجلهم ...... الخ﴾

قانون الٰہی کو قائم کرتے تو زمین چشمے ابلتی، اپنے خزانے اگل دیتی اور آسمان سے بھی برکات کا نزول ہوتا۔ اس لئے فلاح وکامیابی اسلام کے قائم کرنے ہی میں ہے۔ اللہ ہمیں حسن عمل کی توفیق بخشے، امین۔"

تفسیر قرآنی اتنا آسان کام نہیں جتنا کہ آج کل سمجھا جاتا ہے۔ ایک جانب ہر لمحہ قرآن کی اہمیت وعظمت اور سلف صالحین کے مسلک کا خیال رکھنا ہوتا ہے تو دوسری جانب زمانہ جدید کے ارتقا اور تحقیقاتی اسلوب کو ملحوظ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اس راہ میں ذرا سی لغزش ہمیشہ کے لئے پایہ اعتبار سے گرانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے انداز تفسیر کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ صرف اس ایک میدان کے ہو کر رہتے تو اپنی انفرادیت اور برتر ذہنی صلاحیت کا لوہا ساری علمی دنیا سے منوا لیتے لیکن مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت کے ان ہی مختلف زاویوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ان کے علمی مقام کو پہچان سکتے ہیں۔

کیا پوچھتے ہو کون ہے یہ کس کی ہے شہرت
کیا تم نے کبھی داغ کا دیوان نہیں دیکھا

حضرت مفتی صاحبؒ کی زندہ تصنیف:

سیاسی امور میں مشغولیت اور مصروفیت کی بنا پر گو آپ کا زمانہ تدریس مختصر رہا لیکن آپ کے کئی شاگردوں نے مستقبل میں اہم علمی مقام حاصل کیا جن میں حضرت

مولانا محمد موسیٰ روحانی البازی جیسی علمی اور یگانہ روزگار شخصیت سرفہرست ہے۔ عرب کی ایک ریاست کے قاضی القضاۃ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے پوچھا آپ نے تصنیفات کی طرف کیوں توجہ نہیں دی؟ مفتی صاحبؒ نے فرمایا میری ایک تصنیف شیخ موسیٰ کو آپ نے پڑھ لیا ہے، اگر اس قسم کی دو چار کتابیں اور پڑھ لیں تو آپ کو یہ سوال مجھ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

ذوق شعر وادب:

حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک مرتبہ اپنے شاگرد رشید شیخ موسیٰ روحانی البازی سے فرمایا موسیٰ خان! مجھے اشعار یاد کرنے کا بہت شوق ہے لیکن مجھے شعر یاد رہتا ہی نہیں اس معاملے میں میرا حافظہ ناقابل اعتماد ہے۔ بعض اشعار تو بہت اچھے ہوتے ہیں اور معمولی سی بات شعر سے خوبصورت ہو جاتی ہے، گو مجھے یاد کرنے کے باوجود شعر یاد نہیں رہتا، جو یاد ہو جاتا ہے ایک آدھ روز کے بعد بھول جاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں یہ مجھ میں کمی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو شعر گوئی کا بہت شوق تھا اور ایسے اشعار پسند تھے جن میں موعظت، نصیحت اور حکمت کی باتیں ہوں۔ اردو اشعار کے مقابلے میں آپ کو فارسی اور عربی اشعار کا زیادہ ذوق تھا۔ زاہد بلند شہری بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۵۲ء میں حضرت مفتی صاحبؒ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں تقریباً سات ماہ جیل میں رہے۔ ایام اسارت میں، میں نے آپ کو عربی زبان میں ایک نظم بھیجی جس کے دو شعر یہ تھے

یا شیخ مجلہ والعلوم العالیہ

دمتم و فزتم بالقطوف الدانيه
اخبر نسيما من يبيت مهاجراً
لتكون يوسفنا برغم العاتيه

اس کے جواب میں حضرت مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہ نے مجھے چند اشعار بھیجے، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو............

"مكان و ما قد احاطة الظلام لمثلى فى زواد المقام"

(ترجمان اسلام، ص ۲۳۷)

مولانا مفتی کفایت اللہؒ کا مرثیہ:

حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی ساری زندگی میں صرف دو قصیدے لکھے۔ ان میں سے ایک حضرت مفتی کفایت اللہؒ کی رثاء میں ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے جذبات کا اظہار یوں فرمایا............

نعزيک يا من فاز بالخير والعلىٰ
بان افلت شمس الهداية للورى
نعزيک يا من صار قلبک فجعة
كذالک بكت اعماق افئدة الورى
اذا مانعى الناعى بموت ولينا
كفاية مولانا و وارث من هدى
وصية شيخ الهند قسمة قاسم
و رشد رشيد فاز بالرشد والتقى
و اشرف خلق الله انور رتبه

و بدر سماء العلم والفقه والفتیٰ
حملنا من الاحزان مالو بعضها
تحمله بعض الجبال لا نحتیٰ
اراضی دیار الهند والسنده اظلمت
بفقد کریم نوره اشرق الدنیٰ
له منن فی اهل علم کثیرة
اشاع علوماً سابقاً کل من سعیٰ
مسائل مستفتین ایضاً یتیمة
کذاک علوم فی المدارس والقریٰ
و ما کان مزعوم الخلائق قبله
ان فی الثریٰ تخفی الکواکب والذکا
و خالقنا الرحمٰن اعطی اجره
و خلده اذ ذاک بالعیش والمنیٰ
و ارضٰکم والغابرین و من بکٰی
و اخلصهم من سورة الحزن والشجٰی
و لما التقت ذات الا له نفسه
فاجاب ارضاء لها رب الوریٰ
غفرانک یوجب من رفیع جنابنا فانت مثیل للملئکة العلیٰ
۲ ۷ ۳ ۱ ھ

(ازماہنامہ القاسم مفتی کفایت اللہ نمبر، صفحہ نمبر ۲۱۸)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ شعروشاعری کے متعلق فرماتے ہیں شعر ہر سلیم الطبع انسان کا فطری ذوق ہوتا ہے، اس سے بہت اچھے اچھے کام بھی نکلتے ہیں جو نثری عبارت سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ انسان کی طبیعت کو کسی خاص چیز پر آمادہ کرنے کے لئے شعر بڑا کام کرتا ہے مگر وہ دو دھاری تلوار ہے۔ اپنی ہلاکت کا سامان بھی بن سکتی ہے اور حفاظت کا بھی۔ دنیا میں عام معاملات کی طرح اس میں بھی بڑی افراط وتفریط ہوتی چلی آئی ہے۔ بہت سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے سارا علم وہنر شعروسخن ہی کو قرار دیکر اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر چھوڑی اور پھر اس دریا میں ایسے غرق ہوئے کہ حلال وحرام اور نیک وبد کا بھی امتیاز نہ رہا اور بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ (بحوالہ البلاغ مفتی اعظم نمبر، ص ۳۷۸)

اس لئے ہمارے اکابر میں سے اکثر نے شعروادب کو اپنا باقاعدہ موضوع کبھی قرار نہیں دیا۔ عربی کے مشہور شاعر لبید کا شعر ہے..........

لو کان الشعر بالعلماء یزری
لکنت الیوم اشعر من لبیدی

لیکن اچھے شعر بھی ہوتے ہیں جو اگر برمحل سنائے اور لکھے جائیں تو بات کی شان بڑھ جاتی ہے۔ شعروشاعری کے مذاق سے اگرچہ حضرت مفتی صاحبؒ کو نسبت تھی لیکن یہ ان کا اصلی فن اور میدان نہیں تھا اس لئے من مدح بغیر فنه فقد و قص کے تحت مفتی صاحبؒ کی شعروشاعری میں تعریف کہیں اس مقولے کی زد میں نہ آجائے اس لئے انہی باتوں پر اکتفا ہے۔

باب : ۴

تقویٰ وانابت، اتباع سنت، مہمان نوازی سادگی وتواضع اور فنائیت

قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی شخصیت بڑی جامع تھی۔ وہ مسجد کے خطیب تھے، امام تھے، مدرسہ کے مدرس تھے، شیخ الحدیث تھے، مفتی تھے، مہتمم ومنتظم تھے، دریائے سیاست کے شناور تھے، حزب اختلاف کے قائد تھے، صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے، ایک منجھے ہوئے پارلیمنٹرین تھے، ایک درویش خدا مست تھے اور عباد الرحمٰن کی عملی تفسیر تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت کا کمال یہ رہا کہ اس میں دین ودنیا، مذہب اور عقل یعنی دوسرے لفظوں میں "جام شریعت" اور "سندان عشق" کا ایسا خوشگوار امتزاج پیدا ہو گیا تھا جو اس زمانہ میں خال خال اشخاص کے یہاں ملتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ رات کی تاریکیوں میں سوز وفغان اور گریہ وبکا میں [illegible] تھے اور اس دولت نیم شبی کو دولت سنجر وسکندر سے اعلیٰ وارفع سمجھتے تھے اور دن میں اعلاء کلمۃ اللہ اور خدمت خلق میں مشغول رہتے۔ وہ "بکاء باللیل و

فرسان بالنهار " کا پیکر مجسم تھے۔

عالم سے بڑھ کر عارف:

مخدوم ومکرم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

" ہری پور جیل میں، میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ تھا۔ میں نے ان دنوں حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھا کہ رات کو تہجد کے علاوہ نوافل کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی عبادت کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ دن کو دوستوں سے محو گفتگو اور رات کو خدا سے راز و نیاز۔ وہ عالم ضرور تھے مگر عالم سے بڑھ کر عارف تھے۔ "

عارفی کچھ دل کی خلوت ہی میں ملتا ہے سکون
جب کبھی دنیا کے ہنگاموں سے گھبراتا ہوں میں

نماز سے عشق:

نماز سے حضرت مفتی صاحبؒ کو اس درجہ عشق تھا اور جماعت اور پابندی وقت کا اس قدر اہتمام تھا کہ ان کو دیکھ کر "قرة عيني في الصلوٰة " کے معنی سمجھ میں آ جاتے۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن فرماتے ہیں:

" ہم نے بارہا حضرت مفتی صاحبؒ کی مجلسوں میں شرکت کی اور آپ کے ساتھ سفر کی معیت بھی حاصل رہی مگر کبھی [illegible] خلاف سنت کام کرتے نہیں دیکھا۔ آپ [illegible] شدید بیماری کے جماعت کی نماز ترک نہیں فرماتے [illegible]

کے ساتھ خود جماعت قائم فرماتے تھے۔ کوشش ہوتی کہ دینی معاملات میں رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کیا جائے۔

لاکھوں میں ایک:

حیدر آباد میں ایک بہت بڑا عوامی جلسہ تھا جس میں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو، چاروں صوبوں کے گورنر اور وزرائے اعلیٰ بھی سٹیج پر موجود تھے۔ لاکھوں کا مجمع تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی بحیثیت وزیر اعلیٰ سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ بھٹو صاحب کی تقریر جاری تھی، دوران تقریر مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز آنی شروع ہوئی تو بھٹو صاحب نے تقریر روک دی۔

جوں ہی اذان ختم ہوئی، بھٹو صاحب نے دوبارہ تقریر شروع کر دی۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے وہیں سٹیج پر اپنا رومال بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی ....

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائی یک تن بیگانہ کہ آشنا باشد

صبح کے اخبارات نے جلسے کی کوریج کرتے ہوئے تصویروں کے ساتھ جو سرخی باندھی وہ ابھی تک احقر کے لوح قلب پر نقش ہے "لاکھوں میں ایک"۔

لاکھوں کے مجمع میں صرف حضرت مفتی صاحبؒ ہی وہ واحد شخصیت تھے جو سرکاری پروٹوکول کی پرواہ کیے بغیر مؤذن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے پروردگار کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ ع

تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز:

احقر کو وہ منظر اب بھی یاد ہے جب حضرت مفتی صاحبؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے احقر کی اولین مادرِ علمی مدرسہ عربی نجم المدارس کلاچی تشریف لائے تھے۔ احقر ان دنوں غالباً دوسرے درجے کا طالب علم تھا۔ تمام سرکاری افسران اور پولیس آفیسرز حضرت مفتی صاحبؒ کے استقبال میں پہلے سے موجود اور افسران کی ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ سرکاری پروٹوکول میں تھی۔ مسجد میں جماعت پہلے سے ہو چکی تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے وضو بنانے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ سب وضو بنا رہے ہیں۔ کوٹ پتلون والے بھی، وردی والے بھی، ضلعی حکام بھی، مقامی انتظامیہ بھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے مولانا حافظ محمد صدیق مرحوم کی درسگاہ میں جماعت سے نماز پڑھائی۔ عجیب منظر تھا، پوری سرکاری مشینری سربسجود تھی ...... ع

پھر نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

تیمّم اور اشاروں سے نماز پر موت کو ترجیح:

حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ:

'حضرت مفتی صاحبؒ شدید بیمار تھے، ڈاکٹر عبدالصمد اور سرجن رحمٰن صاحب آپ کے معالج تھے۔ ان دونوں نے جب زیادہ بے آرامی دیکھی تو آپ کو کاڈیو ویسکولر کے شعبے سی سی یو میں داخل کر دیا اور آپ کے جسم پر دو آلہ منسلک کر دیا جس سے کہ چوبیس گھنٹے آپ کے دل کی رفتار کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اس طرح حضرت مفتی صاحبؒ کو بالکل بے قابو کر دیا۔ اب آپ نہ ہل سکتے

> تھے اور نہ اٹھ سکتے تھے، غالباً عصر یا مغرب کی نماز کا وقت ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے خدام حسن اور حسین (یہ دو طلبہ ہمارے جامعہ کے طالب علم ہیں اور فرانس کی نو آبادی "ری یونین" کے رہنے والے ہیں۔ یہ کراچی میں مفتی صاحبؒ کی خدمت میں رہتے تھے) سے کہا کہ مجھے اٹھا کر اوپر کرو۔ انہوں نے اوپر کیا تو آپ نے اپنے ہاتھوں سے ان چیزوں کو نکال دیا اور خود وضو کرنے تشریف لے گئے۔ وضو کے بعد جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ نرسیں پریشانی میں بھاگ کر آئیں کیونکہ ٹیلی ویژن پر دھڑکنوں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹروں کو مطلع کیا۔ ڈاکٹر حضرات تشریف لائے تو حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھ سے تیمم اور اشاروں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی جاتی، زیادہ سے زیادہ مر ہی جاؤں گا مگر نماز کے لئے آپ کو اپنی یہ پابندی ختم کرنا پڑے گی۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۳۲)

قومی اتحاد کی میٹنگوں میں نماز کا وقت ہو جاتا تو حضرت مفتی صاحبؒ نماز کے لئے اٹھ جاتے۔ مفتی صاحبؒ حتی الوسع نماز قضا نہ کرتے۔ تہجد بھی التزام سے پڑھتے البتہ کبھی کبھار نماز فجر کے بعد سو جاتے۔

مفتی صاحب بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے:

حضرت مفتی صاحبؒ کے ڈرائیور ظہور احمد اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> " پھر میری آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا ہے کہ وہ شیر سیاست بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک جمعہ کے روز ان کے پاؤں پر

سوجن اتنی تھی کہ چلنا تو درکنار ہلنے جلنے کا یارا بھی نہ تھا۔ ڈاکٹروں نے بھی چلنے پھرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ اس روز انہوں نے دوگانہ گھر پر ہی ادا کیا۔ میں جمعہ پڑھ کر آیا تو دیکھا مفتی صاحبؒ رو رہے ہیں۔ سوچا شاید پاؤں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ وجہ دریافت کی تو تکلیف پاؤں کی نہیں تھی، روح کی تھی۔ فرمانے لگے: ظہور! خدا جانے مجھے میری کس غلطی کی سزا ملی ہے کہ میں آج جمعہ کی نماز کے لئے مسجد نہیں جا سکا۔ پھر وہ دیر تک استغفار کرتے رہے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۷۵)

آج عملی زندگی میں دینیات، دینی فکر، دینی ذہن، اسلامی معاملات اور اسلامی معاشرت تو متروک ہو چکی ہے۔ صرف نماز باقی رہ گئی تھی مگر مسلمانوں نے اسے بھی طاق نسیان پر دے مارا ہے۔ بہت سے فقیر، بہت سے پیرزادے اور بہت سے صاحبزادے تارک صلوٰۃ ہو کر بھی مرجع خلائق ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

قرآن مجید سے تعلق ومحبت:

حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب لکھتے ہیں:

" تقریباً اڑھائی سال قبل رمضان ۹۸ھ، ۷۸ء میں رشید میاں سلمہ راولپنڈی حضرت مفتی صاحبؒ سے ملنے گیا۔ مفتی صاحبؒ بے حد علیل تھے، نماز عشاء کے بعد تراویح میں خود تو شامل نہ ہو سکتے تھے، مسجد جامعہ اسلامیہ (قاری سعید الرحمٰن صاحب کے یہاں) قرآن پاک سنتے رہے۔

قاری سعید الرحمٰن صاحب کے پاس جامعہ اسلامیہ میں قیام تھا۔ نماز عشاء کے بعد تراویح میں تو شریک نہ ہو سکے، مسجد کے برآمدے میں باہر بیٹھ کر

نہایت انہماک سے قرآن پاک سنتے رہے اور رقت جیسی کیفیت دیر تک رہی۔ اس وقت رشید میاں نے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔ یہ بھی ان کے ساتھ خاموش بیٹھا قرآن سنتا رہا۔" (ترجمان اسلام، ص ۹۳)

حضرت مفتی صاحبؒ خود بھی قرآن مجید کے **سبعہ عشرہ** قرأتوں کے مکمل قاری تھے اور مراد آباد میں مدرسہ شاہی میں مولانا قاری محمد عبداللہ سے علم تجوید وقرأت مکمل کیا تھا۔ قاری ہونے کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ حافظِ قرآن بھی تھے۔ جب وہ حجازی لہجے میں قرآن پڑھتے تھے تو اک سماں بندھ جاتا تھا۔

اتباع سنت:

بزرگان دین اور اولیاء اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، فرمودات اور افعال کا صحیح نقشہ اور عملی تصویر ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے اقوال و افعال اور ارشادات وفرامین میں وہی جلوے اور جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جو قدرت نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ودیعت کر رکھی تھیں۔

چونکہ یہ علماء، اولیاء اور اتقیاء ہمیشہ نہیں رہ پاتے اس لئے ان کے فرمودات، اعمال اور افعال کو بطور نمونہ خلق خدا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کے رشد و ہدایت کے چراغ سے پوری انسانیت منور ہو جائے۔

حضرت مفتی صاحبؒ بھی ان بزرگ ہستیوں میں سے تھے جن کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، الغرض ہر ادا سے اتباع سنت کی جھلک نمایاں نظر آتی۔ حضرت مفتی صاحبؒ چھوٹی چھوٹی سنتوں پر بھی اہتمام کے ساتھ عمل فرماتے اور ہر حال میں اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے۔ جو ان کا قال تھا وہی ان کا حال تھا۔

اتباع سنت کا اہتمام:

حضرت مفتی صاحبؒ کے حرمین کے میزبان مخدوم ومکرم حضرت مولانا ملک عبدالحفیظ صاحب (جو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے خلیفہ اجل ہیں) اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اولاً سب سے پہلے اور اہم ان کا ہر چھوٹی بڑی چیز میں اتباع سنت نبویہ کا خاص طور پر اور بالکل بے تکلف انداز سے اہتمام فرمانا ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اور عام لوگوں کو اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ میرے خیال میں اس کے شواہد اتنے کثیر ہیں کہ اگر اسی میں تعمق کیا جائے تو کئی دفتر تحریر کئے جاسکتے ہیں۔ مجھے خاص طور سے حج کا ایک واقعہ اس وقت ذکر کرنا ہے کہ (حج میں مزدلفہ سے ۱۰/ ذوالحجہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صبح فجر کے بعد شروق سے قبل چل کر منیٰ تشریف لائے۔ رمی جمرۃ کیا، پھر سو اونٹ کی قربانی کی، حلق کروایا، کپڑے پہنے، پھر مکہ مکرمہ حرم شریف تشریف لے گئے۔ طواف زیارت، پھر سعی اور پھر منیٰ واپس تشریف لاکر ظہر کی نماز ادا کی) اس سنت پر بتفصیلہ میرے خیال میں آجکل اس بھیڑ کے زمانے میں شاید ہی کوئی عمل کی کوشش کرتا ہو اور پھر اگر صفت علالت بھی ہو۔ مگر حضرت مفتی صاحبؒ نے عرفات میں ہی اس عاجز کو خاص طور سے بلا کر فرمایا بھئی ہم مہمان تو ملک عبدالغنی صاحب کے ہیں مگر مزدلفہ سے منیٰ ہماری گاڑی میں تم ساتھ ہو گئے۔ چونکہ ہمیں منیٰ کے سب کام نمٹا کر سیدھے مکہ مکرمہ جانا ہے اور پھر ظہر انشاء اللہ منیٰ آکر پڑھنی ہے، پھر مزدلفہ میں حسب معمول تہجد بھی مزے لے کر پڑھی اور صبح

ہشاش بشاش ہو کر طے شدہ نظام کے مطابق منیٰ کے سارے کاموں سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔" (ترجمان اسلام، ص ۴۸)

یہی ایک سجدہ ہی تو ہے:

جمعیت علمائے اسلام کے دیرینہ کارکن و رہنما حضرت مولانا بشیر احمد شاد صاحب حضرت مفتی صاحبؒ کے انتہائی قریب رہے۔ وہ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور دیگر جماعتوں کے رہنماؤں نے پنجاب کا آخری دورہ کیا تو مجھے بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ چلنے کی سعادت حاصل رہی اور حضرت مفتی صاحبؒ کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ حضرت مفتی صاحبؒ چھوٹی چھوٹی سنتوں کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس سفر کا ایک واقعہ بطور مثال عرض کرتا ہوں۔

۱۹/ جولائی دن بھر جہلم میں قیام فرمایا۔ عوام کے مختلف وفود سے ملاقات فرماتے رہے اور عوام کے مسائل سنتے رہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے نماز مغرب کی امامت کے فرائض انجام دیئے تو ایک ساتھی جماعت کے ساتھ شریک ہونے کے لئے آیا تو حضرت مفتی صاحبؒ پہلی رکعت کے سجدہ میں تھے، وہ آنے والا ساتھی دوسری رکعت کے لئے انتظار میں کھڑا رہا اور جب حضرت مفتی صاحبؒ دوسری رکعت کے لئے اٹھے تو جماعت میں شامل ہو گیا۔ نماز سے فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے دریافت کیا کہ مجھے

شک ہوا ہے کہ آپ، پہلی رکعت میں سجدہ کے دوران پہنچ چکے تھے، جماعت میں شامل ہونے کے بجائے دوسری رکعت کے لئے امام کے کھڑے ہونے کا انتظار کرتے رہے جس پر اس ساتھی نے اس بات کی تصدیق کر دی تو حضرت مفتی صاحبؒ فوراً اصلاحی انداز میں بہت پیار سے فرمانے لگے خدا کے بندے! یہ ایک ہی تو سجدہ ہے جو کسی شمار و حساب میں نہیں آتا لیکن اس کی قیمت دنیا و مافیہا سے زیادہ ہے، اس منافع کی چیز کو مت چھوڑا کرو اور فوراً سجدہ میں چلے جایا کرو، شاید اللہ تعالیٰ کو یہی سجدہ پسند آ جائے۔''

(ترجمان اسلام، ص ۳۰۴)

صحابہ کرامؓ سے محبت:

حضرت مفتی صاحبؒ عشق و محبت، ذوق و شوقِ عبادت اور اتباع سنت کی عملی تصویر تھے۔ انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے عشق تھا۔ وہ صحابہ کرامؓ کو نبوت کی صداقت کا بہترین گواہ قرار دیتے۔

حضرت مولانا عبدالحکیم اکبری مدرس جامعہ معارف الشرعیہ ڈیرہ اسماعیل خان حضرت مفتی صاحبؒ کی مجلس کے حاضر باش اور قریبی خادمانہ تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ نے انہیں علم و فضل سے بھی نوازا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

'' حضرت مفتی صاحبؒ قربانی کے موقعہ پر اپنے والدین، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی طرف سے بھی ان کے حصہ کی قربانی کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔ اگر عید کے موقعہ پر گھر پر ہوتے تو اپنی نگرانی میں قربانی کراتے ورنہ مولانا فضل الرحمٰن کو حکم دیتے، وہ مفتی

صاحبؒ کی طرف سے اس کا اہتمام فرماتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین سے کتنی محبت وتعلق تھا۔" (ترجمان اسلام، ص ۳۸)

صدقاتِ نافلہ اور تبرّعات:

اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنی راہ میں خرچ کرنے کا ذوق بھی وافر عطا فرمایا تھا۔ قربانی چونکہ صدقات واجبہ میں شمار ہوتی ہے اس فریضے کو تو آپ احسن طریقے سے ادا کرتے، ساتھ تبرعات اور صدقات نافلہ کا بھی خوب اہتمام فرماتے۔ عام طور سے کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے بلکہ کچھ نہ کچھ دیکر ہی رخصت فرماتے۔ خاص طور پر آپ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے جو ﴿للفقراء الذين احصروا في سبيل الله لا يستطيعون ضرباً في الارض يحسبهم الجاهل اغنياء من التعفف تعرفهم بسيمٰهم لا يسئلون الناس الحافاً و ما تنفقوا من خير فان الله به عليم﴾ (صدقات کے مستحق صرف وہ غرباء ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے، جو ملک میں چل پھر نہیں سکتے۔ نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انہیں مال دار خیال کرتے ہیں، آپ ان کے چہرے دیکھ کر قیافہ سے انہیں پہچان لیں گے وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے تم جو کچھ مال خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے) کے زمرہ میں شمار ہوں۔

بچوں کی مٹھائی:

حضرت مفتی صاحبؒ کے ڈرائیور ظہور احمد بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ گاڑی میں پٹرول ڈلوایا اور اپنی جیب سے دو صد روپے نکالے، پٹرول پمپ والے نے پچاس

روپے واپس کر دیے تو وہ مجھے عنایت کر دیے اور فرمایا بچوں کے لئے مٹھائی لے جانا۔

مہمان نوازی:

حضرت مفتی صاحب ؒ کی جود و سخا اور وسعت و فراخی صرف اپنے متعلقین ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ ہمیشہ اس کا مظاہرہ رہتا۔ خاص کر اگر کوئی مہمان آ جاتا تو آپ باوجود غربت اور تنگ دستی کے مہمان کی ضیافت کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام فرماتے۔ اس کے باوجود بھی ہمیشہ یہ کسک محسوس فرماتے کہ ضیافت کا جو اہتمام ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہو سکا۔

وزیر اعلیٰ نہیں، مفتی محمود ہوں:

قومی ڈائجسٹ کے نائب مدیر محمد شریف کیانی تحریر کرتے ہیں:

" وزیر اعلیٰ بننے کے بعد پہلی مرتبہ جب اپنے آبائی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے تو پولیس کو اپنے پروٹوکول میں ساتھ ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ جس طرح وزارت میں آنے سے پہلے لوگوں کی دکانوں پر بیٹھ کر ان سے آزادانہ گپ شپ لگاتے تھے، اس دن بھی اسی طرح سب دوستوں سے جا کر باری باری ملے، سب سے دوستانہ ماحول میں بے تکلفی سے گفتگو فرمائی اور ان میں سے بعض لوگوں سے چائے بھی پی۔ لوگ درخواستیں لے کر اکٹھے ہو گئے تو مسکراتے ہوئے کہنے لگے اللہ کے بندو! میں یہاں وزیر اعلیٰ نہیں، مفتی محمود بن کر آیا ہوں۔ کبھی تو ذرا آرام سے بیٹھ کر کسی کے ساتھ سکون سے دو چار باتیں کر لینے دیا کرو۔

ہم بہت غریب اور چھوٹے لوگ ہیں:

محمد شریف کیانی مزید لکھتے ہیں:

درخواستوں پر دستخط کر رہے تھے کہ ایک ساتھی بول اٹھا: حضرت! آپ بھی کمال کرتے ہیں چھوٹے اور معمولی معمولی کاموں کے لئے لوگوں کی سفارشیں کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس پر حضرت مفتی صاحبؒ ہاتھ روک کر بولے اللہ کے بندے! ہمارا علاقہ بڑا پسماندہ ہے، ہم خود بہت غریب اور چھوٹے لوگ ہیں۔ ہماری خواہشیں اور آرزوئیں بھی بہت چھوٹی ہیں، ہمارے بھائیوں کے لئے یہی بہت ہے کہ کسی کا بیٹا کہیں ماسٹر ہو گیا یا کوئی سپاہی بھرتی ہو گیا، ہمیں زیادہ کا لالچ نہیں۔

نہ زیادہ غریب ہوں اور نہ بے مروت:

کیانی صاحب یہی بات آگے بڑھاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

شام کے وقت اپنے گاؤں عبدالخیل جانے لگے تو ڈی سی جو سارا دن پروٹوکول میں ان کے ساتھ ساتھ رہا تھا، آگے بڑھا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: اچھا جناب! مجھے اجازت دیجئے آپ اپنے گھر جا رہے ہیں، میں اپنے گھر جاتا ہوں۔ مفتی صاحبؒ نے سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگے اللہ کے بندے! میں یقیناً غریب ہوں لیکن اتنا بھی غریب نہیں کہ عبدالخیل میں تمہیں ایک پیالی چائے بھی نہ پلا سکوں، اب تم نے یہاں میرے ساتھ جتنا وقت گزارا اور تقریبات میں شرکت کی وہ تمہاری ڈیوٹی تھی، اب میرے ساتھ مہمان بن کر چلو، میرے گھر میں تمہیں

یہاں کا آرام اور آسائش تو نہیں ملے گی لیکن خلوص کے ساتھ تمہیں ایک پیالی چائے ضرور پلا سکتا ہوں۔ رات اگر وہیں رکنا چاہو تو ٹھہرنے کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے، میں اتنا غریب نہیں نہ اتنا بے مروت ہوں۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۴۷)

مہمان کا اکرام:

حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمی صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

" آپ جب وزیر اعلیٰ تھے ایک سفر میں، میں آپ کے ہمراہ تھا۔ میرے ذمہ جو کام لگایا گیا تھا اس کی تکمیل میں کچھ دیر ہو گئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کھانے کی میز پر میرا انتظار فرما رہے تھے۔ اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا تو حضرت مفتی صاحبؒ خود تشریف لے آئے اور فرمانے لگے بھئی کافی دیر سے کھانے کے لئے آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے مگر آپ آئے نہیں۔ اٹھئے پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر یہ کام کرتے رہنا۔ میں بہت شرمندہ ہوا اور عرض کیا حضرت! آپ سیکرٹری سے فرما دیتے اور مجھے بلوا لیا ہوتا، آپ نے خود کیوں تکلیف فرمائی۔ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ آپ میرے عزیز بھی ہیں اور مہمان بھی۔ مہمان کی عزت نہ صرف اسلام کے احکامات میں شامل ہے بلکہ ہمارے پٹھانوں کے ہاں تو اس کا زیادہ شدت سے خیال رکھا جاتا ہے اس لئے ضروری تھا کہ اپنے مہمان کو لینے میں خود آتا۔

(ترجمان اسلام، ص ۱۲۲)

مہمان نوازی سنت انبیاء ہے۔ خصوصاً ابراہیم خلیل اللہ بڑے مہمان نواز تھے۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

اکرام سے مراد مرغن غذائیں، ذائقے دار کھانے اور با تکلف انواع واقسام کے پھل نہیں ہیں بلکہ گھر میں جو کچھ موجود ہو سادہ سالن مثلاً چنے کی دال وغیرہ وہی مہمان کے سامنے دستر خوان کی رونق اور شان بنادی جائے۔

دال نہ کھاؤں تو کیا کروں:

حضرت مفتی صاحبؒ جب سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو اکثر اس قسم کے واقعات پیش آتے رہے۔ محمد شریف کیانی صاحب رقم طراز ہیں:

> " مولانا مفتی محمودؒ وزیر اعلیٰ بنے تو ایک پرانے ساتھی انہیں ملنے پشاور پہنچے، باتوں باتوں میں کھانے کا وقت آ گیا۔ گوشت کا اس دن ناغہ تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھی نے دل ہی دل میں سوچا آج کھانے کا لطف آ جائے گا۔ کم از کم مرغی تو ضرور ہوگی۔ جب دستر خوان بچھا اور انہوں نے ایک ڈونگہ اٹھایا تو اندر سے دال نکلی۔ برا سا منہ بنا کر دوسرے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس میں سبزی پڑی ہوئی تھی۔ بڑے بددل ہوئے لیکن چونکہ بھوک زور کی لگی ہوئی تھی اس لئے مجبوراً کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد گفتگو کا دور چلا، ان سے رہا نہ گیا۔ بولے جناب! کمال ہے مدرسوں میں دال چاٹتے گذر گئی، اس کم بخت سے یہاں وزیر اعلیٰ کے گھر میں بھی پیچھا نہ چھوٹا۔
>
> حضرت مفتی صاحبؒ خوب ہنسے اور کہا اللہ ـــ بندے! کیا کروں قومی اسمبلی سے پندرہ سو روپے ماہانہ الاؤنس ملتا ہے۔ تم ہی بتاؤ اتنی رقم میں دال نہ

کھاؤں تو اور کیا کروں۔ باقی اخراجات بھی تو آخر اسی رقم سے پورے کرنے ہیں۔"

پرہیزانے:

حضرت مفتی صاحبؒ مریض تھے۔ زیادہ تر شوگر کا مرض رہتا اس لئے پرہیزی کھانا اور غذا کھاتے۔ مہمانوں کی بھی عام طور پر سادہ دال گوشت اور سبزی سے تواضع کی جاتی۔ ان کے دسترخوان پر مرغ پلاؤ یا مرغن کھانوں کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک بار حضرت مفتی صاحبؒ نے مولانا محمد امیر المعروف بہ مولانا بجلی گھر کو فون کیا کہ آجایئے! کچھ کام ہے۔ مولانا بجلی گھر نے جواب دیا حضرت کھانے کا وقت ہو رہا ہے، میں کھانا کھا کر آؤں گا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے دعوت دے دی کھانا میرے ساتھ کھالینا۔ مولانا بجلی گھر نے فوراً ہنستے ہوئے فرمایا نا! بابا! نا! میں مریض نہیں ہوں آپ کے ہاں تو پرہیزانے ہوتے ہیں، میں نہیں کھا سکتا، اپنے گھر سے کھانا کھا کر آؤں گا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے مولانا بجلی گھر کی بات سن کر ایک قہقہہ لگایا اور فرمانے لگے اچھا تو پھر تم ہی اپنے ساتھ کچھ لے آؤ۔ دونوں مل کر کھالیں گے۔ مولانا بجلی گھر نے گردن ہلائی اور بولے یہ ہوئی نا بات۔ ٹھیک ہے میں آدھ گھنٹے میں آ رہا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ پھر دکان سے اٹھ کر سلاطین ہوٹل پہنچے۔ اس ہوٹل کے تکے مشہور ہیں۔ وہاں سے انہوں نے تکے بنوائے اور گاڑی میں بیٹھ کر چیف منسٹر ہاؤس جا پہنچے۔

چینی ختم ہوگئی:

ایک بار کراچی سے محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ پشاور تشریف

لائے تو انہیں پی ڈبلیو ڈی کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ حضرت بنوریؒ چائے کے معاملے میں بڑے نفیس ذوق کے مالک تھے، بڑے اہتمام سے ان کے لئے چائے بنتی۔ حضرت بنوریؒ، مفتی صاحبؒ کے ذاتی مہمان تھے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام مفتی صاحبؒ کی طرف سے ہوتا۔

" ایک مرتبہ چائے پینے بیٹھے تو پتہ چلا گھر میں چینی ختم ہوگئی ہے۔ فون قریب رکھا تھا، ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور پشاور یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے چیئر مین پروفیسر مولانا محمد اشرف مرحوم کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے مولانا محمد اشرف ملے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان سے فرمایا مولانا! آج چائے میرے ساتھ پیجئے، حضرت بنوریؒ بھی بیٹھے ہیں، ابھی آجایئے اور ہاں اپنے ساتھ تھوڑی سی چینی بھی لیتے آیئے گا، ہمارے گھر میں ختم ہوگئی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد اشرف اپنے گھر سے چینی لائے تو حضرت مفتی صاحبؒ نے چائے پی اور اپنے مہمان حضرت بنوریؒ کو بھی پلائی۔

(قومی ڈائجسٹ، ص ۴۳)

تواضع کی انتہاء:

مہمانوں کی خدمت اور عزت افزائی حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا معمول تھا۔ مہمان کو گھر کے لئے برکت سمجھتے تھے۔ خود ذاتی طور پر ان کے آرام کا خیال رکھتے۔ فرمایا کرتے مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دور دراز سے محبتیں اور عقیدت لے کر ہمارے پاس آتے ہیں، ان کا اکرام کرنا بہت ضروری ہے۔ جب بھی کوئی مہمان ملاقات کے لئے آتا تو ہر ایک سے اٹھ کر معانقہ کرنے کی کوشش فرماتے۔

" ایک مرتبہ شیخ عزیز الرحمٰن ڈیروی بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اس دوران جو نیا ملاقاتی یا سائل آتا اس سے باقاعدہ اٹھ کر ہاتھ ملاتے اور پھر دوبارہ کام میں مصروف ہو جاتے۔ غالباً ان دنوں حضرت مفتی صاحبؒ وزیر اعلیٰ تھے۔ شیخ عزیز الرحمٰن نے انہیں یوں بار بار اٹھ کر لوگوں سے ملتے دیکھا تو چپ نہ رہ سکے۔ بولے حضرت! آپ نے پہلے ہی بھاری بھرکم جسم کا بوجھ اٹھا رکھا ہے، گھاس پر بیٹھے بیٹھے ہی ملاقاتیوں سے ہاتھ ملا لیا کیجئے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے پلٹ کر ان پر نظر ڈالی اور کہا شیخ صاحب! آپ مجھے بداخلاق بنانا چاہتے ہیں، موٹاپے کی وجہ سے بار بار اٹھ کر لوگوں سے ہاتھ ملانے میں تھوڑی سی تکلیف ہی ہوتی ہے نا! تو کیا ہوا، اس ذرا سی تکلیف کے لئے میں اپنے اخلاق اور شرافت چھوڑ دوں۔"

بلندی اخلاق:

یہ تکلف نہیں تھا، آپ کا مزاج بن گیا تھا اور آپ کی عادت میں یہ بات داخل ہو گئی تھی خصوصاً اگر مہمان عالم دین ہوتا تو آپ علمائے کرام کے احترام میں زیادہ التزام فرماتے۔ آنے والے علماء میں اکثر آپ کے تلامذہ بھی شامل ہوتے مگر ان کے لئے بھی آپ احتراماً کھڑے ہوتے اور بہت ہی خندہ پیشانی سے استقبال کرتے۔ یہ بات اگرچہ معمولی معلوم ہوتی ہے مگر عملی اعتبار سے اس کا وزن وہ قلوب محسوس کریں گے جو متکبر اور غرور نفس کے مریض علماء اور رہنماؤں سے ملنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے ہاں غرور نفس یا تکبر نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے اخلاق و کردار کی یہ بلندی اس قدر بے نظیر تھی جس نے آپ کی

شخصیت کو بلند سے بلند کر دیا تھا۔ بڑا ہو کر ان اخلاقی قدروں کو قائم رکھنا ہی انسانیت کی بلندی ہے اور یہی عظیم انسان اور عظیم رہنما ہونے کی دلیل ہے۔

کارکنوں کا اکرام:

حضرت مفتی صاحبؒ کے شاگردِ رشید خطیب پاکستان حضرت مولانا ضیاء القاسمی مرحوم مفتی صاحبؒ کے وزارت علیا کے دور کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

" جب حضرت مفتی صاحبؒ صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ تھے ریلوے کے ایک سیلون میں ہم حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہر اسٹیشن پر علماء اور عوام ہزاروں کی تعداد میں استقبال اور زیارت کے لئے آتے تھے۔ سیلون پر پولیس کا سخت پہرہ تھا اس کے باوجود کارکن فرطِ عقیدت سے سیلون کے ساتھ لٹک جاتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو قطعاً یہ گوارا نہیں تھا کہ کارکن یوں سردی میں ٹھٹھر جائیں۔ پولیس کو بلا کر ہدایت فرمائی کہ کسی کارکن کو تکلیف نہ ہونے پائے۔ تمام ضابطے کارکنوں کے لئے بالائے طاق رکھ دیئے جائیں مگر کارکن اور عقیدت مندوں کے لئے دروازہ کھول دیا جائے تا کہ انہیں کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔ راستے میں کھانے کا وقت آ گیا تو سب سے پہلے سیلون میں جبراً داخل ہونے والے افراد کو کھانا کھلایا گیا۔

صبر وتحمل اور اکرام مسلم:

مولانا ضیاء القاسمی اسی سلسلہ مضمون میں مزید تحریر فرماتے ہیں:

ایک کافر ساز واعظ بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے سیلون میں داخل ہو گیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے مجھے خصوصی طور پر فرمایا کہ اس کو حلوا کھلایا جائے تا کہ اس کو قلبی مسرت اور فرحت حاصل ہو۔ واعظ کے کام و دہن کی خوب تواضع کی گئی۔ وہ بہت دیر تک حضرت مفتی صاحبؒ سے غیر متعلقہ گفتگو کرتا رہا مگر آپ اپنی فطری تواضع اور بلندی اخلاق کی وجہ سے اس کی تمام گفتگو کو سنتے رہے۔ ذرہ برابر چہرے پر ملال کے آثار نہیں آنے دیے۔ یہی واعظ اور اس قبیلہ کے بیسیوں کافرساز مقرر حضرت مفتی صاحبؒ کی گلا پھاڑ کر مخالفت کیا کرتے تھے مگر حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی گفتگو کے ادنیٰ اشارہ سے بھی اس کو شرمندہ نہ کیا۔" (ترجمان اسلام نمبر، ص۱۲۲)

دل کے غنی تھے:

حضرت مفتی صاحبؒ دل کے بہت غنی تھے۔ ایک مرتبہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے فرمایا کہ ہمارے مولوی محمد علی بہت غنی ہیں۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ کیا ان کے پاس بہت دولت ہے۔ ارشاد فرمایا: بڑے احمق ہو روپیہ سے کہیں کوئی غنی ہوتا ہے، اصل غنا تو دل کا غنا ہے اور یہی دل کا غنا حضرت مفتی صاحبؒ کا اصل سرمایہ حیات تھا۔

دس ہزار کا چیک:

محمد عرفان قادری رقم طراز ہیں:

" کراچی میں لالہ اسرار احمد خان جو کہ ضلع حیدرآباد کے بڑے وڈیروں اور چودھریوں میں شمار ہوتے تھے، نے حضرت مفتی صاحبؒ سے ملاقات کی اور حضرت مفتی صاحبؒ کو مبلغ دس ہزار روپے کا چیک پیش کیا کہ آپ اپنی

ذات کے لئے قبول فرمالیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ کہہ کر چیک واپس کر دیا کہ میری ضروریات الحمدللہ پوری ہو رہی ہیں۔ جب خان صاحب نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا اگر آپ مدرسہ کی خدمت کریں تو اس پر ہم دونوں کو اجر ملے گا۔ خان صاحب نے وعدہ کر لیا اور چالیس ہزار روپے دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا جس میں سے پہلی قسط کے طور پر مبلغ بیس ہزار روپے بذریعہ ڈرافٹ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کو ارسال کر دیے گئے۔" (ترجمان اسلام نمبر، ص ۹۸)

اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے:

مرشد العلماء حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب مدظلہ، خانقاہ سراجیہ کندیاں فرماتے ہیں:

" تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے دوران ایک بار مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحبؒ بے حد مالی مشکلات سے دوچار ہیں۔ میں اُن سے سہالہ میں ملنے کے لئے اکثر جاتا رہتا تھا، لیکن انہوں نے مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ ان کا ہاتھ تنگ ہے۔ جب مجھے حالات کا علم ہوا تو میں جاتے وقت کچھ پیسے بھی ساتھ لے گیا۔ میں نے مفتی صاحبؒ کو یہ بتائے بغیر رقم دینے کی کوشش کی کہ مجھے ان کے حالات کا علم ہے، لیکن انہوں نے کچھ لینے سے یکسر انکار کر دیا۔ وہ میرے اصرار پر یہی کہتے رہے کہ "اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے"۔

میں نے اپنی سی بہتیری کوشش کی کہ انہیں وہ رقم دینے میں کامیاب

ہو جاؤں لیکن انہوں نے میری ایک بھی نہ چلنے دی۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، آخر کار مجبور ہو کر وہ رقم میں ان کے تکیہ کے نیچے چھوڑ آیا۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۱۲)

وزیر اعظم بھٹو کا تحفہ مسترد کر دیا:

حضرت مفتی صاحبؒ کس طرح کے حفاظتی اقدامات یا اپنے ساتھ کوئی مسلح محافظ رکھنے کے حق میں نہیں تھے لیکن پے در پے جب ان پر تین چار بار قاتلانہ حملے ہوئے تو ساتھیوں اور ورکروں نے مجبور کیا کہ اپنے ساتھ مسلح محافظ رکھیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان کے کہنے اور مجبور کرنے پر ایم جی تھری کے لائسنس کے لئے درخواست دے دی۔ قومی اسمبلی کا ممبر ہونے کے ناطے انہیں ایم جی تھری رکھنے کا استحقاق حاصل تھا۔ امید تھی لائسنس بھی جلد مل جائے گا لیکن درخواست دیے کئی دن گذر گئے، حکومت کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی خاموش رہے کہ ٹھیک ہے لائسنس بننا ہے تو بن جائے گا ورنہ ایم جی تھری کی کیا ضرورت، اللہ مالک ہے۔

ایک بار پنڈی میں مقیم تھے کہ پرائم منسٹر ہاؤس سے بلاوا آ گیا وزیر اعظم ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس وقت قومی اتحاد کے صدر تھے۔ انہوں نے جواب دیا میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں گا۔ اگر انہوں نے رائے دی تو ملاقات کروں گا ورنہ مجبوری ہے۔ ساتھیوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا ملاقات میں کیا حرج ہے؟ پرائم منسٹر ہاؤس چلے جایئے، دیکھئے وزیر اعظم بھٹو کیا کہتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ شام کو پرائم منسٹر ہاؤس پہنچے۔ مسٹر بھٹو بڑی گرم جوشی سے ملے اور دیر تک مزاج اور صحت کے متعلق پوچھتے رہے، پھر ایکا ایکی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ چند

سیکنڈ بعد واپس آئے تو دونوں ہاتھوں پر ایک لمبا سا ڈبا اٹھا رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ کے سامنے آ کر رک گئے اور تقریباً رکوع میں جھکتے ہوئے یہ ڈبہ ان کے سامنے پیش کیا اور بولے حضرت! قبول فرمایئے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اس ڈرامائی انداز پر کچھ پریشان سے ہو گئے۔ حیرت سے مسٹر بھٹو کا چہرہ تکنے لگے اور کہا جناب یہ کیا ہے؟ کیا قبول کروں؟

وزیر اعظم بھٹو بولے "ایم۔ جی تھری" آپ کے لئے میری طرف سے ایک حقیر سا تحفہ۔ حضرت مفتی صاحبؒ چونک کر چند قدم پیچھے ہٹ گئے اور بولے جی نہیں، میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔ حیرت ہے مسٹر بھٹو نے کہا، ایک مسلمان عالم دین ہو کر ایک بھائی کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے فرمایا: جناب! تحفہ کیسا؟ کہاں کا بھائی؟ میں نے اس کے لائسنس کے لئے آپ کی حکومت کو باقاعدہ درخواست دے رکھی ہے، تحفہ تو وہ ہوتا ہے جو بے طلب کسی کو عطا کیا جائے، یہ تو نہیں، میں معذرت خواہ ہوں۔ مسٹر بھٹو نے بہت اصرار کیا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کسی طرح ان کے ہاتھوں سے ایم جی تھری کا ڈبہ لے لیں مگر حضرت مفتی صاحبؒ ان کا تحفہ قبول کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ (قومی ڈائجسٹ، ص ۴۹)

خالی چیک یا گندگی کا ٹوکرا:

حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں درج ذیل واقعہ ان کے ایک شاگردِ رشید نے سنایا کہ جب بھٹو صاحب وزیر اعظم تھے اور حضرت مفتی صاحبؒ قائد حزب اختلاف۔ دونوں میں آئینی جنگ جاری تھی۔ ان دنوں وزیر اعظم بھٹو نے اپنے ایک

مرکزی وزیر جناب فیض اللہ خان کنڈی مرحوم کو کمشنر ڈیرہ اسماعیل خان جناب جہانزیب خان کے ہمراہ حضرت مفتی صاحبؒ کے گاؤں عبدالخیل بھیجا۔ دونوں نے عبدالخیل پہنچ کر حضرت مفتی صاحبؒ سے ملاقات کی اور ساتھ ہی مدرسہ قاسم العلوم ملتان کی مالی مدد کے نام پر کروڑوں روپے کی آفر کی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ آفر ٹھکرادی۔ وزیر موصوف فیض اللہ خان کنڈی نے جب دیکھا کہ دال گلتی نظر نہیں آتی تو اپنی پیشکش ایک کروڑ سے دو کروڑ کردی۔ آخر میں ایک سادہ چیک یہ کہہ کر پیش کیا کہ مجھے وزیر اعظم بھٹو کا حکم ہے آپ خود اس میں جتنی رقم درج کرنا چاہیں درج کردیں۔ ہم ادائیگی کردیں گے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے تیور بدل گئے اور کہا فیض اللہ خان! تم میرے مہمان ہو، میرے پڑوسی ہو (فیض اللہ خان گل امام کے رہنے والے تھے۔ گل امام اور عبدالخیل میں صرف چند کلومیٹر کا فاصلہ ہے) تم مجھے خوب پہچانتے ہو۔ یہ کمشنر صاحب شاید مجھے نہ جانتے ہوں، تمہارے لئے بہت افسوس کی بات ہے کہ میرے پاس گندگی کے ٹوکرے اٹھا کر لے آئے ہو۔ کبھی چھوٹا ٹوکرا آگے کرتے ہو، کبھی بڑا، فیض اللہ خان! گندگی تو گندگی ہوتی ہے، چھوٹی ہو یا بڑی۔ اسے اٹھالو اور وزیر اعظم بھٹو سے کہہ دو ہم لوگ اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جن کے سامنے دنیا جیسی حقیر و ذلیل چیز کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

استغناء کی تلوار:

حضرت مفتی صاحبؒ اللہ کے سچے بندے، عاشق زار، وفادار اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص جانثار تھے۔ دنیا سے کنارہ کش اور بیزار تھے۔ حضرت لاہوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ دنیاداروں کی غرور کی گردن کو کاٹنے کے لئے میں نے استغناء سے

زیادہ تیز دھار آلہ نہیں دیکھا۔

" امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: جو لوگ روٹی کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور اسی کے لئے جیتے ہیں ان میں اور ایک کتے میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی روٹی کے لئے بھونکتا ہے اور دم ہلا کر مالک کے پیچھے چلتا ہے۔ روٹی کوئی چیز نہیں، اصلی چیز عقیدہ اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دھن ہے۔"

جس بندے پر اللہ کی قدرت و عظمت اور کبریائی و مشکل کشائی منکشف ہو جاتی ہے تو وہ اہل دنیا، امراء، سلاطین اور مال دار لوگوں اور ان کے مال و دولت اور خزانوں سے بے طمع ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں ثروت، دولت، مالی مفاد اور ٹھاٹھ باٹھ مور و مگس کی طرح بے قیمت ہو جاتے ہیں..................

جا اے! خیال غیر کہ فرصت نہیں یہاں
ہیں جلوہ گاہ ناز کی مہمانیوں میں ہم

دنیا سے بے رغبتی انسان کو تقویٰ کے بلند ترین مقامات پر پہنچا دیتی ہے۔ اس راہ میں فتویٰ ہزار تاویلیں بتائے مگر تقویٰ کا دامن ان بلند کردار اور زاہد و متقی لوگوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی میں تقویٰ کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔

بد دیانتی کا سبق:

جب حضرت مفتی صاحبؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے انہی دنوں کا قصہ ہے کہ:

" خواجہ محمد زاہد ڈیروی اور شیخ عزیز الرحمٰن ڈیروی حضرت مفتی صاحبؒ

کے ہاں مہمان تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ مذکورہ دونوں حضرات سحری کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ حضرت مفتی صاحبؒ بھی ان کے کمرے میں آ گئے۔ آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ باتوں باتوں میں پارٹی کا ذکر چل نکلا۔ شیخ عزیز الرحمٰن نے ہنستے ہوئے کہا مفتی صاحب! آپ اس وقت اقتدار میں ہیں، اپنی جماعت کے لئے کسی مستقل فنڈ کا بندوبست کر دیں تو ہماری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: شیخ صاحب! آپ بھی عجیب آدمی ہیں، آپ مجھے بددیانتی کا سبق دینا چاہتے ہیں۔" (قومی ڈائجسٹ، ص۴۴)

جماعت کی امانت:

گل شیر خان مجاہد، ڈیرہ اسماعیل خان کے باشندے ہیں اور جمعیت علماء اسلام کے دیرینہ کارکن اور حضرت مفتی صاحبؒ کے محبِ صادق ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں:

"۱۹۷۷ء کے الیکشن کے دنوں میں، میں جمعیت کا خزانچی ہوتا تھا۔ تین اور افراد بھی اس عہدے پر فائز تھے۔ شہری حلقے سے ہمارے پانچ امیدوار انتخاب لڑ رہے تھے۔ ہم ان کو حساب کتاب کر کے روزانہ خرچے کے لئے رقم دے دیتے تھے۔ ایک بار مدرسہ نعمانیہ ڈیرہ میں بیٹھے تھے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی واسکٹ اتاری اور میری طرف پھینکتے ہوئے بولے: "اس واسکٹ کی جیب میں تین سو روپے میرے ذاتی ہیں، باقی جتنی رقم ہے وہ نکال لو، یہ پارٹی کی ہے۔" میں نے رقم گنی۔ تھوڑی دیر بعد حضرت مفتی صاحبؒ آئے تو میں نے بتایا کہ حضرت! آپ کی جیب سے تیرہ ہزار روپے نکلے

ہیں۔ انہوں نے تیزی سے کہا: "میرے ذاتی تین سو روپے نکالو، باقی رقم جماعت کی امانت ہے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۲۵۹)

چنے کھانے سے انکار کر دیا:

حضرت مفتی صاحبؒ کے ڈرائیور عبد الحلیم لکھتے ہیں:

" ایک مرتبہ راولپنڈی سے آتے ہوئے گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ جس جگہ ٹائر پنکچر ہوا اس جگہ سر سبز چنوں کا کھیت تھا۔ میں نے ایک پودا اکھاڑا اور سبز چنے کھانے لگا۔ ساتھ ہی حضرت مفتی صاحبؒ کو بھی دعوت دے دی۔ دعوت کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ تم بھی حرام کھاتے ہو اور مجھے بھی کھلانے کی کوشش کرتے ہو۔ میں نے کہا یہ حرام تو نہیں، تمام لوگ ایسا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ایک ناجائز بات سب لوگوں کے کرنے سے جائز تو نہیں ہو سکتی۔ یوں انہوں نے چنے کھانے سے انکار کر دیا۔" (ترجمان اسلام، ۱۴۴)

نشہ آور دوائی سے اجتناب:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ کا یہ حیرت انگیز کمال بھی علم میں آیا کہ ان کے انگوٹھے کا کئی انچ گہرا آپریشن اس طرح ہوا کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے بے ہوش یا سُن کرنے والی دوا استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اصرار بھی کیا کہ یہ خاصا طویل آپریشن ہے اور سُن کئے بغیر سخت تکلیف ہوگی لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نہ مانے اور بالآخر سُن کئے بغیر ہی یہ آپریشن کیا گیا۔ ان کے خصوصی معالج (غالباً کرنل مرتضٰی صاحب) ایک مرتبہ

میرے سامنے موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مفتی صاحبؒ کی قوت برداشت حیرت انگیز ہے اور میں نے اس سے پہلے ایسا آپریشن کرانے والا نہیں دیکھا۔ احقر نے حضرت مفتی صاحبؒ سے حیرت کے ساتھ اس کی وجہ پوچھی تو شروع میں طرح دے گئے، پھر فرمایا کہ:

"اگرچہ ضرورۃً نشہ آور دوا کا استعمال جائز ہے لیکن میں نے سوچا اس سے جتنا بچ سکوں بچ جاؤں۔"

احقر نے سوچا کہ احتیاط وتقویٰ کا یہ مقام اس دور میں خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ احقر نے اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کا حوالہ دیا کہ انہوں نے سن کرائے بغیر اپنی پوری ٹانگ ران پر سے کٹوائی تھی۔ ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ سرجن کو آپریشن کی اجازت دے کر ذکراللہ میں مشغول ہوگئے تھے۔ اس طرح آپریشن کا پورا وقت گزر گیا اور وہ اطمینان کے ساتھ اپنے ذکر میں محو رہے۔ احقر نے حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ سے عرض کیا کہ کیا آپ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ہنس کر فرمانے لگے نہیں بھائی یہ تو بڑوں کی باتیں ہیں، ہمارا یہ مقام کہاں۔"

(ترجمان اسلام نمبر، ص ۱۷۳)

طوافِ زیارۃ کا اعادہ:

مرشد العلماء حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب مدظلہ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا ایک واقعہ سناتے ہوئے فرمایا:

"غالباً ۷۷، ۷۶ء میں ہم اکٹھے حج پر روانہ ہوئے۔ مکہ میں طواف کے

دوران انہیں پاؤں کے زخم کا احساس نہ ہوا۔ منیٰ میں پہنچ کر انہیں احساس ہوا کہ انگوٹھے کا ناخن اکھڑا ہوا ہے اور انہیں شک گذرا کہ ممکن ہے میرا طواف نہ ہوا ہو۔ لہٰذا ناخن کٹوا کر دوبارہ مکہ تشریف لے گئے اور طوافِ زیارۃ کا اعادہ فرمایا۔" (ترجمان اسلام، ص ۲۴۴)

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت و کردار کے کئی پہلو ہیں جن سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا علمی رسوخ، سیاسی بصیرت، ذوق عبادت، انابت الی اللہ، اتباع سنت، تفقہ فی الدین، جرات و شجاعت، سوزِ دروں، رقت قلب، مثالی استقامت، عدیم المثال تواضع و بے نفسی، اخلاص وللّٰہیت، حکیمانہ طرز عمل، وسعتِ قلبی، دین کی حفاظت اور اشاعت کے سلسلہ میں ان کی مجددانہ کوششیں۔ ان تمام پہلوؤں کی صحیح منظر کشی اور بیان شاید کوئی بھی نہ کر سکے لیکن جو پہلو بیان ہو جائیں ان کا تذکرہ بھی ہم جیسے طالب علموں کے لئے انشاء اللہ فائدہ سے خالی نہیں۔

میری محفل میں آ نہ سکے گی دنیا
لاکھ ڈھونڈے مجھ سا نہ پا سکے گی دنیا

باب : ۵

اخلاص وتحمل، فقر وقناعت
حکمت وتدبیر اور حسن سلوک

علم وفضل، راست گفتاری، اصول پسندی، استغناء، امانت ودیانت، ایمان و یقین، عزم وہمت، فصاحت و بلاغت، شخصیت کی دلآویزی، خلقی وفطری محبوبیت، اسلاف سے بے مثال محبت، حکمت وتدبر، انتظامی مہارت اور خلوص کا ایک دریائے بیکراں۔ ان تمام عناصر کو یکجا کرنے سے جو انسانی تصویر ابھرتی ہے وہ ہے حضرت مفتی محمود مرحوم جیسی شخصیت کی تصویر۔

بندہ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت میں یہ تمام صفات صالحہ موجود تھیں، خصوصاً خلوص کا تو پیکر تھے۔ اخلاص کا یہ انمول وصف ان کی طبیعت ثانیہ بن چکا تھا۔ حضرتؒ مفتی صاحبؒ کے تلامذہ، احباب اور متعلقین نے انہیں اخلاص کے اعلیٰ معیاروں پر پورا

پایا۔ اخلاص و بے غرضی ان کی زندگی کا جوہر اور ان کے تمام اعمال و مساعی اور سرگرمیوں کا محرک تھا۔

شہرت و ریا سے نفرت:

حاجی فقیر محمد خان سابق وفاقی وزیر لکھتے ہیں:

"حضرت مفتی صاحبؒ ریا اور شہرت کے خلاف تھے۔ ایک مرتبہ ہمارے دوست عبدالستار خان بفہ کے ہاں پروگرام بنا۔ عبدالستار خان نے شہر سے کافی دور استقبال کے لئے پروگرام بنایا۔ ان کی یہ خواہش تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو جلوس کی صورت میں گھر تک لے جائیں لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے اعزاز میں نکالے گئے جلوس کو کوئی اہمیت نہ دی اور بعد میں عبدالستار خان سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔"

(ترجمان اسلام، ص ۱۶۴)

بزم محمود نہیں، بزم شیخ الہندؒ:

حضرت مولانا رفیق احمد قریشی صادق آباد والے اپنے دورِ طالب علمی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"حضرت مفتی صاحبؒ اسم با مسمّٰی تھے۔ ان کا ہر کام محمود تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ ہمیں قاسم العلوم ملتان میں بخاری شریف پڑھاتے تھے۔ میں بھی دورہ حدیث شریف کے طلباء میں سے تھا۔ ہمارے چند ساتھیوں کا خیال ہوا کہ ایک بزم بنانی چاہیئے جس کے تحت ہم تقاریر کا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ طلبہ کے اجلاس میں طے ہوا کہ ہم مولانا مفتی محمود کے نام سے "بزم محمود"

بناتے ہیں اور اس کی سرپرستی کے لئے حضرت مفتی صاحبؒ سے درخواست کرتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت مفتی صاحبؒ تشریف لائے تو ہم طلباء آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مقصد بیان کیا۔ حضرت مفتی صاحب نے ہم سے تنظیم کے مقاصد دریافت فرمائے اور مقاصد سے مطمئن ہونے کے بعد آپ نے فرمایا: میں تمہاری اس تنظیم کی سرپرستی تب قبول کرتا ہوں کہ اسے میرے نام محمود سے منسوب نہ کرو۔ ہم نے عرض کی کہ حضرت! ہم آپ کے حکم کے مطابق محمود سے آپ کی ذات مراد نہیں لیتے بلکہ محمود سبکتگین یا شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ مراد لیتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا چونکہ نام رکھتے وقت تمہارے ذہن میں محمود سے مراد میری ذات تھی لہٰذا میں اس ریاکاری کو پسند نہیں کرتا۔ اگر تم اس بزم کا نام "بزم شیخ الہند" رکھو گے تو میں سرپرستی قبول کرتا ہوں ورنہ نہیں۔ ہم نے مجبور ہو کر نام تبدیل کیا تو آپ نے رضامندی کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا: مقصد دین کا کام کرنا ہے، نام ظاہر کرنے سے ریا کا شائبہ آجاتا ہے، اس سے احتراز لازمی ہے۔"

(ترجمان اسلام، ص ۹۸)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرمایا کرتے اخلاص کے ساتھ تھوڑا عمل بھی قبول ہو جاتا ہے اور اگر اخلاص نہ بھی ہو تو خالی الذہن ہو کر بھی عمل مقبول ہو جاتا ہے۔ خالی الذہن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عمل میں نہ دکھاوا [illegible] خدا کے لئے نیت ہو۔ یہ دقت نظر، یہ باریک بینی حضرت تھانوی ہی کا حصہ [illegible]

اور حضرت مفتی صاحبؒ کی پوری زندگی کے مساعی اور تعلیمات [illegible]

مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دینی وعلمی، ملی اور اصلاحی کاموں کے لئے اخلاص وللّٰہیت کو لازمی عنصر قرار دیتے ہیں اور حضرت مفتی صاحبؒ کے ہاں اخلاص و ہمدردی اور تواضع وانکساری کی عملی تصویریں ہر زاویہ نگاہ سے جھلکتی نظر آتی ہیں۔

انکساری وتواضع:

حضرت مفتی صاحبؒ کی سیرت کا نمایاں عنصر بلکہ جوہرِ سیرت ان کی تواضع تھی۔ تواضع ان کی فطرت تھی۔ وہ محدث تھے، مفسر تھے، فقیہ تھے، مجاہد تھے، خطیب تھے، درویش خدامست تھے، قومی اسمبلی کے ممبر تھے، صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ تھے، حزب اختلاف کے قائد و رہنما تھے اور پورے ملک کی عوام کے [illegible] لیڈر ہونے کے باوجود ایسے بے تکلف اور سادہ تھے جیسے مسندِ حدیث کے شیخ الحدیث نہیں، مدرسے کے مہتمم نہیں، مسلمانوں کے قائد و رہنما نہیں، صوبہ سرحد کے حاکم اور فرماں روا نہیں اور قومی اسمبلی کے ممبر نہیں بلکہ ایک عام آدمی ہوں۔

علم، تقویٰ اور فقاہت کے باوجود چھوٹوں پر شفقت کرنا، ہر ایک کی بات کا مسکرا کر جواب دینا اور بڑوں کی عظمت کا خیال رکھنا یہی تو وہ جواہرات ہیں جنہیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے بلکہ ان اخلاقی اوصاف کو اپنانے کا درس دیا ہے ....

تواضع نہ کردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

آئیے! حضرت مفتی صاحبؒ کی سادگی، تواضع اور انکساری کے دلچسپ واقعات سے حظِ وافر حاصل کریں۔

مولوی صاحب! ڈبے سے پیچھے ہٹ جایئے:

۱۹۶۲ء کے الیکشن میں کامیابی کے بعد ملک میں پہلی بار عام لوگوں نے بھی حضرت مفتی صاحبؒ کا نام سنا۔ اس وقت تک جمیعت کے حلقوں سے باہر انہیں بہت کم لوگ جانتے تھے۔ تصویر بھی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے اسلام آباد جانے لگے تو ملتان ریلوے اسٹیشن پر بڑی دلچسپ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ گاڑی میں ان کی سیٹ ریز روتھی لیکن جب ساتھیوں کے ہمراہ ڈبے میں داخل ہونے لگے تو ڈیوٹی پر موجود پولیس کے ایک سپاہی نے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ ڈبہ قومی اسمبلی کے ممبر مولانا مفتی محمود کے لئے ریز رو ہے، آپ یہاں نہیں بیٹھ سکتے، کسی دوسرے ڈبے کا رخ کریں۔ ساتھیوں نے کسی نہ کسی طرح اندر گھس کر ان کا سامان تو ڈبے میں رکھ دیا لیکن سپاہی نے مولانا مفتی محمودؒ کو ڈبے میں نہ گھسنے دیا۔ بار بار یہی کہتا کہ "یہ ڈبہ قومی اسمبلی کے ممبر مولانا مفتی محمود کے لئے ریز رو ہے، یہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا، کسی دوسرے ڈبے میں چلے جایئے، وہ آپ کو یہاں نہیں بیٹھنے دے گا، سامان بھی آپ کو اٹھانا پڑے گا، مجھے ڈانٹ پڑے گی، آپ بھی ناحق پریشان ہوں گے، اس لئے پہلے سے اپنے لئے کسی سیٹ کا بندوبست کرلیں" اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ درمیانے قد اور دہرے جسم کا مالک جس نے سر پر ریشمی رومال لپیٹ رکھا ہے اور کھدر کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس ہے، قومی اسمبلی کا ممبر بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے سوچا کوئی دیہاتی مولوی ہے جو اپنی لاعلمی یا کسی مغالطے کی وجہ سے اس ڈبے

کی طرف چلا آیا ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ سپاہی کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر خاصے محظوظ ہوئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا کہ وہ سپاہی سے ان کے متعلق کچھ نہ کہیں۔ ساتھی بھی سپاہی کا غضب اور غصہ دیکھ کر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ سپاہی کو دوسری طرف متوجہ پا کر جونہی حضرت مفتی صاحبؒ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ڈبے کی طرف بڑھتے، سپاہی تیزی سے آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیتا۔ گاڑی چلنے میں چند منٹ رہ گئے تو حضرت مفتی صاحبؒ نے سوچا اب اس ڈرامے کو ختم کرنا چاہیے۔ وہ آخری بار اپنے ڈبے کی طرف بڑھے۔ سپاہی غصے میں آ گیا۔ چیخ کر بولا: مولوی صاحب! کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔ سمجھتے کیوں نہیں، یہ ڈبہ ریزرو ہے۔ مولانا مفتی محمود کے سوا یہاں اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا، چلو ہٹو پیچھے، اب مفتی صاحب آنے ہی والے ہوں گے، کسی اور ڈبے میں چل کر بیٹھو۔ مولانا مفتی محمودؒ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی چند لمحے خاموش کھڑے اسے دیکھتے رہے، پھر کندھے پر رومال ٹھیک کرتے ہوئے کہا: اللہ کے بندے! دوسرے ڈبے میں چل کر کیسے بیٹھوں، میری سیٹ اس ڈبے میں ریزرو ہے، میں ہی تو مفتی محمود ہوں، قومی اسمبلی کا ممبر۔ یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ سپاہی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ پھر وہ تیزی سے ہٹ کر ایک طرف مؤدب کھڑا ہو گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ کر ڈبے میں داخل ہو گئے۔ (قومی ڈائجسٹ، ص ۳۸)

کس چکر میں پڑ گئے ہو:

" مولانا مفتی محمودؒ وزیر اعلیٰ بن کر پشاور پہنچے تو ان کی رہائش کا مسئلہ پیدا ہو گیا کیونکہ ون یونٹ کے خاتمے کے بعد پہلی مرتبہ صوبوں میں وزارتیں بن رہی تھیں اور چیف منسٹر ہاؤس ابھی خالی نہیں ہوا تھا۔ وہاں کوئی انتظامی دفتر قائم تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی رہائش کے لئے کسی مناسب اور موزون عمارت کی تلاش شروع ہوئی تو نظر انتخاب گیسٹ ہاؤس پر پڑی۔ یہ انگریزوں کے دور کی بنی ہوئی بڑی وسیع اور کشادہ عمارت تھی۔ یہاں کا فرنیچر خاصا پرانا تھا اور زیادہ تر اس زمانے میں خریدا گیا تھا جب یہ عمارت شاہی مہمان خانے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ چیف سیکرٹری نے سوچا نیا وزیر اعلیٰ ہے، اس کے پاس غیر ملکی مہمان بھی آئیں گے، پرانی میز کرسیاں اور بدرنگ صوفے یہاں برے لگیں گے چنانچہ اس نے سارا پرانا فرنیچر اٹھوا کر یہاں نیا فرنیچر سجانے کا پروگرام بنایا۔

وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ سے اس سلسلے میں بات کی تو انہوں نے کوئی دھیان نہ دیا اور دوسری باتوں میں مصروف رہے۔ اس نے دو تین مرتبہ اپنی بات دہرائی تو وزیر اعلیٰ مفتی محمودؒ اکی طرف پلٹے اور عینک کے شیشوں میں سے گھورتے ہوئے متبسم لہجے میں کہا: اللہ کے بندے! کس چکر میں پڑ گئے ہو، یہ فرنیچر ٹھیک ہے، اسے بدلنے کی ضرورت نہیں، میرے اپنے گھر عبدالخیل میں تو کوئی ٹوٹا پھوٹا صوفہ بھی نہیں۔ چیف سیکرٹری حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اسے دوبارہ اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر

بعد خاموشی سے نکل کر باہر چلا گیا۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۴۱)

سرمایہ حیات:

حضرت مفتی صاحبؒ کے ڈرائیور ظہور احمد صاحب اپنے شب و روز کے مشاہدات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں نے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھا ہے، ان کے افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں سے مزین وسیع و عریض کوٹھیاں بھی دیکھی ہیں، ان کے غیر ملکی اور قیمتی لباس پر بھی نظر ڈالی ہے مگر یہ سادہ سے لباس اور سادہ سی معاشرت والا آدمی سب سے زیادہ جچتا تھا، سب میں جچتا تھا۔ اسلامی وزرائے خارجہ کانفرنس ہوئی تو پنڈی جانے کے لئے ملتان سے لاہور کے ایئرپورٹ پر اترے۔ آرام کے لئے جناب غلام دستگیر کی کوٹھی پر گئے۔ میں نے دیکھا چلنے میں پاؤں ذرا گھسیٹتے ہیں۔ اس پاؤں گھسیٹنے کی وجہ یہ تھی کہ جوتا بہت پرانا ہو کر ڈھل گیا تھا۔ میں نے نئے جوتے کے لئے کہا مگر مسکرا کر ٹال دیا۔ عرض کیا کہ آپ اتنی اہم کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں، لوگ کیا کہیں گے؟ فرمایا: میں فقیر آدمی ہوں، مجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے سو گئے۔ میں نے اس دوران ان کا پرانا جوتا اٹھایا اور اس کے ناپ کا نیا جوتا لا دیا۔ دستگیر صاحب نے جوتے کی قیمت دینا چاہی تو میں آبدیدہ ہو گیا کہ وہ مجھے اس سعادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے روئے سخن دستگیر صاحب کی طرف کیا اور فرمایا: "اس کا دل نہ توڑو" وہ پرانا جوتا آج تک میرے پاس محفوظ ہے، اسے میں نے سرمایہ حیات بنا کر رکھا ہوا

ہے۔ بڑے آدمی کی جوتی بھی تو بڑی ہوتی ہے۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۵۷)

چار آنے کی دال اور چند روٹیاں:

حضرت مولانا محمد یوسف قریشی صاحب بیان فرماتے ہیں:

"مولانا مفتی محمود صاحبؒ سے تعلق تو بہت پرانا ہے لیکن اس تعلق میں اضافے کا سبب ایک خاص واقعہ ہے۔ اس سے قبل تعلق و محبت کے باوجود میں ان سے کھلا اور نہ کھلا۔ میں سمجھتا تھا کہ مفتی صاحبؒ بھی دوسرے رہنماؤں کی طرح "ہٹو بچو" کے ایک خاص ماحول میں رہنے والے آدمی ہیں اس لئے ان سے زیادہ قرب مناسب نہیں، لیکن اس واقعے نے ان کی ذات کے بارے میں میرے خدشات وخطرات کو باطل کر دیا اور میں مفتی صاحبؒ سے دور بھاگنے کے بجائے تیزی سے قریب آنے لگا۔ مسجد مہابت خان کے دروازے تو پہلے ہی ان کے لئے کھلے تھے، اب دل کے دروازے بھی وا ہو گئے۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں سرحد کے بزرگ عالم دین اور مفتی مولانا عبدالقیوم پوپلزئی کے ہمراہ مسجد قاسم علی خان میں بیٹھا تھا کہ اچانک مولانا مفتی محمود صاحبؒ آ گئے، ان کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ تھا۔ میں نے اٹھ کر وہ بیگ ان کے ہاتھ سے لیا اور معانقہ کیا لیکن مولانا مفتی عبدالقیوم پوپلزئی نے بیٹھے بیٹھے ہی مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیئے اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ اس وقت اتنے بڑے رہنما نہیں تھے کہ ان کے

استقبال کے لئے لوگوں کا کوئی بڑا ہجوم ہوتا لیکن اتنے چھوٹے بھی ہرگز نہ تھے کہ ان سے بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کر لینا ہی کافی ہوتا۔ میں نے مفتی عبدالقیوم پوپلزئی کی اس سرد مہری کو محسوس تو کیا لیکن وہ مولانا مفتی محمودؒ سے بھی بڑے عالم تھے اس لئے فوری طور پر ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور اندر ہی اندر اس بات پر کڑھتا رہا۔ خاصی دیر گزرنے کے بعد مولانا مفتی محمودؒ کو بھوک لگی تو انہوں نے مجھے اپنی روایتی بے تکلفی سے کہا: علامہ صاحب! کیا بات ہے آج کچھ کھانے پینے کا پروگرام نہیں؟

مشکل یہ تھی کہ میں نے ان کی آمد کی گھر اطلاع نہیں دی تھی کہ ان کے لئے کوئی ڈھنگ کا کھانا تیار ہوتا اور بازار لے چلنا نہیں اس لئے دشوار تھا کہ اس وقت اتفاق سے میری جیب میں صرف دو روپے تھے۔ ہر چند کہ زمانہ سستا تھا اور دو روپے میں انہیں کھانا کھلانا ممکن تھا لیکن وہ کھانا ان کے معیار کا نہ ہوتا۔ میں اس خیال سے اٹھ کر باہر جانے لگا کہ گھر سے کچھ پیسے لے آؤں لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا: ''شاید آپ گھر جانا چاہتے ہیں، اس وقت گھر والوں کو تکلیف دینا مناسب نہیں، کھانا وانا سب کچھ یہیں آ جائے گا۔'' یہ کہہ کر اِدھر اُدھر دیکھا، وہ غالباً کھانا خود منگوانے کے موڈ میں تھے اور یہ بات میرے لئے بڑی باعث شرم ہوتی۔ میں جلدی سے مسجد کے خادم کے پاس گیا اور اسے دو روپے دے کر کہا جو ملتا ہے لے آؤ، پیسے کم ہوں تو بعد میں مجھ سے لے لینا۔ تھوڑی دیر بعد خادم دو روپے میں تین آدمیوں کا کھانا لے کر آ گیا۔ وہ چار آنے کی دال، ڈھیر ساری روٹیاں اور

ساتھ ہی چائے۔ ہم تینوں نے شکم سیر ہوکر کھانا کھایا لیکن مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ مفتی صاحبؒ نے کھانے کی خود فرمائش کی اور ان کو یہ فرمائشی کھانا کھلا دیا گیا لیکن حضرت مفتی صاحبؒ ان باتوں سے بے نیاز ہوکر مزے لے لے کر کھاتے رہے۔

بعد میں جب حضرت مفتی صاحبؒ کو میں نے اپنے گھر جانے کی وجہ بتائی تو وہ ہنس کر کہنے لگے: "اللہ کے بندے! میں تو روزانہ یہی کھانا کھاتا ہوں، آدمی کو وہی خوراک پسند کرنی چاہیئے جو اسے روزانہ میسر ہو" میں نے اس واقعے سے اندازہ لگا لیا کہ ان کی شخصیت داستان حرم کی طرح سادہ اور زمزم کی طرح پاکیزہ وشفاف ہے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۴۸)

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں:

حضرت مفتی صاحبؒ کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مفتی صاحبؒ شہرت اور عزت کی بلندیوں تک پہنچنے کے باوجود کسی پر حکم نہیں چلاتے تھے۔ مخدوم بننے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ دوسروں کی خدمت کو اپنے لئے اعزاز سمجھتے تھے۔ اپنے کام خود کرتے، کوئی ان کی خدمت کرتا تو اس کو روک دیتے اور فرماتے میں تم میں سے کسی سے بلند مرتبہ نہیں، میں تمہارا ساتھی اور دوست ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ مدرسے کی چٹائی سے وزیر اعلیٰ ہاؤس اور قومی اسمبلی کے ایوان تک پہنچے لیکن چال ڈھال، لباس، خوراک، بود وباش اور اندازِ زندگی میں انہوں نے حاکمانہ اور شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے بجائے درویشانہ طرز زندگی کو اختیار کیئے رکھا۔ حتیٰ کہ جب حضرت مفتی صاحبؒ دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کا جنازہ ان کے گھر سے برآمد ہوا تو وہ اک ایسی

چار پائی پہ اٹھایا گیا تھا جو چار پائی اپنی جگہ غربت وعسرت کی تصویر تھی۔ چار پائی کے پائے استعمال ہو ہو کر سیاہ پڑ چکے تھے مگر حضرت مفتی صاحبؒ نے جیسے زندگی کے لمحات میں ظاہر داری کی درستی کو ہمیشہ خلاف شان سمجھا۔ موت کے بعد بھی اس رنگ کو اور نمایاں کر گئے۔ ع اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز:

خطیب پاکستان حضرت مولانا ضیاء الدین القاسمی مرحوم لکھتے ہیں:

" جب حضرت مفتی صاحبؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے تو حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر چھوٹے ملازمین اس طرح گھل مل کر کھانا کھاتے اور بے تکلفی سے بات کرتے جیسے اہل خانہ اکٹھے ہوں۔ ہم دنیاداروں کا ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ کسی تقریب میں شامل ہوں گے تو ان کا ڈرائیور دن بھر بھوکا رہے گا۔ صاحب انٹرکانٹ میں ڈنر یا لنچ میں ہے تو ڈرائیور مکئی کے بھٹے یا بھنے ہوئے چنے لے کر گزارا کرتا ہوا نظر آئے گا۔ کیا مجال ہے کہ بادشاہ سلامت یا صاحب بہادر کی مجلس میں اس کے ڈرائیور کے لئے دو چپاتیوں کا انتظام ہی ہو جائے مگر حضرت مفتی صاحبؒ وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے سب سے زیادہ جس بات کا خیال رکھتے تھے وہ ان کے ساتھ دورے میں جانے والے چھوٹے ملازمین ہوا کرتے تھے۔ میں نے ڈرائیور اور چھوٹے پولیس کے سپاہیوں کو وزیر اعلیٰ کے ساتھ ان کے ہمراہ ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھاتے ہوئے دیکھا۔ وہ خصوصیت سے اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ میرے ہمراہ آنے والے ملازمین کہیں آدابِ شاہی کے چکر میں

فاقے تو نہیں کر رہے۔

میں اکثر دوروں میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ ہوتا تھا۔ سرحد کے اعلیٰ افسر سب مجھ سے بے تکلف ہوتے تھے اور بعض اوقات وہ مجھ سے کھل کر کہا کرتے تھے کہ آپ حضرت مفتی صاحب سے عرض کریں کہ چھوٹے ملازموں کو ساتھ بٹھانے سے حکومت کا دبدبہ اور شوکت برقرار نہیں رہتی۔ براہِ کرم ان چھوٹے ملازمین کا علیحدہ انتظام کرا دیں۔ ایک ہی دستر خوان پر اپنے ہمراہ بٹھانا اچھا نہیں ہوتا۔

میں کسی وقت افسر شاہی کی بات حضرت مفتی صاحبؒ کے سامنے عرض کرتا تو فرماتے میرا بھی یہی مقصد ہے کہ ان افسروں میں انگریز نے جو تکبر اور غرور کا رنگ بھر دیا ہے اسے مٹایا جائے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اسلامی اقدار کا عملی نمونہ یہی ہے۔ روایاتِ سلف اسی کا تقاضا کرتی ہیں۔ حضرات خلفائے راشدین کے دور میں یہی ہوتا تھا، مجھے فخر ہے کہ میں حضرات خلفائے راشدین کے نقش قدم پر ہوں اور مجھے اسی میں سرور اور لذت حاصل ہوتی ہے کہ ایک فقیر بادشاہ کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہو اور بادشاہ بے بسی کے عالم میں دانت پیستا رہ جائے!

قابل اعتماد سیکرٹری کون؟

یہ واقعہ آپ کی زندگی میں میرے لئے ایک ناقابلِ فراموش واقعہ کی

حیثیت رکھتا ہے کہ آپ کا ڈرائیور ایک مرتبہ سفر میں آپ کو عوامی مشکلات اور مسائل کی طرف توجہ دلانے لگا تو آپ نہایت توجہ سے اس کی باتوں کو سنتے رہے اور ساتھ ساتھ فرماتے رہے کہ آپ کی رائے صحیح ہے۔ میں ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنی کابینہ کے وزیروں کو ہدایات جاری کردوں گا۔ آپ کے سیکرٹری نے ڈرائیور کی اس حوصلہ افزائی کو برا منایا اور وزیراعلیٰ کی غیر موجودگی میں اس کو ڈانٹا اور سختی سے کہا کہ آئندہ اس طرح کی باتیں حضرت مفتی صاحب سے نہ کرنا کیونکہ یہ پروٹوکول کے خلاف ہے۔ واپسی پر ڈرائیور خاموش رہا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس سے پوچھا بھئی کوئی اور تجویز ہو تو بتاؤ مگر وہ بیچارہ سیکرٹری کے خوف سے چپ رہا اور قوت گویائی یوں سلب ہو گئی جیسے تھی ہی نہیں۔ میری نشاندہی سے حضرت مفتی صاحبؒ نے سیکرٹری کو اس قدر ڈانٹا کہ وہ دم بخود ہو گیا۔ اس پر حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک سب سے قابل اعتماد اور محبوب وہ ہو گا جو مجھ سے براہِ راست عوام کے مسائل رکھے گا۔ اس کے لئے سیکرٹری اور ضوابط حائل نہیں ہو سکتے۔"

(ترجمان اسلام، ص ۱۲۱)

حکومتِ سعودی کے مہمان:

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے رئیس ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر لکھتے ہیں:

"ان کی تواضع کا یہ حال تھا کہ جب وہ سرحد کے وزیراعلیٰ تھے حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں سعودی گورنمنٹ کے مہمان تھے تو منیٰ میں وہاں پر

سلومت کے مہمان خانے میں ان کا قیام تھا۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری بھی اس سال وہاں موجود تھے اور ایک مکان میں انہوں نے ایک جگہ لی ہوئی تھی تو انہوں نے مجھے حکم دیا کہ جا کر مہمان خانے میں حضرت مفتی صاحبؒ سے ملوں اور ان سے یہ کہوں کہ میں ملنے کے لئے آنا چاہتا ہوں۔ میں چلا گیا اور ان سے ملاقات ہوئی۔ فرمایا: مولانا کیوں آئیں، میں خود جاؤں گا۔ ایک طرف تو وزیر اعلیٰ ہیں اور بلند علمی مقام پر بھی فائز ہیں، وہ عالم جو جانتا ہے کہ (**انما یعرف ذوالفضل من الناس ذووہ**) اب ان کو یہ بتانا کہ حضرت بنوریؒ کون ہیں اور ان کا علمی مقام کیا ہے۔ فرمایا: نہیں، میں جاؤں گا وہ نہیں آئیں گے اور مجھے کہا کہ آپ بیٹھیں میں تیار ہوتا ہوں۔ خیر میں بیٹھا رہا، تیار ہو کر فرمایا چلو چلتے ہیں۔ نہ ان کے ساتھ کوئی پولیس والا ہے، نہ کوئی گارڈ ہے۔ اپنے ایک خادم کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے مولانا کی خدمت میں خود پہنچ گئے۔ وہاں علماء بیٹھے ہوئے ہیں اور دستر خوان بچھا ہوا ہے اور طرح طرح کے پھل اور دوسری چیزیں موجود ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ ہنس کے فرمانے لگے ہماری مہمانی ایسے برائے نام ہی ہے۔ ابھی یہ مولوی صاحب (خود ڈاکٹر صاحب مراد ہیں) میرے پاس آئے تھے، پینے کے لئے صرف بوتل پیش کی گئی، یہاں دیکھو اللہ کی ساری نعمتیں موجود ہیں۔ بادشاہ تو یہ لوگ ہیں۔ پھر ان کی گفتگو ہوئی جو علماء کی گفتگو ہوتی ہے۔ کافی دیر کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ پھر وہاں سے تشریف لے گئے۔"

(مفتی محمود ایک قومی رہنما، ص ۲۲۴)

قرون اولیٰ کی سادگی:

نائب صدر دار العلوم کراچی اور ماہنامہ "البلاغ" کے مدیر اعلیٰ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ رقم طراز ہیں:

" ایک بات یہ بھی ہے کہ علماءِ کرام سادہ زندگی ہی گزارتے ہیں مگر انسانی فطرت ہے کہ جب انسان مناصب اور عہدے کی بلندی پر پہنچ جائے تو اس کی شخصیت میں خود بخود تبدیلی آجاتی ہے اور اس کی وضع قطع ان مناصب کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے مگر حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا کمال یہ تھا کہ باوجود بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور آپ کا وہی لمبا کرتہ اور شلوار اور سر پر ایک رومال جو کہ آپ قاسم العلوم کے ایک عام مدرس کی حیثیت سے زیبِ تن فرمایا کرتے تھے۔ ان تمام مناصب میں بھی لباس وہی رہا۔ نظریاتی کونسل کے رکن کی حیثیت سے مجھے ایک مرتبہ پشاور کسی سرکاری کام سے جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے قیام کا انتظام فرنٹیر ہاؤس میں (جو کہ پشاور کا مہمان خانہ ہے) کیا گیا تھا۔ اتفاق سے مجھے جو ملازم ملا وہ وہی تھا جو کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی خدمت پر متعین ہوتا تھا۔ جب آپ ابتدا میں فرنٹیر ہاؤس میں ٹھہرے تھے، میری اس سے بات چیت ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس تو بڑے بڑے مہمان آتے ہوں گے اور مفتی صاحب بھی مہمان بن کر آئے تھے، تم نے مولانا مفتی محمود کو کیسا پایا؟ اس نے جواب میں کہا کہ میں نے بڑے بڑے لوگوں کی خدمت کی ہے اور میرے اس مہمان خانے میں بڑے بڑے وزیر بھی آئے ہیں مگر جو

چیز مولانا مفتی محمود میں تھی وہ نہ کسی میں دیکھی اور نہ آئندہ دیکھنے کی امید ہے۔ مولانا مفتی محمود واقعی درویش تھے اور ایسا درویش وزیر اعلیٰ دوبارہ نہیں آسکتا، ان میں قرون اولیٰ والی سادگی تھی۔" (قومی ڈائجسٹ ص ۲۵)

تاریخ کے ابواب کا عنوان:

روزنامہ سیادت بہاولپور کے سعید احمد صاحب اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

" مجھے سیاسی رہنماؤں سے ملنے اور ان کی تقاریر سننے کا لڑکپن سے شوق رہا ہے۔ سکول اور کالج کے دور میں بہاول پور میں شاید ہی کوئی ایسا جلسہ ہو جس میں، میں نہ گیا ہوں۔ اس دوران متعدد بار مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی تقاریر بھی سنیں مگر ان سے ملاقات اور گفتگو کا شرف صرف ایک بار حاصل ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک میں بعض اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آ رہا تھا اور قومی اتحاد مرکز میں شریکِ اقتدار تھا۔ انہی دنوں قومی اتحاد کے رہنماؤں نے بہاول پور کا دورہ کیا۔ اس موقع پر جامع مسجد "الصادق" بہاولپور میں 10 مارچ ۱۹۷۹ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا۔ یہ غالباً بہاولپور میں مولانا مفتی محمود کی آخری تشریف آوری تھی۔ اگرچہ ان کا قیام نہایت ہی مختصر تھا تاہم انہوں نے کمالِ شفقت سے مجھے ملاقات کے لئے وقت مرحمت فرمایا اور میرے بعض سوالوں کے جواب دیے۔ ان سے گفتگو کے وقت میرے ذہن میں ایوب خان کی قومی اسمبلی سے لے کر بھٹو سے مذاکرات کے آخری دور تک کے بہت سے واقعات ابھرنے لگے۔ میں اس شخص کے سامنے بیٹھا تھا جس کا ہر قدم

تاریخ کے ابواب کا عنوان تھا۔ یہ وہ بوریا نشین تھا جس کی للکار اقتدار کے ایوانوں میں لرزہ پیدا کردیتی تھی۔ یہ وہ رہنما تھا جو قوم کے دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ یہ وہ مسجد کا مولوی تھا جس کے سامنے بہت بڑا آمر اپنے تمام تر ہتھکنڈوں کے باوجود بھی نہ ٹھہر سکا تھا۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۲۴۶)

میرے گھر سے یہ سامان نکلا:

یہ بوریا نشین اور مسجد کا مولوی جب اقتدار کو ٹھوکر مار کر اقتدار کے ایوانوں سے باہر آیا تو وہ منظر بڑا عجیب تھا۔ احقر کے خاندانی بزرگ جناب شاہ جہاں خان مرحوم جنہیں کئی بڑے بڑے حکمرانوں، گورنروں اور وزیروں کے ساتھ پرسنل سیکرٹری کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے چیف سیکرٹری تھے، وہی راوی ہیں:

" جب حضرت مفتی صاحبؒ نے صوبہ سرحد کی وزارت علیا سے استعفیٰ دیا تو مجھے فرمایا کہ شاہ جہان خان! میرے گھر کے سامان، ضروریات اور اہل و عیال کے لئے سواری کا انتظام کردو تاکہ بہ آسانی اپنے گھر ڈیرہ اسماعیل خان منتقل ہوسکیں۔

محترم جناب شاہ جہان خان مرحوم فرماتے ہیں کہ میں نے فوراً پانچ ٹرک اور تین چار ویگنوں کا انتظام کردیا، آخر جب سرحد کے وزیر اعلیٰ نے منتقل ہونا تھا تو یہ اندازہ بھی میرے سابقہ حکمرانوں کے تجربات کی روشنی میں بہت کم تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو اطلاع دی، آپ تشریف لائے تو مسکرادیے اور فرمایا کہ یہ کیا کچھ ہے؟ جب سامان نکالا تو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے گھر کا سارا سامان وزارت علیا کے اختتام کے وقت ایک چھوٹی سی ویگن میں سما گیا۔

بیوی بچے اور اہل وعیال اور خاندان کے تمام افراد بھی اس میں سما گئے پھر بھی ویگن خالی نظر آتی تھی۔"

کیا مادیت کے اس دور میں کوئی سادگی کی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے۔ جب دولت ہی عزت کا معیار اور پیمانہ ٹھہرے اور ہر شخص قومی دولت کو شیر مادر سمجھے تو اس دور میں بھی ایک شخص وزارت علیا سے مستعفی ہوا اس حال میں کہ فقر و درویشی کی زندہ تصویر نظر آئے۔ اس پرفتن دور میں اگر یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

تحمل، حلم اور بردباری:

تواضع و انکساری، متانت وسنجیدگی اور تحمل و بردباری یہ تمام اوصاف حسنہ حضرت مفتی صاحبؒ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ تحمل اور بردباری اور حلم اتنا تھا کہ بڑے سے بڑا مخالف آدمی آجاتا اور آپ سے بات کرتا تو آپ تحمل اور حوصلے سے اس کی بات سنتے اور جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو آپ پھر اس کو مطمئن کرتے۔ شدید ترین اختلافات میں بھی آپ نرم سے نرم الفاظ اختیار کرتے اور راہِ اعتدال پر قائم رہنے کی پوری کوشش فرماتے۔

ذاتیات میں بالکل نہیں پڑتے تھے۔ الیکشن کے موقع پر "محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے" کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے مخالف سیاسی جماعتیں اور افراد آپ کی ذات و کردار پر تیز و تند حملے کرتے مگر آپ نے ہمیشہ ﴿ادفع بالتی ھی احسن﴾ کا نقشہ پیش کیا۔

وزیر اعلیٰ گھاس کے فرش پر بیٹھ کر سرکاری کام نمٹاتے رہے:

شیخ الحدیث حضرت مولانا فیض احمد صاحب ملتانی تحریر فرماتے ہیں:

"میں ملتان سے پشاور گیا۔ نماز عصر کے بعد آپ کی قیام گاہ پر پہنچا جو درمیانے درجہ کا سرکاری مکان تھا۔ اس کے بیرونی دروازہ پر عوام کا ایک ہجوم تھا۔ اچھی خاصی تعداد میں ایک طرف مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف چند برقعہ پوش خواتین بیٹھی تھیں۔ چند منٹ بعد حضرت مفتی صاحبؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری تشریف لائے جو نہایت خوش مزاج، ملنسار، متشرع، سفید ریش، نیک سیرت انسان تھے۔ انہوں نے آتے ہی از خود سلام مسنون کہا اور ہر ایک مرد سے مصافحہ کیا۔ پہلے مردوں سے پھر عورتوں سے درخواستیں وصول کیں اور کہا حضرت مفتی صاحب کسی پروگرام میں تشریف لے گئے ہیں، نماز مغرب کے بعد آپ سے ملاقات ہوگی اور درخواستوں پر مناسب کارروائی ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد حضرت مفتی صاحبؒ کے عزیز مولانا احمد صاحب مجھے مہمان خانہ میں لے گئے۔ اس دوران میں نے حضرت مفتی صاحبؒ کے چھوٹے بچوں کو دیکھا اور وہ اس معمولی لباس میں کھیل رہے تھے جس طرح مدرسہ قاسم العلوم میں کھیلا کرتے تھے۔

کچھ دیر بعد حضرت مفتی صاحبؒ پروگرام سے واپس تشریف لائے۔ معانقہ ومصافحہ ہوا۔ حسبِ معمول حضرت والا نے خیریت دریافت فرمائی۔ اب مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا، گھاس کے میدان میں ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ اذان ہوئی، آپ نے امامت کے فرائض سرانجام دیے۔ تمام حاضرین مجلس نے جماعت سے نماز ادا کی۔ اس کے بعد مغرب سے عشاء تک تقریباً دو گھنٹے گھاس کے فرش پر بیٹھ کر حضرت مفتی صاحبؒ نے تمام

درخواستوں کو چیک کیا اور ان پر مناسب کارروائی کا حکم دیا۔ کارروائی کے دوران عوام وخواص درخواست گذار وزیر اعلیٰ کے اردگرد اسی طرح بیٹھے تھے جس طرح مدرسہ قاسم العلوم میں طالب علم یا عوام آپ کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ بعض اوقات درخواست گذاروں کا لہجہ تند وتیز ہو جاتا تھا لیکن آپ نہایت تحمل و بردباری سے بات سنتے رہتے۔" (ترجمان اسلام، ص ۶۹)

دلچسپ صورت حال:

جب حضرت مفتی صاحبؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے ان دنوں ارباب سکندر خان خلیل صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔ وہ فرماتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ کے دور وزارت میں چیف منسٹر ہاؤس میں ہر وقت ملاقاتیوں کا میلہ لگا رہتا۔ گھر کے سارے کمرے اور وسیع وعریض لان ان لوگوں سے بھرے رہتے۔ لوگ دور دراز کے علاقوں سے چل کر مفتی صاحبؒ کے پاس آتے اور ان سے سفارش کرواتے۔ اکثر اوقات ان کی شکایتیں اور مسائل بڑی معمولی اور عام نوعیت کی ہوتیں لیکن مفتی صاحبؒ نے کبھی برا نہیں منایا، نہ کبھی کسی ملاقاتی کو ڈانٹا یا جھڑکا۔ ہر ایک کی پوری کتھا بڑے صبر اور تحمل سے سنتے۔ ایک بار بڑی دلچسپ صورت حال دیکھنے میں آئی۔ میں مفتی صاحبؒ کے پاس بیٹھا تھا، مفتی صاحبؒ ذیابیطس کے چونکہ مریض تھے اس لئے انہیں بار بار پیشاب کی حاجت محسوس ہوتی۔ ایک مرتبہ جو بیت الخلا جانے کے لئے اٹھے تو ملاقاتیوں میں سے ایک آدمی تیزی سے آگے بڑھا اور بیت الخلا کے دروازے میں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اب

مفتی صاحبؒ کھڑے شور مچا رہے ہیں ہٹو! راستے سے اللہ کے بندے! مجھے پیشاب کرنے دو اور وہ آدمی ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بار بار ایک کاغذ ان کے چہرے کے سامنے لہراتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں پہلے اس کاغذ پر دستخط کیجئے، پھر آپ کو پیشاب کرنے دوں گا۔ اسے شاید کسی کام کے سلسلے میں مفتی صاحبؒ سے سفارش کرانی مقصود تھی اور اس نے اس کے لئے یہ سنہری موقع ڈھونڈا تھا۔ مفتی صاحبؒ یقین دلاتے ہیں، پیشاب سے فارغ ہو کر دستخط کر دوں گا لیکن اس کی ضد تھی کہ نہیں پہلے دستخط ہوں گے پھر آپ پیشاب کریں گے۔ جب یہ تکرار کسی طرح ختم ہونے میں نہ آئی تو میں آگے بڑھا اور اس آدمی کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف کرتے ہوئے بولا ہٹو پیچھے، مفتی صاحب کو پیشاب تو کر لینے دو۔ لاؤ کاغذ، ان کی جگہ میں دستخط کیئے دیتا ہوں، خدارا! تم راستہ چھوڑ دو۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۰۵)

میں نے سرحد کے وزیر اعلیٰ کو خوب ڈانٹا:

قاری عبدالعزیز جلالی (راولپنڈی) اپنے جلال کی داستان بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" میں وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود کے کمرے میں پہنچا تو رات کا ایک بجا تھا۔ اس وقت سرحد کے وزیر اعلیٰ کی آنکھیں سرخ، بال بکھرے ہوئے اور چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ کاغذوں کے انبار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے انداز و اطوار سے سخت غصے اور اضطراب اور اندرونی کرب کا اظہار ہو رہا تھا لیکن میں ان سے کہیں زیادہ غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا تھا۔ مجھے آخر غصہ کیوں نہ

آتے۔ میں نے صرف تین روز پہلے راولپنڈی میں ان سے ملاقات کا باقاعدہ وقت لیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا دو روز چھوڑ کر تیسرے روز صبح نو بجے آجانا۔ میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا لیکن ملاقات کے لئے پندرہ گھنٹے کا طویل اور جان لیوا انتظار، صبح آ کر بیٹھا، دوپہر ہوئی، شام ہوئی، رات آ گئی اور اب رات کے پچھلے پہر میں ان کے آدمیوں کو زبردستی دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔ وہاں اس وقت بھی ہجوم تھا۔ میں اپنے علاقے کے ظالم خوانین کے مظالم کی داستانیں لے کر آیا تھا لیکن اس وقت وزیراعلیٰ ہاؤس میں جو ہجوم تھا اس میں خوانین کے دو تین تنخواہ دار ملازم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گویا مفتی صاحبؒ کا انہوں نے پہلے ہی گھیراؤ کر رکھا تھا۔

مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "کہئے جلالی صاحب!" یہ سننا تھا کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے اتنی زور سے بات شروع کی کہ باہر کھڑے لوگ بھی ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اندر آ گئے۔ میں نے کہا: آپ نے مجھے صبح نو بجے کا وقت دیا تھا۔ اب رات کا ڈیڑھ بج چکا ہے۔ آپ کی حالت یہ ہے کہ آنکھوں میں نیند، چہرے پر اضطراب، میں آپ سے کیا کہوں۔ آپ کے کارندے شریف لوگوں کو اندر نہیں آنے دیتے۔ آپ شریف لوگوں کو وقت دیتے اور پھر اسی وقت میں کسی اور سے ملتے ہیں۔ میں جن لوگوں کے ظلم کی داستان سنانے آیا ہوں وہ آپ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کو ظالم مظلوم کا فرق ہی معلوم نہیں۔ مومن اپنی فراست ایمانی سے جان لیتا ہے اور معلوم ہوتا ہے آپ نے اب تک عشاء کی نماز بھی ادا نہیں کی ہوگی اس لئے

آپ اپنی ایمانی فراست سے معلوم نہیں کر سکتے کہ آپ کے پاس وہ لوگ بیٹھے ہیں جو آستینوں میں سانپ اور ڈاب میں خنجر رکھتے ہیں، جن کے ہاتھ غریبوں کے خون سے رنگین ہیں۔ آپ فرماتے ہیں میں بات کروں، میں کیا بات کروں، یہ کوئی بات کرنے کا وقت ہے؟ میں جا رہا ہوں، قیامت کے روز اس شخص کا گریبان پکڑ کر خدا کے روبرو بات کروں گا جو صبح سے شام تک لوگوں کو دروازے پر بٹھائے رکھتا تھا۔ یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا اور آناً فاناً باہر نکل گیا۔

سننا بھی مردانگی ہے:

باہر آتے ہی وہاں موجود لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ سرکاری ملازمین بھی میری طرف بڑھنے لگے۔ معاً میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کسی نے مجھے پیچھے موڑنے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا کہ یہ خود حضرت مفتی صاحبؒ تھے۔ فرمانے لگے: "صرف سنانا ہی مردانگی نہیں، سنا کر سننا بھی مردانگی ہے، میں نے ابھی جواب ہی نہیں دیا کہ آپ چل دیئے" غصہ تو میں پہلے ہی نکال چکا تھا، اب جو مفتی صاحبؒ نے مجھے باہر آ کر خود روکا تو رہا سہا غصہ بھی جاتا رہا۔ بہرحال میں ان کے کہنے پر دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "قاری صاحب! آپ نے بہت کچھ کہا ہے، آپ کی بہت سی باتوں کا میں جواب دینا چاہتا ہوں۔ میں اگر اس وقت آپ کو واپس نہ لاتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ آپ میرے بیٹے ہیں، بیٹے ناراض ہوتے ہیں، پھر خود ہی گھر واپس آ جاتے ہیں۔ آج آپ جاتے تو کل پھر واپس آتے۔ میں نے

اس لئے آپ کو روکا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے آپ کی باتوں کا جواب دوں جن کا میں نوکر ہوں۔"

میں نوکر ہوں:

"نوکر ہیں؟ آپ نوکر ہیں، کیا مطلب؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ "جی ہاں! میں نوکر ہوں۔ یہ لوگ جو یہاں موجود ہیں، میں ان کا وزیر اعلیٰ ہوں، وزیر اعلیٰ نوکر ہی ہوتا ہے۔ آپ کو شکایت ہے کہ میں نے آپ کو صبح نو بجے کا وقت دیا تھا۔ میں آٹھ بجے آیا ہوں۔ مجھے آپ کی آمد کی اطلاع نہیں ملی۔" میں نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جو میری چٹ لے کر اندر آیا تھا، اس نے شرم سے سر جھکا لیا۔ اس نے مفتی صاحبؒ تک میری آمد کی اطلاع نہیں پہنچائی تھی۔ مفتی صاحبؒ کے پوچھنے پر اس نے اقرار کیا کہ میں وہ چٹ نہیں پہنچا سکا کیونکہ وہ اس سے گم ہوگئی تھی۔ میں نے بتایا کہ میں نے دوسری بار بھی اسے اپنا نام لکھ کر دیا تھا۔ اب وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ مفتی صاحبؒ نے حکم دیا کہ وہ فوراً وہاں سے چلا جائے اور کل سے اس کی ڈیوٹی یہاں نہیں ہوگی۔

فراست کا شرعی حکم:

پھر مفتی صاحبؒ نے مزید کہا: "آپ کا یہ فرمان تو درست ثابت نہیں ہوا کہ میں شریف لوگوں کو وقت دے کر دوسرے لوگوں سے ملتا ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر بھی اپنے آپ کو شریف اور دوسرے لوگوں کو "بدمعاش" تصور کرنا کوئی شریفانہ سوچ نہیں۔ یہ لوگ گواہ ہیں کہ میں نے عشاء کی نماز یہیں ادا کی

ہے۔ آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ میں نے ابھی تک نماز ادا نہیں کی۔ جہاں تک ایمانی فراست کی بات ہے تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں بہت گنہگار آدمی ہوں۔ اگر بفرض محال میری جگہ کوئی اور آدمی یہاں بیٹھا ہو اور وہ آپ کی طرح صاحبِ فراست بزرگ ہو، وہ اپنی فراست سے کسی کے بارے میں معلوم بھی کر لے کہ فلاں ظالم ہے، اس نے آپ کے ساتھ ظلم کیا ہے تو وہ اپنی فراست کو بنیاد بنا کر اسے سزا نہیں دے گا۔ اس کو سزا دلوانے کے لئے آپ کو دلائل سے اس کا ظالم ہونا ثابت کرنا ہوگا۔ جب تک آپ اس کو برسر عام ظالم ثابت نہیں کر دیں گے اس پر سزا جاری نہیں ہوسکتی۔ یہ مسئلہ تو ابتدائی دینی کتابیں پڑھنے والے طالب علم بھی جانتے ہیں۔

میرا گریبان حاضر ہے:

آپ تو ماشاء اللہ قاری ہیں، عالم ہیں، آپ کی اس مسئلے کے بارے میں اتنی ناقص اور ادھوری معلومات ہیں۔ اگر آپ صوبہ سرحد میں کسی سرکاری محکمے کے ملازم ہوتے اور آپ کے ذمے دینی امور ہوتے تو میں آپ کو اسی وقت اس ذمہ داری سے معزول کر دیتا کیونکہ آپ کی دینی معلومات ناکافی ہیں...... اور آپ کی آخری بات کہ آپ قیامت کے روز میرا گریبان پکڑیں گے، اتنی دیر انتظار کی ضرورت نہیں، یہ لیجئے میرا گریبان حاضر ہے۔" یہ کہہ کر وہ میرے کچھ اور قریب آ گئے۔

مفتی صاحب آبدیدہ ہو گئے:

میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے غصے میں اتنا کچھ کہہ دیا تھا

کہ اب مجھے خود بھی یاد نہیں تھا لیکن حضرت مفتی صاحبؒ کے چہرے پر اب بھی ناگواری کے اثرات نہیں تھے۔ وہ معمول کے مطابق دھیمے انداز میں تمام باتیں کررہے تھے اور میں زمین میں گڑا جارہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا:

"مفتی صاحب! خدا کے لئے مجھے مزید شرمندہ نہ کیجئے۔ آخر میں بھی انسان ہوں، کئی گھنٹے کے انتظار کے بعد غصہ آنا قدرتی بات ہے اور غصے کا اظہار بھی تو اسی لئے ہو گیا ہے کہ ہم آپ کو اپنا سربراہ ہی نہیں، باپ بھی سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ اس کی ملاقات کے لئے اتنا انتظار ہوتا اور نہ اس سے شکوہ وشکایت کرنے کی گنجائش ہوتی، یہ شکوے اور شکایات بھی ہماری آپ سے دلی محبت کی دلیل ہیں۔"

میری بات سن کر حضرت مفتی صاحبؒ آبدیدہ ہو گئے اور پھر ارشاد فرمایا:

"قاری صاحب! یہ دنیا کیا ہے، کچھ بھی نہیں، لوگ اس کی طرف پاگلوں کی طرح بھاگتے ہیں، جب کوئی مولوی میرے پاس دنیاوی کام لے کر آتا ہے تو میرا دل چاہتا ہے میں اسے اپنے ہاتھ سے مسل دوں۔ یہ دنیا کی لعنت دنیا والوں کے لئے ہی رہنے دیں تو اچھا ہے اور جب کوئی مولوی لوگوں کے مسائل لے کر آتا ہے تو مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ علاقائی مسائل لے کر آئے ہیں تو مجھے خوشی ہے، فرمایئے میں ابھی سنوں گا اور میرے بس میں جو کچھ ہوا وہ ضرور کروں گا۔ میں قیامت کے دن سے ڈرتا ہوں، وہاں کی باز پرس میں کون کامیاب ہو سکتا ہے؟ کوئی نہیں، اللہ اپنا کرم کردے تو خیر! ورنہ ہمارے پاس کیا ہے جو لے کر جائیں گے؟"

زندگی کی کیا ضمانت ہے:

میں نے لاکھ چاہا کہ صبح بات کی جائے لیکن حضرت مفتی صاحب ؒ کا کہنا تھا کہ صبح تک زندگی کی کیا ضمانت ہے؟ میں کم از کم آج کی بات آج ہی سنوں گا اور اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو گا وہ ہو گا۔ بہر حال میں نے انہیں اپنے مسائل سے آگاہ کیا۔ رات کٹ گئی۔ صبح تک باتوں میں مشغول رہے۔ ہمارے مسائل جو ان کے دائرہ کار میں تھے وہ اس حد تک تو درست ہوئے کہ مقامی انتظامیہ سیدھے منہ بات کرنے لگی لیکن ایک بگڑے ہوئے ڈھانچہ کو راتوں رات ٹھیک کرنا تو حضرت مفتی صاحب ؒ کے بس کی بات نہیں تھی۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۱۷۰)

جب حضرت مفتی صاحب ؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے ان دنوں ڈیرہ اسماعیل خان کی گومل یونیورسٹی کا مسئلہ شروع تھا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ بنوں میں یونیورسٹی قائم ہونی چاہیئے اور بعض کا خیال تھا کہ یونیورسٹی کا قیام ڈیرہ اسماعیل خان شہر میں ہو۔ تو امیر نواز خان ایڈووکیٹ نے جو اِس وقت جمعیت علماء اسلام کے رہنماؤں میں سے ہیں، اس وقت پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ لانگ مارچ کا پروگرام بنایا۔ اپنے لانگ مارچ کی روداد بیان کرتے ہوئے امیر نواز خان حضرت مفتی صاحب ؒ کے تحمل اور بردباری کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کون گورنر ہے؟ کون وزیر اعلیٰ؟:

" ۱۸/ ستمبر ۱۹۷۲ء کو بعد دوپہر لانگ مارچ کرتے ہوئے ہم گورنر ہاؤس پہنچے۔ چند منٹ گورنر ہاؤس کے مین گیٹ پر انتظار کیا اور پھر گورنر ہاؤس میں

داخل ہوئے۔ لان میں جناب ارباب سکندر خان خلیل اور حضرت مولانا مفتی محمود مرحوم لانگ مارچرز سے مصافحہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ گورنر ہاؤس میں نہتے، گنے چنے شہری بغیر وقت مقرر کئے داخل ہوں اور داخلہ بھی احتجاجی انداز میں ہو۔ ہم متواتر بارہ دن پیدل مارچ کرتے ہوئے لکی مروت سے پشاور پہنچے اور قسم قسم کے الزامات حکومت پر لگائے، تنقیدیں کیں، ہر مقام پر راستے میں جلسوں کا اہتمام کیا۔ مگر ہمیں جلسہ کرنے سے روکا گیا نہ لاؤڈ سپیکر کے استعمال سے، نہ جلوس پر پابندی تھی نہ احتجاجی مارچ پر، نہ اخبارات پر پابندی تھی اور نہ ہمارے استقبال پر۔ ہمیں یہ محسوس تک بھی نہیں ہوا کہ بیابانوں میں کھلے آسمان تلے ہم راتیں گزار رہے ہیں۔ آجکل پولیس سے جان کی پناہ، اگر ان کو تھوڑا سا اشارہ کیا جاتا تو ہمارے راستے مسدود ہو جاتے اور ہمارا قافلہ ناکام واپس ہوتا مگر یہ جمہوریت کا تقاضا تھا جس نے حکومت کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ اسی تقاضے نے ہمارے راستے کھلے چھوڑ دیئے تھے اور ہم بغیر کسی خوف وہراس کے اپنی منزل تک پہنچے۔ جب گورنر ہاؤس میں ہم ان سے ملے تو ہمارے اور ان کے درمیان کوئی صاحب اور ماتحت کا فرق نہیں تھا۔ جس کھلے آسمان کے نیچے ہم کھڑے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے گفتگو میں محو رہے۔ ہماری گفتگو بالکل آزادانہ ماحول میں ہو رہی تھی، کوئی بھی یہ فرق نہیں کر سکتا تھا کہ کون گورنر ہے تو کون وزیر اعلیٰ۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے مصافحہ کرنے کے فوراً بعد مجھ سے مخاطب ہو کر

کہا: "امیر نواز خان! تم نے شیر پاؤ اور اظہر خان کے زمانہ میں لانگ مارچ کیوں نہیں کیا۔ میں خود بھی جنوبی اضلاع سے تعلق رکھتا ہوں، مجھے ان کی تکالیف کا احساس ہے۔ ہم سے جو ممکن ہو سکے گا ہم کریں گے۔"

حضرت مفتی صاحبؒ نے مزید کہا: "آپ دو چار ساتھیوں کا انتخاب کر لیں تا کہ ہم آرام سے بیٹھ کر ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں۔" لہٰذا ان کی تجویز پر عمل کیا گیا اور اس طرح دو تین گھنٹے میز کے گرد بیٹھ کر تفصیلی بات چیت ہوئی۔ ہمارے مطالبات کو تسلیم کیا گیا اور ان پر عمل بھی شروع ہوا۔ آج جو جنوبی اضلاع میں پینے کے پانی کا جال بچھا ہوا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ سے میری یہ پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ میں ان کے طرز بیان اور طرزِ استدلال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اگر چہ اس وقت میں پیپلز پارٹی کا سرگرم رکن تھا لیکن بالآخر پیپلز پارٹی چھوڑ کر جمعیت علمائے اسلام میں شامل ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو مجھ سے محبت تھی۔ مجھے بھی ان کی صحبت میں لذت محسوس ہوتی تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے آخری ایام میں میں ان کے دوروں میں ہم سفر رہا۔" (ترجمان اسلام، ص ۳۸۱)

تحمل وبردباری:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: پہلوان وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ بہادر وہ ہے کہ غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے اور اپنے نفس کو مغلوب کر دے۔

سورہ آل عمران میں اللہ رب العالمین نے متقی لوگوں کی صفات وعلامات میں

ایک نشانی یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ اپنے غصے کو ضبط کرنے والے ہوتے ہیں اور لوگوں کی غلطیوں پر انہیں معاف کرنے والے ہوتے ہیں۔

صبر و تحمل، استقامت، بردباری کے الفاظ بارہا سنے۔ اس موضوع پر مطالعہ کیا، حکایات بھی سنیں، مواعظ سے بھی لطف اندوز ہوا مگر عملی نمونہ اپنے اکابر کے ہاں دیکھا۔

والدین کے نکاح کے گواہ:

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دورانِ درس کسی نے ایک رقعہ بھیجا کہ تم اپنے باپ سے نہیں ہو۔ حضرت مدنیؒ نے نہایت شائستگی اور نرمی سے اس کا جواب دیا۔ فرمایا: "میں فلاں محلے کا رہنے والا ہوں، اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں۔ خط بھیج کر یا خود جا کر تصدیق کر لی جاوے۔"

حسین احمد قبل از وقت بالغ ہو گیا ہے:

جمعیت علمائے اسلام کے مرکزی رہنما جناب حافظ حسین احمد صاحب رقم طراز ہیں:

> " اکتوبر ۱۹۷۷ء کے ملتوی ہونے والے انتخابات سے قبل امیدواروں کی نامزدگی کے لئے جگہ جگہ میٹنگیں ہو رہی تھیں۔ بلوچستان میں ایک جماعت کے عدم تعاون کی وجہ سے ہم فیصلہ نہ کر سکے تو لاہور میں جمعیت کے شوریٰ کے اجلاس میں جب اس سلسلہ میں بات شروع ہوئی تو حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "بلوچستان والے کوئٹہ میں تو فیصلہ نہ کر سکے، اب بمعہ صوبائی پارلیمانی بورڈ کے لاہور پہنچے ہیں۔ اب یہاں فیصلہ کریں گے۔" مولانا محمد خان شیرانی نے اجلاس میں فرمایا: "اب ہم مزید رواداری نہیں

برتیں گے" لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "ہم اس عظیم اتحاد کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں، آپ لوگ افہام وتفہیم سے خود فیصلہ کریں۔"

میں نے کھڑے ہو کر کہا: "آپ حضرات ہمیں قربانی کا بکرا نہ بنائیں، قبل ازیں نیپ جمعیت اتحاد میں سرحد کی حد تک تو معاہدہ کی شقوں پر عمل درآمد ہوا مگر بلوچستان میں اس معاہدہ کو بالائے طاق رکھا گیا، آپ حضرات سے اس کی شکایت کی گئی تو ہمیں اس بارے میں مرکز کے فیصلوں پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا اور معاہدہ پر بلوچستان میں بھی جلد عمل درآمد کرانے کی یقین دہانی کرائی گئی، آپ ہم پر رحم فرمائیں۔"

بہر حال میں نے جوش میں ہوش کا دامن چھوڑ دیا اور لہجہ میں تلخی آ گئی مگر حضرت مفتی صاحبؒ نے انتہائی متانت اور بردباری سے میری تند وتیز باتیں گوش گزار کیں اور نرمی سے فرمایا: "مرکز نے جس سے بھی اتحاد کا فیصلہ کیا ہے آپ کو اُسے بہر صورت نبھانا ہوگا۔"

اس پر میں نے عرض کیا کہ: "آپ ہمیں اجازت دے دیں، ہم صوبائی پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں فیصلہ اکثریت سے کریں گے۔ اگر کوئی جماعت عدم تعاون کی پالیسی پر عمل کرے یا میٹنگ میں شامل نہ ہو تو ہم باقی جماعتیں اس کا کوٹہ رکھ دیں گے۔"

مگر مفتی صاحبؒ اس پر مصر رہے اور فرمایا کہ: "آپ کو انہیں ساتھ لے کر چلنا ہے اور یہی مرکز کا فیصلہ ہے۔' غصہ اور جوش سے بے قابو ہو کر میں نے کہا کہ: "مرکز کا یہ فیصلہ ہے تو پھر بلوچستان کے سنگلاخ علاقوں میں مرکز

جا کر الیکشن لڑے۔"

اتنا کہنا تھا کہ مفتی صاحبؒ کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا اور انتہائی سختی سے انہوں نے مجھے ڈانٹا۔ میں انتہائی پریشانی اور پشیمانی کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اب شاید محترم قائدؒ مجھ سے کبھی نہ بولیں گے، مگر چند لمحوں کے بعد انہوں نے شفقت اور نرمی سے بلوچستان میں پارٹیوں کی پوزیشن کے بارے میں مجھ سے سوالات کئے۔ اُس دن سے مجھے قائل ہونا پڑا کہ اصول کے وقت انتہائی سخت ہونے کے باوجود ذاتی طور پر مفتی صاحبؒ اپنے کارکنوں پر کتنے مشفق و مہربان تھے۔ اس واقعہ کے بعد صرف ایک دفعہ محترم اکرام القادری صاحب کو یہ فرمایا تھا کہ: "حسین احمد قبل از وقت بالغ ہو گیا ہے۔" (ترجمان اسلام، ص ۲۷۵)

تدبر و تحمل اور حکمت و تدبیر:

حضرت مفتی صاحبؒ کے تحمل اور بردباری کا ایک عجیب واقعہ نذر قارئین ہے:

" ۱۹۷۷ء کے انتخابات کا مرحلہ آیا تو مولانا مفتی محمودؒ نے قومی اتحاد کے صدر کی حیثیت سے اس میں حصہ لیا۔ اس بار وہ ڈیرہ اسماعیل خان کے علاوہ ڈیرہ غازی خان کے حلقے سے بھی قومی اسمبلی کے امیدوار تھے۔ ۱۹۷۰ء میں مسٹر بھٹو نے ڈیرہ اسماعیل خان کی سیٹ پر ان کے ہاتھوں سے شرمناک شکست کھائی تھی۔ انہیں اس کا بدلہ چکانا تھا۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے ایک ایسے صنعت کار کو ٹکٹ دیا جس نے مفتی صاحبؒ کے خلاف الیکشن میں ایک کروڑ روپے خرچ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

مولانا مفتی محمودؒ نے الیکشن کے دن ڈیرہ اسماعیل خان میں میاں محمد ظہور کی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنی مہم کو کنٹرول کیا۔ بیٹھک میں فون موجود تھا۔ وقتاً فوقتاً فون کر کے مختلف پولنگ سٹیشنوں کی صورتِ حال معلوم کر لیتے۔ دوپہر کے قریب ایک زنانہ پولنگ سٹیشن سے اطلاع ملی کہ یہاں بوگس ووٹ بھگتائے جا رہے ہیں اور ہماری خاتون ووٹروں کو ووٹ ڈالنے سے روکا جا رہا ہے۔ مولانا مفتی محمودؒ صورتِ حال معلوم کرنے خود وہاں پہنچ گئے۔ ان کے نوجوان کارکن سخت مشتعل تھے اور مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ سب کے سب مسلّح بھی تھے۔ مفتی صاحبؒ نے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے انہیں سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا اور کہا: "تم لوگ باہر ٹھہرو، میں اندر جا کر دیکھتا ہوں کیا ہو رہا ہے، اس کے بعد کوئی قدم اٹھائیں گے" مفتی صاحبؒ تنہا ایس پی کے ساتھ اندر گئے، جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ہیرا پھیری کرنے اور بوگس ووٹ بھگتانے کا الزام کچھ غلط نہیں لیکن سوچا اگر میں نے ان لوگوں کے الزام کی تصدیق یا تائید کر دی تو بڑا خون خرابہ ہو گا اور کئی قیمتی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔ چنانچہ انہوں نے کمال ہوشیاری سے کام لیا اور پولنگ سٹیشن سے باہر آتے ہی اپنے کارکنوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی: "تم لوگوں نے یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے، میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں کوئی دھاندلی وغیرہ نہیں ہو رہی۔ چلو سب لوگ اپنا اپنا کام کرو، یہاں شور مچانے یا ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

ایس پی جو اُن کے ساتھ ساتھ تھا اور دھاندلی کا چشم دید گواہ بھی تھا، مفتی

صاحبؒ کی بات سن کر حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا یہ کیسا سیاست دان ہے! مخالف امیدوار کی دھاندلیوں پر اپنے کارکنوں کو ہنگامے پر اکسانے یا دھاندلی کا جواب دھاندلی سے دینے کے بجائے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر کے وہاں سے بھگا رہا ہے۔ ایک سیاستدان کا یہ طرزِ عمل اور کردار کا یہ رخ اس کے لئے اچنبھے سے کم نہ تھا۔ چند لمحے پہلے وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ اگر مفتی صاحب نے دھاندلی سے متعلق ذرا سا اشارہ بھی کر دیا تو خیر نہیں، یہاں بڑا زبردست قسم کا فساد ہوگا اور میرے پاس اتنی نفری نہیں کہ اس پر قابو پاسکوں گا، کیا بنے گا؟ حضرت مفتی صاحبؒ کی بات سن کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور سر جھکا کر دوسری طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہجوم چھٹا تو مفتی صاحبؒ بھی وہاں سے روانہ ہو گئے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۵۰)

انسانی کردار کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی احسان کیا جاوے اور وقت پڑنے پر ان سے انتقام نہ لیا جاوے۔ ملک میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمان ایسے بھی تھے جو حضرت مفتی صاحبؒ کے شدید مخالف اور نکتہ چین رہے لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے بالعموم ساری زندگی اور بالخصوص وزارتِ علیا کے دور میں دوست اور دشمن میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔

سیاسی مخالفین سے حسن سلوک:

ڈیرہ اسماعیل خان کے قصبہ پروآ کے ایک پوسٹ ماسٹر صاحب لکھتے ہیں:

" پروآ کے قریب ایک دیہات ہے جس کا نام "**ملیکھی**" ہے۔ وہاں سے ایک صاحب قمر عباس خان نامی اکثر اپنی ڈاک لینے کے لئے ڈاک

خانے تشریف لاتے تھے۔ یہ ۱۹۷۰ء کا ہنگامہ خیز سیاسی دور تھا جس میں حضرت مفتی صاحبؒ ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے میں الیکشن لڑ رہے تھے۔ قمر عباس صاحب حضرت مفتی صاحبؒ کے ناقدین میں تھے، جب وہ تشریف لاتے الیکشن پر گفتگو ہوتی تو ان کا موقف یہ ہوتا کہ مسجد کا یہ ملّا اور دو رکعت کا امام بھلا سیاست کے اسرار و رموز سے کیا واقف؟ مفتی صاحب اسمبلی کے آداب اور جدید علوم سے ناواقف شخص ہے اور مفتی صاحب کو ووٹ دینا صریح غلطی ہے۔ خیر دنیا نے دیکھا کہ مسجد کے مولوی نے ملک کے وزیراعظم کو شکست فاش سے دوچار کر دیا۔ قمر عباس صاحب فیصل آباد میں کپڑے کی مل میں ملازم تھے۔ کچھ وجوہات کی بنیاد پر ان کی تعیناتی مشرقی پاکستان کے ایک شہر نیو پاڑہ کے ایک اور مل میں ہوگئی (جو اسی مالک کی ملکیت تھی) مشرقی پاکستان بدقسمتی سے بنگلہ دیش بن گیا اور موصوف قمر عباس صاحب انڈیا کے قیدی بن گئے۔ میری پروآ سے ڈیرہ اسماعیل خان شہر ٹرانسفر ہوگئی اور قمر عباس کو چند سال بعد جیل سے رہائی ملی تو مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے اور بتایا کہ جب میں انڈیا کی جیل اور قید میں چلا گیا تو میری تنخواہ مل مالکان نے بند کر دی۔ میری بیوی بچوں نے وزیراعظم بھٹو کو درخواستیں بھیجیں کہ ہم لوگ پریشان ہیں، خاوند انڈیا کی جیل میں ہے، مل مالکان تنخواہ نہیں دیتے، خدارا! ہماری مدد کریں، ہم نے الیکشن میں آپ کو ووٹ دیے تھے، ہمارا تعلق شیعہ مسلک سے ہے اور ہمارے پورے گاؤں سے آپ کو سو فیصد ووٹ ملے ہیں۔

بھٹو صاحب نے ان درخواستوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میرے اہل و عیال نے نصرت بھٹو کو درخواستیں بھجوائیں، جواب ندارد۔ پھر کسی نے مشورہ

دیا کہ حضرت مفتی صاحبؒ آج کل وزیر اعلیٰ ہیں، ہمارے علاقہ کے آدمی ہیں، تجربے کے طور پر انہیں درخواست بھجوا دیں شاید ان کو رحم آ جائے اور ہمارا کام بن جائے حالانکہ الیکشن میں ان کی مخالفت ہم نے ڈنکے کی چوٹ پر کی تھی اور حضرت مفتی صاحبؒ کو سارا ماجرا معلوم تھا اور انہیں ہمارا مسلک بھی معلوم تھا لیکن اس کے باوجود درخواست کے تیسرے روز حضرت مفتی صاحبؒ نے میری بیوی بچوں کو پیغام بھجوایا کہ ہم نے مل مالکان سے رابطہ کیا ہے۔ انہوں نے تنخواہ وغیرہ کی ادائیگی کی یقین دہانی کروائی ہے، آپ مطمئن رہیں۔ چند روز بعد تقریباً ہفتے کے اندر مل مالکان نے میری رکی ہوئی تنخواہ اور الاؤنس وغیرہ میرے بیوی بچوں کو بھیج دیے اور انہوں نے سکھ کا سانس لیا اور حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ......

تم جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے
اپنا اپنا فرض تھا دونوں ادا کرتے رہے

مردِ قلندر کی بارگاہ :

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں:

" ایک مرتبہ شاہ خالد بن عبدالعزیز خادم الحرمین نے حضرت مفتی صاحبؒ کو باضابطہ طور پر دعوت دی۔ حضرت مفتی صاحبؒ پورے شاہی پروٹوکول کے ساتھ مدینہ منورہ سے جہاز میں روانہ ہوئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ایئرپورٹ پر مفتی اعظم سعودی عرب اور دیگر کئی ممتاز علماء اور سرکاری عمائدین استقبال کے لئے موجود تھے۔ علماء کرام نے گاڑیوں کے جلوس میں حضرت مفتی صاحبؒ کو شاہی مہمان خانے پہنچایا۔ بادشاہ کے

مندوب نے آ کر پوچھا: کیا آپ کو ترجمان کی ضرورت ہے؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: نہیں! میں فصاحت کے ساتھ عربی بول سکتا ہوں۔ پھر ۴۵ منٹ تک شاہ خالد کے ساتھ مختلف موضوعات پر بات چیت ہوئی۔ خادم الحرمین شاہ خالد بن عبدالعزیز، حضرت مفتی صاحبؒ سے بہت متاثر ہوئے اور بات بات پر تشکر وامتنان کا اظہار فرماتے رہے اور باہر تک خود رخصت کرنے کے لئے آئے۔"

نہ تاج وتخت میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

جن لوگوں کو اللہ علم وفضل سے نوازتے ہیں انہیں صبر وتحمل اور حوصلہ بھی عطا فرمادیتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے مخالفین سے الجھتے نہیں۔ ان کی باتوں کا جواب نہیں دیتے بلکہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بقول علم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو مجلیٰ کرتا اور فرش سے اٹھا کر عرش پر لے جاتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ رب العزت نے بردباری، حلم، حوصلہ اور صبر وتحمل کے جن اعلیٰ صفات سے متصف فرمایا تھا آج ان کی مثالیں ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

پیدا کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

باب : ٦

عشق رسولؐ، ختم نبوت سے والہانہ عقیدت اور فرقِ باطلہ کا تعاقب

فاتح کون و مکان ہے جذبہ عشق رسولؐ
کچھ نہیں ہوتا یہاں بے گرمی سوز بلالؓ

عشقِ رسولؐ ہمارے اکابر کا طرہ امتیاز اور حاصل زندگی رہا ہے۔ ہمارے اکابر فنافی الرسولؐ تھے۔ ان کی زندگی سراپا معمورہ عشقِ رسولؐ تھی اور سنت رسولؐ ان کے ہر عمل کا ہدف تھی۔ عشقِ رسولؐ ان کی زندگی کی سب سے قیمتی متاعِ عزیز اور متاع حیات تھی۔ ان کا ایمان تھا کہ ....

لوح بھی تو، قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

اکابر کی محبتِ رسولؐ، ادب واحترامِ رسولؐ، تعلق رسولؐ اور عشقِ رسولؐ کی روشن

مثالیں اور عشق ومحبت اور جرأت واستقامت کی تاریخ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان نفوس قدسیہ نے عظمت وناموسِ رسالتؐ کا کوئی پہلو اور گوشہ بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔

قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ بھی اس جماعتِ حقہ کے ایک فرد تھے۔ ان کا دل حبِ رسولؐ سے سرشار تھا۔ دوران تقریر یا تحریر جب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آتا تو محبت سے درود پڑھتے۔ حضرت مفتی صاحبؒ عشق رسولؐ کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔

محمد عربیؐ کا سلام:

حضرت مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی زندگی میں مجھے یہ بات بیان کرنے سے منع فرمادیا تھا لیکن اب اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

> "مدینہ منورہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت مفتی صاحبؒ کو ان الفاظ میں پیغام بشارت دیا گیا: "**قل له منی السلام یتقوی باللّٰه ولا یقول الاالحق واللّٰه یقول الحق وهو یهدی السبیل**۔ "اس کا ترجمہ یہ ہے کہ میری طرف سے آپ کو سلام کہیں، ہر معاملہ میں اللہ سے قوت وطاقت کے طلب گار رہوں، ہمیشہ حق بات کہیں، اللہ تعالیٰ سچ اور حق کہتا ہے اور وہی صحیح راستہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

میں نے جب عرض کیا کہ حضرت! سفرنامے میں اس کو شائع کیا جائے، پہلے تو کچھ نہ کہا۔ جب ریاض جانے کے لئے مدینہ منورہ ایئر پورٹ کی طرف

جار ہے تھے تو از خود فرمایا کہ اس خواب کو مت لکھو، اس سے خودستائی کا پہلو نکل آئے گا۔"

خستہ دلوں کیلئے سرمایۂ تسکین:

خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام کوئی خواب نہیں، حقیقت ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "من رانی فی المنام فقد رانی فان الشیطان لا یتمثل بی " (جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے گویا فی الحقیقت مجھے دیکھا اس لئے کہ شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا۔

اس حدیث کے پیش نظر حضرت مفتی صاحبؒ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام اور پیغام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حضرت مفتی صاحبؒ کی حقانیت کی دلیل ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ خصوصی شفقت کا اظہار بھی ہے اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک امتی کی اس طرح ہمت آفرینی، حوصلہ افزائی اور ڈھارس بندھوائی کی جائے تو ہمت کیوں نہ بڑھے اور کام میں تیزی کیوں نہ آئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے ساتھ پیار تھا اور امت کا سہارا حضورؐ ہی کی محبت ہے۔

زکی کیفی مرحوم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ محبت کا کتنا پیارا نقشہ بیان کیا ہے۔

تم بحر کرم، ابر سخا، منبع احسان
تم مظہر اوصاف خدائے دو جہان ہو
تم سارے زمانے کے لئے آیہ رحمت

تم درسِ اخوت ہو ، محبت کا بیان ہو
تم خستہ دلوں کے لئے سرمایۂ تسکین
تم مرہم زخم دل آشفتہ سراں ہو

جو محدث ہوگا اسے زیارتِ رسولؐ نصیب ہوگی:

جناب محمد شریف عثمانی صاحب رقم طراز ہیں کہ:

" ایک ساتھی نے حضرت مفتی صاحبؒ سے سوال کیا حضرت! کبھی زیارتِ رسولؐ بھی ہوئی ہے؟ سب کے دل دھڑکنے لگے، مشتاق نگاہوں نے توجہ کی، یوں گویا ہوئے عزیز ساتھیو! ہمارے اکابر کا طریق رہا ہے کہ جس کام یا بات کے اظہار میں ریاکاری کی بو آئے اس سے اجتناب ضروری ہے، ممکن ہے میرا کچھ کہنا ریاکاری پر محمول ہو۔ پھر کیا تھا کہرام مچ گیا، دل بے قرار ہو گئے، شیخ کے اس اشارہ پر ترحمنا یا شیخ کی صدائیں بلند ہوئیں، محدّثِ کبیرؒ نے نگاہِ عاطفت گھمائی مرکزِ توجہ بن گئی۔ فرمانے لگے بھائی! آخر ہم بھی تو امام بخاریؒ کے خوشہ چیں ہیں، بھلا وہ بھی کوئی محدّث ہے جسے حدیث والے کی زیارت نصیب نہ ہو۔ اس جملہ کا اظہار تھا کہ سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوئیں، وہ ہمیشہ کے لئے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گئے۔ آج تک حضرتؒ کا یہ ایمان افروز جملہ ذہن میں گونج رہا ہے۔" (ترجمان اسلام، ص ۳۴۲)

حضورؐ نے خواب میں فقہ کی طرف توجہ دلائی:

حضرت مفتی صاحبؒ کو خواب میں زیارت الرسولؐ کا یہ شرف ایک بار نہیں،

کئی بار حاصل ہوا۔ خود حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں:

" ایک بار میں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے مخاطب کر کے فرماتے ہیں: " اپنے لوگوں کو تقلید سے بچاؤ۔" میں حیران ہوا کہ میرے تو تمام بزرگ مقلد تھے۔ پھر آپؐ مجھے کونسی تقلید سے لوگوں کو روکنے کا حکم صادر فرما رہے ہیں۔ پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا: " مسائل فقہ تو عین نص ہیں۔" اس سے خواب ہی میں میرا یہ اشکال رفع ہو گیا۔ آپؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ فقہی مسائل دراصل قرآن و حدیث ہی سے مستنبط ہیں، اس لئے ان کا ماننا ائمہ کرام کی تقلید نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی تقلید ہے۔ بیدار ہونے کے بعد میں نے سوچا کہ دنیا میں کونسی ایسی قوم ہے لوگ جس کی زیادہ نقالی کرتے ہیں۔ محسوس ہوا کہ نقالی تو یہ کسی نہ کسی حد تک سب کی کرتے ہیں لیکن انگریز کی نقالی سب سے زیادہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے عہد کر لیا کہ اقوام غیر کی نقالی سے لوگوں کو تو پہلے بھی روکتا تھا، اب اس چیز پر زیادہ محنت کروں گا۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۶۱)

محمد عربیؐ بلا رہے ہیں:

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ فرماتے ہیں کہ:

" حضرت مفتی صاحبؒ نے مجھ سے اپنا یہ خواب بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ اطہر میرے سامنے کھلا اور اس طرح کہ آنحضرتؐ موجود ہیں۔ آپ کے اور میرے درمیان کوئی حجاب نہیں اور آپؐ مجھے بلا رہے ہیں۔ اس کی تعبیر انہوں نے یہ نکالی کہ آپ کا بلانا

اس دُنیا سے واپس ہونے کا اشارہ ہے اور آپؐ کے اور اپنے درمیان حجاب کا نہ ہونا بھی دوسری دنیا کا نقشہ ہے جہاں آپؐ کے غلام آپؐ سے کسی حجاب کے بغیر ملتے ہیں۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۲۰)

عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ:

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ نے بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا اور آپ کی تمام تر صلاحیتیں خدمت اسلام کے لئے وقف تھیں۔ خصوصاً مسئلہ ختم نبوت میں آپ کی خدمات اور کارنامے آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

وسیلہ نجات:

ختم نبوت کے مرکزی مبلغ حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب مدظلہ اپنی کتاب و "تذکرہ مجاہدین ختم نبوت" صفحہ ۳۷۳ پر رقم طراز ہیں:

> " حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کے بعد ایک عقیدت مند نے آپ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ فرمایئے کیسے گذری؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ ساری زندگی قرآن و حدیث کے تعلم میں گذری۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے کوشش و کاوش کی۔ وہ سب اللہ رب العزت کے ہاں بحمدہ تعالیٰ قبول ہوئیں مگر نجات اس محنت سے ہوئی جو قومی اسمبلی میں مسئلہ ختم نبوت کے لئے کی تھی۔ ختم نبوت کی خدمت کے صدقے میں اللہ نے میری بخشش فرمادی۔ "

اسلام کا اساسی عقیدہ:

ختم نبوت، دین اسلام کا وہ بنیادی اور اساسی عقیدہ ہے جس پر ایک سو سے

زائد آیات قرآنیہ اور دو سو سے زائد احادیث نبویہ شاہد صادق ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں یمامہ کے میدان میں بارہ سو صحابہؓ مسئلہ ختم نبوت پر نچھاور ہو گئے۔ ان میں سات سو حفاظ قرآن تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت سے لے کر وصال نبویؐ تک تیس سال کے عرصے میں جتنے غزوات ہوئے، جنگیں ہوئیں اور صحابہ کرامؓ شہید ہوئے ان کی کل تعداد ۲۵۹ ہے اور صرف مسئلہ ختم نبوت کے شہداء کی تعداد بارہ سو ہے۔

ہر دور میں کذاب اٹھتے رہے، نبوت کا دعویٰ کرتے رہے لیکن امت مسلمہ نے ختم نبوت کے بنیادی عقیدے کے تحفظ کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ جب انگریز کے خودکاشتہ پودے مرزا غلام احمد قادیانی نے دعویٰ نبوت کیا تو امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت پیر مہر علی شاہؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ، قائد تحریک ختم نبوت حضرت مولانا یوسف بنوریؒ اور قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے اس میدان میں جو خدمات جلیلہ سرانجام دیں وہ امتِ مسلمہ کی تاریخ کا ایک زرین باب ہے۔

قومی اسمبلی میں مرزا ناصر پر مفتی صاحبؒ کی جرح:

عوامی تحریک کے نتیجے میں جب یہ مسئلہ قومی اسمبلی میں پہنچا تو اسمبلی میں علماء کی طرف سے قادیانی کیس میں مکمل اور کامیاب نمائندگی حضرت مفتی صاحب مرحوم نے فرمائی اور مرزا ناصر پر ایسی جرح فرمائی کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اسمبلی میں حضرت مفتی صاحبؒ نے جو عالمانہ اور فاضلانہ بحث کی اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

سوال: مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں آپکا کیا عقیدہ ہے؟

جواب: وہ امتی نبی تھے۔ امتی نبی کا معنی یہ ہے کہ امتِ محمدیہ کا فرد جو آپؐ کی کامل اتباع سے نبوت کا مقام حاصل کرلے۔

سوال: اس پر وحی بھی آتی تھی؟

جواب: آتی تھی۔

سوال: خطا کا کوئی احتمال؟

جواب: بالکل نہیں۔

سوال: مرزا قادیانی نے لکھا ہے جو دشمن مجھ پر ایمان نہیں لاتا خواہ اس کو میرا نام نہیں پہنچا ہو، کافر ہے، پکا کافر ہے، دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس عبارت سے تو ستر کروڑ مسلمان سب کافر بنتے ہیں؟

جواب: کافر تو ہیں لیکن چھوٹے کافر ہیں جیسا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں "کفر دون کفر" کی روایت درج کی ہے۔

سوال: آگے مرزا نے لکھا ہے: "پکا کافر"؟

جواب: اس کا مطلب ہے اپنے کفر میں پکے ہیں۔

سوال: آگے لکھا ہے "دائرہ اسلام سے خارج ہے" حالانکہ چھوٹا کفر ملت سے خارج ہونے کا سبب نہیں بنتا؟

جواب: دراصل دائرہ اسلام کے کئی دوائر ہیں اور مختلف کٹیگریاں (درجات) ہیں۔ اگر بعض سے نکل گیا تو بعض سے نہیں نکلا۔

سوال: ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ جہنمی بھی ہے؟

حضرت مفتی صاحبؒ بیان کرتے تھے کہ جب ممبروں نے یہ سنا تو سب کے

کان کھڑے ہو گئے کہ اچھا ہم جہنمی ہیں۔ اس سے ممبروں کو دھچکا لگا، وہ سمجھ گئے کہ ہم تو انہیں مسلمان سمجھتے ہیں اور یہ ہمیں کافر قرار دیتے ہیں۔"

ادھر نیا سوال آیا:

"کیا مرزا قادیانی سے پہلے کوئی نیا نبی آیا ہے جو امتی نبی ہو؟ کیا صدیق اکبرؓ یا حضرت عمر فاروقؓ امتی نبی تھے؟

جواب تھا: "نہیں"۔

سوال: قیامت تک کوئی اور امتی نبی آئے گا؟

جواب: نہیں۔

اس پر مفتی صاحبؒ نے کہا:

" پھر تو اس کے مرنے کے بعد آپ کا اور ہمارا عقیدہ ایک ہو گیا۔ جو ہمارا تصور ہے خاتم النبیین کے بارے میں وہی آپ کا بھی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم سمجھتے ہیں، تم مرزا قادیانی کے بعد ایسا سمجھتے ہو۔ تو گویا تمہارا خاتم النبیین مرزا غلام احمد ہے اور ہمارے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔"

مرزا ناصر: وہ فنا فی الرسول تھے۔ یہ ان کا اپنا کمال نہیں تھا، وہ تو عین محمد ہو گئے تھے۔ (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی۔ منکروں کو "ذریۃ البغایہ" کہنے کی بات بھی ہوئی۔

مفتی صاحب نے کہا کہ مرزا قادیانی نے اپنی کتابوں کے بارے میں لکھا ہے:

" کتب ینتظر الیھا کل مسلم بعین المحبة والمودة و ینتفع من معارفھا و یقبلنی و یصدق دعوتی الاذریة البغایا الذی ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم فھم لا یقبلون "

(ان کتابوں کو ہر مسلم محبت اور مودت کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور ان کے معارف سے نفع اٹھاتا ہے۔ مجھے قبول کرتا اور میرے دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے مگر بدکار عورتوں کی اولاد، وہ لوگ جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے وہ مجھے قبول نہیں کرتے)

مرزا ناصر: بغایا کے معنی سرکشوں کے ہیں۔

مفتی صاحب: بغایا کا لفظ قرآن میں آیا ہے: ﴿ **و ما کانت امک بغیا** ﴾ (اور تیری ماں بدکارہ نہ تھی)۔

مرزا ناصر: قرآن میں "**بغیاً**" ہے "**بغایا**" نہیں۔

مفتی صاحب: " صرف مفرد اور جمع کا فرق ہے۔ نیز جامع ترمذی میں اس مفہوم میں لفظ "**بغایا**" بھی مذکور ہے: " **البغایا الّاتی ینکحن انفسھن بغیر نبیه** " میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ تم اس لفظ کا استعمال اس معنی (بدکارہ) کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں ہرگز نہیں دکھا سکتے۔ "

یہ جرح تیرہ روز جاری رہی۔ گیارہ دن ربوہ گروپ پر جو مرزائی قادیانی کو نبی تسلیم کرتا ہے اور دو دن لاہوری پارٹی پر جو مرزا قادیانی کو مجدد مانتی ہے۔ ہر روز آٹھ گھنٹے جرح ہوئی۔ اس طویل جرح و تنقید نے قادیانیت کے بھیانک چہرہ کو بے نقاب کر دیا۔ حزبِ اختلاف نے "ملتِ اسلامیہ کا موقف" کے عنوان

سے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک مطبوعہ دستاویز ارکان اسمبلی میں تقسیم کی جس کی تدوین و ترتیب کی سعادت حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کو حاصل ہوئی۔

حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت کے ساتھ ایسی کایا پلٹی کہ ممبرانِ اسمبلی قادیانیت کا کماحقہ احتساب کرنے پر تل گئے اور انہوں نے مسٹر بھٹو کو صاف کہہ دیا کہ:

"آپ ہمارے سیاسی لیڈر ہیں اور یہ دین و مذہب کا معاملہ ہے۔"

سب کمیٹی:

۲۲ اگست کو حزبِ اختلاف کے چھ راہنماؤں مولانا مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، چوہدری ظہور الٰہی، مسٹر غلام فاروق اور سردار مولا بخش سومرو اور حزبِ اقتدار کے مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ پر مشتمل ایک "سب کمیٹی" کی تشکیل ہوئی۔ سب کمیٹی کے ذمہ یہ کام لگا کہ وہ مذاکرات اور افہام و تفہیم کے ذریعہ قادیانی مسئلے کا متفقہ حل تلاش کریں۔

مرزائیوں کا نام اقلیتوں میں:

۲۲ اگست سے ۵ ستمبر کی شام تک اس کے بہت سے اجلاس ہوئے مگر متفقہ حل کی صورت گری ممکن نہ ہو سکی۔ سب سے زیادہ جھگڑا دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم کے مسئلہ پر ہوا۔ اس دفعہ کے تحت صوبائی اسمبلیوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو نمائندگی دی گئی ہے جو بلوچستان میں ایک، سرحد میں ایک، سندھ میں دو اور پنجاب میں تین سیٹیں اور چھ اقلیتوں کے نام یہ ہیں:

عیسائی، ہندو، سکھ، پارسی، بدھ اور شیڈول کاسٹ یعنی اچھوت۔

حزبِ اختلاف کے نمائندگان چاہتے تھے ان چھ کی قطار میں قادیانیوں کو بھی شامل کیا جائے تا کہ کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ اس کے لئے حکومت تیار نہ تھی اور ویسے بھی قادیانیوں کا نام اچھوتوں کے ساتھ پیوست پڑتا تھا۔

پیرزادہ نے کہا: "اس کو رہنے دیں"۔

مفتی صاحب نے کہا جب اور اقلیتی فرقوں کے نام فہرست میں شامل ہیں تو ان کے نام بھی لکھ دیں۔

پیرزادہ نے جواب دیا: یہ اقلیتی فرقوں کا ڈیمانڈ تھا اور مرزائیوں کا ڈیمانڈ نہیں ہے۔

مفتی صاحب نے کہا کہ یہ تو تمہاری تنگ نظری ہے اور ہماری فراخدلی کا ثبوت ہے کہ ہم ان کے ڈیمانڈ کے بغیر انہیں ان کا حق دے رہے ہیں۔

وزیر اعظم بھٹو کی آخری مذموم کوشش:

۱۷ ستمبر کو اسمبلی نے فیصلہ سنانا تھا۔ ادھر سب کمیٹی ۱۵ ستمبر کی شام تک کوئی فیصلہ ہی نہ کر سکی۔ چنانچہ ۱۶ ستمبر کی صبح کو مسٹر بھٹو نے مولانا مفتی محمود سمیت سب کمیٹی کے چھ ارکان کو پرائم منسٹر ہاؤس بلایا جہاں دو گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے باوجود بنیادی نقطہ نظر پر اتفاق رائے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ حکومت کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ اپوزیشن دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم کا مسئلہ رہنے دے۔ اپوزیشن سمجھتی تھی کہ اس کے بغیر حل ادھورا رہے گا۔ بڑی بحث و تمحیض کے بعد مسٹر بھٹو نے یہ جواب دیا:

" میں سوچوں گا اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں دوبارہ بلاؤں گا۔ "

عصر کو اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ پیرزادہ نے مفتی صاحب سمیت دیگر ارکان کو اسپیکر کے کمرے میں بلالیا۔ تار دراصل پیچھے سے ہلایا جارہا تھا۔

اپوزیشن نے اپنا موقف پھر واضح کیا کہ دفعہ ١٠٦ میں چھ اقلیتی فرقوں کے ساتھ مرزائیوں کی تصریح کی جائے اور بریکٹ میں " قادیانی گروپ اور لاہوری گروپ " لکھا جائے۔

مسٹر پیرزادہ نے کہا: وہ اپنے آپ کو مرزائی نہیں کہتے، احمدی کہتے ہیں۔

مفتی صاحب نے کہا: ہم ان کو احمدی تسلیم نہیں کرتے، احمدی تو ہم ہیں۔ ہم نے کہا " چلو مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار لکھ دو۔ "

پیرزادہ نے نکتہ اٹھایا: " دستور میں کسی شخص کا نام نہیں ہوتا۔ " حالانکہ دستور میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قائدِ اعظم کے نام موجود ہیں اور پھر سوچ کر بولے مفتی صاحب! مرزا کے نام سے دستور کو کیوں پلید کرتے ہو۔ "

شیطان، ابلیس، خنزیر اور قادیانی:

مسٹر پیرزادہ کا خیال تھا شاید اس حیلے سے مفتی صاحب ٹل جائیں۔ مفتی صاحب نے فوراً جواب دیا:

" شیطان، ابلیس اور خنزیر کے نام بھی تو قرآن میں موجود ہیں۔ اس سے قرآن کی صداقت و تقدس پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ "

پیرزادہ لاجواب ہو کر کہنے لگے: جو اپنے آپ کو احمدی کہلاتے ہیں۔ "

مفتی صاحب نے کہا: " بریکٹ بند ثانوی درجہ کی حیثیت رکھتا ہے، صرف

وضاحت کے لئے ہوتا ہے۔ یوں لکھ دو "قادیانی گروپ اور لاہوری گروپ جو اپنے آپ کو احمدی کہلاتے ہیں۔"

اس پر فیصلہ ہو گیا۔

تاریخی فیصلہ:

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء ہماری تاریخ کا وہ یادگار دن ہے جب ۵۳ء اور ۷۴ء کے شہیدانِ ختم نبوت کا خون رنگ لایا اور ہماری قومی اسمبلی نے اپنی تاریخ میں پہلی بار ملی امنگوں کی ترجمانی کی اور عقیدہ ختم نبوت کو آئینی تحفظ دے کر قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا۔ اس روز دستور کی دفعہ ۲۶۰ میں اس تاریخی شق کا اضافہ ہوا:

" جو شخص خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر مکمل اور غیر مشروط ایمان نہ رکھتا ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی معنی و مطلب یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعویدار ہو یا اس قسم کا دعویٰ کرنے والے کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہو وہ آئین یا قانون کے ضمن میں مسلمان نہیں ہے۔"

دستور ۱۰۶ کی شکل یوں بنی:

" بلوچستان، پنجاب، سرحد اور سندھ کے صوبوں کی صوبائی اسمبلیوں میں ایسے افراد کے لئے مخصوص فاضل نشستیں ہوں گی جو عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ اور پارسی فرقوں اور قادیانی گروہ یا لاہوری افراد (جو اپنے آپ کو "احمدی" کہتے ہیں) یا شیڈول کاسٹس سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلوچستان ایک۔ سرحد ایک۔ پنجاب ۳۔ سندھ ۲۔

تین سفارشات:

ان دستوری ترامیم کے علاوہ یہ تین سفارشات آئیں:

۱۔ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف میں حسب ذیل تشریح درج کی جائے۔

" کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ ۲۶۰ شق ۳ کی تصریحات کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے خلاف اقرار، عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ہذا کے تحت مستوجب سزا ہوگا۔"

۲۔ متعلقہ قوانین مثلاً نیشنل رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۳ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد ۱۹۷۴ء میں قانون سازی اور ضابطے کے ذریعہ ترامیم کی جائیں۔"

۳۔ تیسری سفارش عمومی نوعیت کی تھی جس میں دستور میں پہلے سے دی گئی ضمانت کو دہراتے ہوئے کہا گیا تھا کہ:

"پاکستان کے تمام شہریوں، خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، اُن کے جان و مال، آزادی، عزت اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی ان آئینی ترامیم کے حق میں ایک سو تیں ووٹ آئے جبکہ مخالفت میں ایک ووٹ بھی نہیں ڈالا گیا۔

مبارکباد:

اس تاریخی فیصلے کے اعلان کے بعد اسمبلی کے ایوان میں تمام اہم راہنماؤں

نے اپنے تاثرات بیان کیے۔

قائدِ ملت حضرت مفتی صاحبؒ نے کہا:

" اس فیصلے پر پوری قوم مبارکباد کی مستحق ہے۔ اس پر نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام میں اطمینان کا اظہار کیا جائے گا۔ میرا خیال ہے مرزائیوں کو بھی اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کر لینا چاہیئے کیونکہ اب انہیں غیر مسلم اقلیت کے جائز حقوق ملیں گے۔

جہاں تک کریڈٹ کا سوال ہے، یہ مسئلہ قومی بنیادوں پر تمام تر سیاسی اختلافات سے بالاتر ہو کر طے کیا۔ اس مسئلے کے حل میں ارکان قومی اسمبلی اور سینٹ نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجلس عمل نے پروقار جد و جہد جاری رکھی حالانکہ فائرنگ ہوئی، لوگ شہید ہوئے، لاٹھی چارج، گرفتاریوں اور تشدد کے تمام واقعات کے باوجود ردعمل کا شکار ہو کر تشدد کا راستہ اختیار نہ کیا۔

سیاسی طور پر تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ الجھے ہوئے مسائل کا حل بندوق کی گولی میں نہیں، مذاکرات کی میز پر ہے۔" (ترجمان اسلام، ۳۰۹ تا ۳۱۲)

پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو کافر قرار دیدیا:

چودھری غلام نبی اپنی کتاب " تحریک کشمیر سے تحریک ختم نبوت تک " کے صفحہ ۲۸۹ پر رقم طراز ہیں:

" قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ جب اسمبلی ہاؤس سے باہر نکلے تو سیدھے دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت آ گئے۔ وہاں حضرت مفتی صاحبؒ کا بڑی

شدت سے انتظار ہو رہا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ پہنچے تو حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ مصلے پر سجدہ ریز تھے اور اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگ رہے تھے۔ آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہو گئی تھی۔ مفتی صاحبؒ تشریف لائے اور انہوں نے آواز دی: حضرت! اللہ پاک کا شکر ہے، ہمارا مطالبہ مان لیا گیا۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔

مولانا بنوریؒ کے سجدے:

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ دوبارہ سجدہ ریز ہو کر شکر بجالائے۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے: اللہ پاک ہم آپ کا شکر کیسے ادا کریں، آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ سجدہ سے اٹھتے ہوئے فرمانے لگے: "اللہ نے مجھے سرخرو کیا ہے۔ مرنے کے بعد امیر شریعتؒ سے ملاقات ہوئی تو میں کہہ دوں گا کہ آپ کے مشن میں تھوڑا سا حصہ ڈال کر آیا ہوں۔ آپ نے ختم نبوت کے جس پودے کو پانی دیا تھا میں اُسے پھل لگے ہوئے دیکھ آیا ہوں۔ دوستو! میری بات سن لو حضرت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت کا خطاب جس وقت پانچ سو اجل علماء نے دیا تھا اس وقت میں بھی موجود تھا اور میری خوش قسمتی ہے کہ میرے دستخط دوسرے یا تیسرے نمبر پر موجود ہیں۔" (تحریک کشمیر سے تحریک ختم نبوت تک)

اپنے دین کی حفاظت کا کام اللہ کریم خود کرتا ہے اور اسباب کے درجے میں اس کے لئے رجال کار بھی پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ فرق باطلہ کے خلاف اکابر کی مساعی، کردار اور تعاقب قدرت ہی کی نیرنگیاں اور حفاظتِ دین کے سلسلہ میں تکوینی امور کی

کڑیاں ہیں۔ قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا اس سلسلہ میں کردار کیا رہا؟ اس کے لئے تو دفتر بے پایاں چاہیئے۔ وہ اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر بھی دشمنانِ دین اور گمراہ کن عقائد رکھنے والی جماعتوں اور افراد سے برسرِ پیکار رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا۔

ایران میں شیعی رہنماؤں سے دلچسپ مکالمے:

حافظ عبدالقیوم نعمانی لکھتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ جب ایران تشریف لے گئے تو وہاں کے نو آدمیوں نے بیک وقت حضرت مفتی صاحبؒ سے سوالات کئے، انٹرویو لیا۔ اردو میں اور پشتو میں آپ نے ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ نویں نمبر پر لکھنؤ کا ایک شیعہ پوچھتا ہے کہ حضرت! آپ پاکستان میں شیعوں کو مذہبی آزادی کب دے رہے ہیں؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے بحیثیت قومی اتحاد کے صدر کے یہ فرمایا کہ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ ایران میں سنیوں کو جینے کا حق کب دے رہے ہیں؟ اور فرمایا کہ ان کے سنیوں کی درخواستیں میری واسکٹ کی جیب میں ہیں جن میں انہوں نے کہا ہے کہ ذمہ داروں سے بات ہو، خمینی سے بات ہو۔ ان سے کہو کہ ہمیں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے، مسجد بنانے کی اجازت دی جائے۔ تہران میں مسجد بنانے کی اجازت نہیں ہے اور میرے ساتھ آپ چلیں پاکستان کی گلی گلی، کوچے کوچے میں امام باڑے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ آپ کیا بات کر رہے ہیں، آپ کے ایران کا دستور میرے بریف کیس میں موجود ہے، اس کی دفعہ

۱۲ پر لکھا ہے کہ ایران کا صدر شیعہ اثناء عشری ہوگا جبکہ پاکستان میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ پاکستان کے ساڑھے تین صدر شیعہ آ چکے ہیں۔ ایک محمد علی جناح، ایک سکندر مرزا اور ایک یحییٰ خان، آدھے بھٹو۔ یہ کبھی کہتا ہے میں شیعہ ہوں، کبھی کہتا ہے میں سنی ہوں۔ ہم اس کی دونوں باتیں مان لیتے ہیں، آدھ آدھ کر لیتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا عملاً ساڑھے تین صدر پاکستان کے شیعہ گزر چکے ہیں۔ وہ لاجواب ہو گئے۔

افضل چیمہ نے کہا کہ اور سوال کرو، اور سوال کرو، تم نے تو سوالات کا پرچہ رکھا ہوا تھا کہاں گم کر دیا اس کو؟ مشہد میں شیعوں کے امام رضا کے مزار پر عقیل ترابی سے ملاقات ہوئی۔ عقیل ترابی نے کہا کہ حضرت! اچھا ہوا ہمارے بزرگوں کے مزار پر آپ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا بھئی ہم تو آپ کے بزرگوں کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں، یہ تو آپ کی حماقت ہے کہ آپ ہی ہمارے بزرگوں کو گالی دیتے ہیں۔"

(مفتی محمود قومی رہنما، ص ۲۵۶)

متین اور سنجیدہ گفتگو:

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہتے ہوئے نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ فریق مخالف سے گفتگو فرماتے۔ بڑے سے بڑے مخالف کے ساتھ بھی اختلاف کا اظہار اختلاف کے دائرہ میں رہ کر کرتے۔ اختلاف کو ذاتی مخالفت کا رنگ دینے سے گریز کرتے۔ فریق مخالف کو غصہ سے دبانے کی کوشش نہ کرتے۔ علمی رعب نہ ڈالتے بلکہ دلائل و براہین کے حوالے سے سمجھاتے۔

ڈاکٹر دو الیبی کو رجم کے موضوع پر مسکت جواب:

حضرت مولانا محمد اجمل خان صاحب طویل عرصے تک حضرت مفتی صاحبؒ کے سفر و حضر کے ساتھی رہے اور حضرت مفتی صاحبؒ کو بہت قریب سے دیکھا۔ ایک رفیقِ سفر کی حیثیت سے وہ اپنے مشاہدات بیان کرتے ہیں جن سے حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی عظمت، فاضلانہ بصیرت اور قادر الکلامی نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں کہ:

" ایک بار ڈاکٹر دوالیبی، حضرت مفتی صاحبؒ سے کمپاؤنڈ ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں ملنے کے لئے تشریف لائے تو فرمانے لگے: مفتی صاحب! ویسے تو آپ کو وقت نہیں ملتا، میں نے سوچا چلئے ہسپتال ہی میں آپ سے ایک علمی مسئلے پر بات ہو جائے۔ مفتی صاحب نے فرمایا: کہیئے! ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: "میں آپ سے "مسئلہ رجم" پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس بارے میں دشمنان اسلام عجیب و غریب اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک وحشیانہ سزا ہے، لیکن چونکہ شریعت نے شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے رجم ہی کی سزا مقرر کی ہے اس بارے میں اسلام دشمنوں کی باتوں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ جہاں تک سزا کے نفاذ کا تعلق ہے یہ تو بہر حال ضروری ہے لیکن سزا کے طریقے پر نظر ثانی کر لینے میں کچھ حرج نہیں۔ اس سزا کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسے فاسق آدمی کا وجود برداشت نہیں کرتا جو گناہ کا بیج بو کر سوسائٹی کو ناپاک کرتا ہے۔ اسلام نے اس کے وجود سے سوسائٹی کو پاک کرنے کے لئے اس کے لئے سزائے موت تجویز کی ہے اس

لئے حکم ہے کہ ثبوتِ جرم کے بعد اس پر حد جاری کر دی جائے۔ اس سزا کی انتہا اس کی جان کا اتلاف ہے، اب اگر جان کا اتلاف ہی مقصود ہے تا کہ زنا جیسے بھیانک جرم کے ارتکاب کا دروازہ بند ہو اور سوسائٹی اس آلودگی سے بچی رہے تو جدید دور میں اگر کسی دوسرے معروف طریقے کو اختیار کر لیا جائے جس سے مجرم کی جان کنی کا مرحلہ آسان ہو جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مثال کے طور پر ثبوت جرم کے بعد مجرم کو گولی ماردی جائے، بجلی کا کرنٹ لگا کر ہلاک کر دیا جائے یا پھانسی دے دی جائے۔ یہ عمل اس صورت سے بہتر ہے کہ ایک آدمی کو سرِ عام کھڑا کر کے تمام لوگوں کو حکم دیا جائے کہ اس پر سنگ باری کریں تا کہ وہ ہلاک ہو جائے جبکہ اس کی ہلاکت کی دوسری صورتیں موجود ہیں۔ اس سے مقصد پورا ہوتا ہے اور دشمنان اسلام کی زبانیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔ ہمیں اجتماعی طور پر اس مسئلے میں اجتہاد کر کے اس سزا کی صورت متعین کرنی چاہیئے۔ میں نے اب تک عالم اسلام کے جن اکابر علماء کے سامنے اپنی رائے پیش کی ہے، بیشتر نے میرے خیال سے اتفاق کیا ہے البتہ چند علماء ایسے بھی تھے جو "رجم" ہی کے حق میں ہیں، لیکن رجم کیوں ضروری ہے؟ اس کے ضروری ہونے کے لئے کوئی وزنی دلیل موجود نہیں۔"

رجم کی حکمت کیا ہے؟

حضرت مفتی صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: "آپ کی بات ختم ہوگئی یا اس سلسلے میں آپ مزید کچھ فرمانا چاہتے ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے کہا: "نہیں۔" اس پر مفتی صاحب نے فرمایا: "دراصل آپ نے "رجم" کی

مقصدیت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ آپ نے سمجھ لیا ہے کہ اس سزا کے اجراء سے شریعت کا مقصد مجرم کی جان کا اتلاف ہے، درحقیقت معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر مجرم کو ہلاک کرنا ہی مقصود ہوتا تو آنحضرتؐ کے دور میں بھی ہلاکت کے دوسرے طریقے موجود تھے۔ کسی زانی یا زانیہ کو تلوار کے ایک ہی وار سے ختم کیا جاسکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ رجم کا مقصد کم از کم وہ نہیں جو آپ نے سمجھا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی مقرر کردہ اس حد پر گفتگو کا جواز ہی نہیں۔ اگر یہ رسول اللہؐ کا صرف قولی حکم ہوتا تو اس کو سمجھنے سمجھانے کے لئے اس پر کسی حد تک گفتگو کا جواز تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف قولی حکم نہیں، اس پر آپ کا عمل بھی موجود ہے اور آپ نے شادی شدہ زانی اور زانیہ پر خود حد جاری فرمائی ہے۔ یہ حد "رجم" کی صورت میں تھی، قتلِ محض کی صورت میں نہیں تھی ، لہٰذا یہ مفروضہ باطل ہوگیا کہ اس سزا کا مقصد مجرم کی جان کا اتلاف ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس سزا کا مقصد کیا ہے؟ جب مقصد سمجھ میں آجاتا ہے تو اس سزا پر اعتراض یا سزا کے نفاذ کے طریقے میں تبدیلی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے دو واقعات موجود ہیں اور ان دونوں واقعات میں اس سزا کی حکمت مضمر ہے۔

حضرت ماعزؓ کا اعترافِ جرم:

پہلا واقعہ حضرت ماعزؓ بن مالک کا ہے۔ وہ خود ہی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعترافِ جرم کر کے آپؐ سے اپنے اوپر حد جاری کرنے کا

مطالبہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: "جاؤ چلے جاؤ، سوچ سمجھ کر آنا، تم نے واقعی یہ جرم کیا ہے؟" وہ دوبارہ حاضر خدمت ہوئے تو آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے فرمایا اس شخص کو شاید جنون ہو گیا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک اور صحیح الدماغ آدمی ہے۔ اس موقع پر بھی رسولؐ خدا نے انہیں واپس بھیج دیا۔ پھر وہ تیسری بار حاضر خدمت ہوئے اور آپؐ سے حد جاری کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ آپؐ نے صحابہؓ سے پوچھا اس شخص نے کچھ پی تو نہیں لیا، شاید بہک گیا ہے۔ صحابہؓ میں سے بعض نے اُسے سونگھ کر دیکھا اور عرض کیا اس کے منہ سے بو نہیں آتی، اس نے کوئی نشہ آور چیز ہرگز نہیں استعمال کی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

غامدیہؓ کا واقعہ:

دوسرا واقعہ "غامدیہؓ" نامی ایک خاتون کا ہے۔ وہ بھی خود ہی حاضر خدمت ہوئیں اور آنحضرتؐ سے اپنے اوپر حد جاری کرنے کا مطالبہ کیا۔ آنحضرتؐ نے اُسے بھی یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ وہ سوچ سمجھ کر آئے، کیا واقعی اس نے یہ گناہ کیا ہے۔ وہ دوبارہ اس وقت حاضر خدمت ہوئی جب اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اس نے اپنے گناہ پر اس بچے کو بطور ثبوت پیش کر کے وہی مطالبہ دہرایا کہ اُسے گناہ سے پاک کرنے کے لئے اس پر حد جاری کی جائے۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ چلی جاؤ، جب یہ بچہ دودھ چھوڑ دے، اس کے بعد آنا۔ تیسری بار وہ عورت آئی تو اس کے بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔

وہ کہنے لگی اللہ کے رسولؐ! اب تو بچہ کھانے پینے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے اس تیسرے اقرار کے بعد رسول کریمؐ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔

اسلام دین حکمت ہے:

ان دونوں واقعات سے آنحضرتؐ کا اپنا عمل سامنے آتا ہے۔ اب غور کریں تو زنا کی حد جاری کرنے کی دو ہی عقلی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مجرم خود اعترافِ جُرم کر لے، دوسرا یہ کہ مجرم کے جُرم پر قانون شہادت سے ثبوت مل جائے۔ اب دونوں صورتوں میں آپ کا عقلی استدلال یہ ہے کہ مجرم کو رجم کرنے کے بجائے گولی ماردی جائے یا بجلی کے جھٹکے سے اُسے ختم کر دیا جائے کیونکہ آپ کے نزدیک اس سے مقصود اس کی جان کا اتلاف ہے، لیکن صحیح صورت یہ ہے کہ خدا آپ سے اور ہم سے زیادہ حکیم ہے اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس حکمت کو تمام انسانوں سے زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اسلام خود ہی ایک دین حکمت ہے۔ دراصل دنیا جس سزا کو وحشت سے تعبیر کرتی ہے، وہی جان بچانے کا سبب ہے۔

زوردار عقلی دلائل:

اب اگر آپ کے طے کردہ طریق سزا کو مان لیا جائے تو شہادت ملنے یا اقرارِ جرم کرنے کے بعد مجرم کو ایک منٹ ہی میں ختم کر دیا جائے گا جبکہ رجم میں اس کے بچنے کی یہ صورت بھی موجود ہے کہ اِدھر سنگ زنی شروع ہوئی اور اُدھر کوئی ایک گواہ چیخ اٹھا۔ اُف غضب ہو گیا، میں نے فلاں شخص کے اکسانے پر یا فلاں دشمنی کے باعث گواہی دی ہے گویا جھوٹی گواہی دینے والا

منظر سے اس قدر متاثر ہوا کہ آخر وقت پر بھی سچ کہہ کر اس کی سزا موقوف کرادی۔ اسی طرح اگر مجرم نے خود اقرار کرلیا اور اس پر حد جاری کردی گئی اور ابھی پتھر برسنے شروع ہوئے ہی تھے کہ تکلیف محسوس کرتے ہی چیخ اٹھا کہ میں نے تو مرنے کا ایک بہانہ سوچا تھا اور اب میں مرنا نہیں چاہتا یا اس قسم کی کوئی اور بات کہدے تو اس کی سزا فوراً موقوف ہوجائے گی اور یوں جسے ہم لوگ مار ہی دینا چاہتے ہیں شریعت اُسے بچانے کا موقع دیتی ہے۔

مفتی صاحبؒ کی گفتگو جاری تھی کہ ڈاکٹر المعروف دوالیبی یکدم کھڑے ہوگئے اور مفتی صاحبؒ سے لپٹ کر کہنے لگے "بس مفتی صاحب! میں نے آج تک اتنے زوردار عقلی دلائل نہیں سنے تھے۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۱۲۵)

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ رقم طراز ہیں:

۱۹۶۸ء میں جب ادارہ تحقیقات اسلامی کی سربراہی ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے سپرد تھی۔ انہوں نے راولپنڈی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جس میں اطراف عالم سے چیدہ چیدہ اہل علم وفکر جمع تھے۔ اس کانفرنس میں اس وقت کے ناظم اوقاف نے جو مقالہ پڑھا وہ اشتراکیت کی تبلیغ وتائید پر مشتمل تھا۔

علماء کو چیلنج:

اور اس میں بڑے جارحانہ انداز میں علماء کو چیلنج دیا گیا تھا کہ وہ ان دلائل کا جواب دیں۔ مقالہ چونکہ انگریزی زبان میں تھا اس لئے ہمارے بیشتر علماء اس کے مشتملات سے بے خبر تھے۔ اس موقع پر ضرورت تھی کہ علماء کی طرف

سے کوئی موثر شخصیت حقیقت حال کو واضح کرے۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت پاکستان کے معروف علماء میں سے حضرت مفتی صاحب کے سوا کوئی ہال میں موجود نہ تھا۔ احقر اور برادر محترم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب اس موقع پر حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں مقالے کے اہم اجزاء سے آگاہ کیا۔

مناقشہ:

حضرت مفتی صاحبؒ یہ بات سنتے ہی فوراً کھڑے ہو گئے اور مناقشے کے لئے صدر سے وقت طلب کیا۔ چنانچہ انہیں وقت دیا گیا اور انہوں نے ایسی برجستہ اور فاضلانہ تقریر فرمائی جس سے فضا بدل گئی اور شکوک وشبہات بڑی حد تک دور ہو گئے۔" (ترجمان اسلام نمبر، ص ۱۷۲)

جب داعئ حق کے دل میں جذبہ، ولولہ، شوق، تڑپ، لگن، اخلاص اور للّٰہیت ہوتی ہے تو پھر اللہ پاک اس کے دل پر حکمت وبصیرت کا القاء فرماتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا طریقہ بھی ہمیشہ ایسا رہا کہ ان کی باتوں سے دلسوزی، حق پرستی، خلوص، ہمدردی اور مخاطب کی خیر خواہی مترشح ہوتی تھی۔ اگر آج ہم حضرت مفتی صاحبؒ کی سیرت کے اس پہلو کو اپنالیں تو ہم بہت جلد اتحادِ امت اور اسلامی انقلاب کی منزل حاصل کر سکتے ہیں۔

شاید کوئی آنکلے خوشبو کی تمنا میں
صحرائے محبت میں کچھ پھول کھلا جاؤں

باب : ۷

علمی عظمت و فقہی مقام اور فقہی بصیرت کے چند نمونے

دینی فرائض اور مذہبی مناصب میں سب سے زیادہ وسیع اور عمیق و دقیق، نازک اور پیچیدہ کام فقہی منصب یا قضاء و افتاء کی ذمہ داری ہے۔ ایک قاضی اور مفتی کے لئے علم و ذہانت، مطالعہ کی وسعت، اصلاح اور تقویٰ، امانت و دیانت اور فطری ذکاوت شرطِ اول ہے۔ قضاء و افتا کے منصب پر کام کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قدیم اور جدید علمی ذخیروں پر اطلاع اور واقفیت رکھتا ہو اور اپنے اہل زمانہ کی طبیعت سے بھی واقف اور عرف سے بھی باخبر ہو۔ ماضی قریب میں جن اکابر اور برگزیدہ علماء کو قضاء و افتا کی دولتِ علم اور حکمت سے نوازا گیا ان میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

فقیہ النفس:

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو ''فقیہ

النفس'' فرمایا کرتے تھے۔

فقیہ النفس فقہاء کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ نے فقہ میں کثرتِ ممارست کے بعد ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمایا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہو۔ فقیہ النفس ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔

حضرت العلامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے تو علامہ ابن عابدین شامیؒ جیسے وسیع العلم انسان کو بھی '' فقیہ النفس '' تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اپنے اکابر میں سے حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہیؒ کے بارے میں اعتراف فرمایا کرتے کہ وہ فقیہ النفس تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو محدث کبیر، عارف باللہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے فقیہ النفس کا خطاب دیا تھا۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ وہ بزرگ ہیں جن کو ان کے تبحر علمی اور وسعتِ مطالعہ کی بنا پر اگر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا جانشین کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ حضرت محدث العصر مولانا یوسف بنوریؒ علامہ انور شاہؒ کے تلمیذ خاص اور ان کے علوم ومعارف کے امین ہیں۔

وسعتِ مطالعہ:

حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ فرمایا کرتے:

'' میری نظروں سے آج تک کوئی عالم ایسا نہیں گذرا جس نے فقہ کی مشہور کتاب شامی (جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد میں سات سو صفحات ہیں) کا بالاستیعاب ایک دفعہ بھی مطالعہ کیا ہو مگر حضرت مفتی صاحبؒ

نے اس کتاب کو بالاستیعاب تین دفعہ اول سے آخر تک پڑھا اور ان کو اس کتاب پر مکمل عبور حاصل ہے۔ کسی مسئلے پر آپ کے فتوے کے بعد کسی دوسرے فتویٰ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ "

مفتی صاحبؒ کی ملاقات پر تشکر وامتنان:

شیخ عبدالحسن عباد جو سعودی عرب کے ایک ممتاز عالم اور مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جب حضرت مفتی صاحبؒ یونیورسٹی کے دورے پر تشریف لے گئے تو دوران گفتگو شیخ عبدالحسن عباد نے حضرت مفتی صاحبؒ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:
" واللہ انا اشکرہ و کل مسلم یشکرہ " (خدا کی قسم میں حضرت مفتی صاحب کا شکر گذار ہوں اور ہر مسلمان کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے) حضرت مفتی صاحبؒ جب امام مسجد نبوی شیخ عبدالعزیز صالح سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے اور مجلس کے اختتام پر حضرت مفتی صاحبؒ نے اٹھنے کی اجازت چاہی تو امام مسجد نبوی نے فرمایا:
" واللہ هذا المجلس لا یمل " (خدا کی قسم اس مجلس سے دل نہیں بھرتا، تشنگی باقی رہتی ہے)۔

مولوی محمود کون ہے؟:

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک بار فرمایا:

" تم نہیں جانتے مولوی محمود کون ہے؟ یہ بڑا قیمتی آدمی ہے۔ یہ شخص ہمارے دور کا انسان تھا، اس دور میں پیدا ہو گیا۔ یہی اس کی بدقسمتی ہے۔ ہم خوش قسمت تھے کہ اس دور میں پیدا ہوئے جب اچھے لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ ہمیں اچھے ساتھی میسر آ گئے۔ اب جو دور آ رہا ہے اس میں اچھے لوگ مفقود

ہیں۔ خدا جانے اس شخص کو اچھے رفقاء میسر آئیں یا نہ آئیں۔ قدرت نے اسے کسی بڑے کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ اسی سانچے میں ڈھلا ہوا انسان ہے جس میں بڑے لوگ ڈھلا کرتے تھے۔ یہ اس دور کا انسان نہیں۔ خدا اس کی حفاظت کرے۔"

شیخ الہندؒ اور حضرت مدنیؒ کے صحیح جانشین:

رانا مبارک علی صاحب بیان فرماتے ہیں:

" عارف باللہ، حضرت مولانا عبدالہادی صاحب دین پوریؒ ایک بار سخت بیمار ہوئے۔ بغرض علاج ملتان لائے گئے۔ جب خانقاہ سراجیہ خبر پہنچی تو حضرت مولانا خان محمد صاحب مدظلہ نے راقم الحروف کو حضرت دین پوریؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم دیا کہ میں ان کی طرف سے بیمار پرسی کرلوں اور سلام عرض کروں۔ میں جب حضرت دین پوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بہت سے مریدین اور معتقدین حضرت کے پاس تھے۔ راقم الحروف نے حضرت مولانا خان محمد صاحب کی طرف سے سلام عرض کیا اور کہا کہ راقم الحروف ان کی طرف سے مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا ہے۔ حضرت دین پوری صاحب مرحوم پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وقفہ کے بعد مجھے فرمایا کہ: " فقیر کی طرف سے بھی حضرت مولانا خان محمد صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرلے اور فقیر کی طرف سے اپنی پگڑی ان کے پاؤں مبارک پر رکھے اور ان سے دعا کی درخواست کرے کہ اللہ تعالیٰ فقیر کو بغیر حساب لئے جنت میں داخل فرمادے، حساب لینے پر آئے تو کوئی نہیں بچ سکتا۔

"رخصت لیتے وقت راقم الحروف نے حضرت مفتی صاحبؒ کی صحت کے لئے دعا کی درخواست کی تو حضرتؒ نے استفسار فرمایا کہ حضرت مفتی صاحبؒ آج کل کہاں ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ وہ آج بہاول پور تشریف لے گئے ہیں۔ اس پر حضرت دین پوری صاحبؒ نے فرمایا کہ میرا رخ بھی اس طرف کردو (کیونکہ حضرت مفتی صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور حضرت حسین احمد مدنیؒ کے صحیح جانشین ہیں) تاکہ ان کی طرف سے مجھے ٹھنڈی ہوا آئے اور روح کو تسکین ہو۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ٦٤)

زیرک انسان:

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت مفتی صاحبؒ کے فقہی مقام اور علمی عظمت کے بارے میں فرماتے ہیں:

" ہم عصر علماء میں وہ ایک پختہ فکر، صائب الرائے اور زیرک انسان ہیں۔ ان کی فقہی رائے کو میں نے ہمیشہ قوی پایا۔ بعض مسائل میں وہ اپنی انفرادی رائے بھی رکھتے تھے اور ایسی رائے کے حق میں ان کے پاس قوی دلائل ہوتے تھے۔"

وہ اس دور کے آدمی نہیں تھے:

حضرت مولانا صدر الشہید، حضرت مفتی صاحبؒ کی فقہی مہارت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" میرے نزدیک ان کا فقہی مقام سب سے زیادہ بلند تھا۔ بحیثیت فقیہ

اس دور کے آدمی نہیں تھے۔ گذشتہ دور کے انسان تھے۔ فقہ سے انہیں شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ درسی کتب تو انہوں نے سبقاً ہی پڑھی تھیں۔ بہت سی غیر درسی فقہی کتابیں انہیں از بریاد تھیں۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۲۳)

مفتی اعظم پاکستان:

حضرت مولانا مفتی محمد انور شاہ صاحب سابق ناظم وفاق المدارس العربیہ پاکستان، جو حضرت مفتی صاحبؒ کے شاگرد اور رفیق کی حیثیت سے ۲۵ سال تک مدرسہ قاسم العلوم کے دارالافتاء میں اور وفاق المدارس ملتان میں آپ کے ساتھ شریکِ کار رہے۔ وہ فرماتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ کو بڑے بڑے مشکل اور پیچیدہ مسائل کا جواب لکھتے ہوئے کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فقہ کی بڑی کتب کے صفحات آپ کی نظروں کے سامنے ہیں۔ آپ بے ساختہ فرما دیتے کہ فلاں کتاب اٹھاؤ، اس کے فلاں صفحہ پر یہ مسئلہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے فتاویٰ پر امت کے تمام علماء کرام کو بھرپور اعتماد تھا اور ملک کے اکثر علماء کرام آپ کو مفتی اعظم پاکستان تصور کرتے تھے۔"

طبعی اور فطری وصف:

شیخ الحدیث حضرت مولانا فیض احمد صاحب ملتانی، حضرت مفتی صاحبؒ کی فقاہت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" تفقہ، تدبر، انجام بینی اور دور اندیشی میں آپ کو ممتاز مقام حاصل تھا۔

تفقہ اور فہم دین آپ کا طبعی وفطری وصف تھا۔ معاملہ فہمی، حقیقت شناسی کا جوہر قسام ازل نے آپ کی طبیعت میں ودیعت کر دیا تھا۔ آپ نے تقریباً تیس (۳۰) سال مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے دارالافتاء کو زینت بخشی۔ قدیم و جدید مسائل پر ہزاروں فتوے آپ کے قلم، آپ کے مشورہ یا آپ کی سرپرستی میں لکھے گئے۔"

گوہر قابل:

خانقاہ سراجیہ مجددیہ نقشبندیہ کندیاں کے حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب، حضرت مفتی صاحبؒ کی فقہی بصیرت کے بارے میں فرماتے ہیں:

" یہ گوہر قابل ہے۔ اس کی حفاظت کرو، اس پر نظر رکھو۔ "

فقہی مسائل کی ترجیح دلائل پر ہے:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، حضرت مفتی صاحبؒ کی فقاہت کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ بہت زیادہ وسیع الظرف اور وسیع النظر تھے۔ ان کے سامنے ہر وقت فقہاء کرام کی آراء رہتی تھیں اور فقہی مسائل کے سلسلے میں سب سے پہلے مخالف کے نقطہ نگاہ کو تحمل اور سنجیدگی کے ساتھ سنتے اور اس کے بعد پہلے اس کے دلائل کا رد بیان فرماتے اور بعد میں اپنے دلائل جو کہ فقہاء کرام کی آراء پر مشتمل ہوتے تھے، اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے فقہی مسائل نہ میرے ہیں نہ آپ کے، ہم نے کتاب وسنت اور فقہاء کرام کی آراء کے مطابق حل کرنے ہیں اور اس میں ترجیح کا مدار دلائل

پر ہے۔ یا مجھے اپنے دلائل سے قائل کر لیجئے یا میرے دلائل کو تسلیم کر لیجئے۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۲۵۹)

علمی مجالس کے روح رواں:

حضرت مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب راولپنڈی، حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی اور فقہی حیثیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ کو علم دین کے مختلف پہلوؤں پر پورا عبور تھا۔ حدیث، تفسیر، فقہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ مشہور دینی درس گاہ قاسم العلوم ملتان میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے اور وہاں حدیث کی بڑی کتابوں بخاری شریف، ترمذی شریف کا بڑے عرصے تک درس دیتے رہے۔ آپ کو فقہ سے خصوصی لگاؤ تھا اور ہزاروں فتوے آپ کے قلم سے نکل کر ملک کے طول وعرض میں پھیلے۔ علوم کا سطحی علم رکھنے والے افراد تو بہت ہوتے ہیں لیکن گہرائی اور عمق رکھنے والی شخصیتیں اس دور میں بہت کم رہی ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت خصوصاً فقہ اور افتاء کے معاملے میں امتیازی حیثیت کی مالک تھی۔ جدید مسائل اور نت نئے پیدا ہونے والے معاملات میں حضرت مفتی صاحبؒ کی رائے بڑی وزنی اور گہری ہوتی تھی۔ بارہا مجھے ایسی مجالس میں شرکت کا موقع ملا جہاں بڑے بڑے علماء موجود ہوتے تھے۔ جدید مسائل پر حضرت مفتی صاحبؒ قوتِ استدلال سے اپنی بات منوالیتے۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی حیات میں جدید فقہی مسائل اور احکام پر شرعی نقطہ نظر سے غور کرنے کے لئے چیدہ چیدہ علماء کا ایک

بورڈ تشکیل دیا گیا تھا جس کے روح رواں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ تھے۔ عام طور پر کراچی میں یہ علمی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں کراچی کے دیگر حضرات علماء اور مفتیان کرام بھی شریک ہوتے۔ ان مجالس میں مباحث کے دوران حضرت مفتی صاحبؒ کی فقہ میں گہرائی کا اندازہ ہوتا تھا۔ کئی باران کے ساتھ سعودی عرب، کویت، دوبئی، ابوظہبی اور جنوبی افریقہ تک کے سفر کا موقع ملا۔ ان ممالک کے جید علماء سے حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی مباحث پر گفتگو ہوتی تھی۔ وہ حضرات بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کرتے۔ ان میں امام حرم شیخ عبداللہ بن سبیّل، مکہ مکرمہ کے مشہور عالم دین محمد مالکی مکی، ابوظہبی کے رئیس القضاۃ محمد بن عبدالعزیز المبارک، قطر کے شیخ عبداللہ الانصاری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص۱۷۳)

فتویٰ لکھنے میں حضرت مفتی صاحبؒ کا معمول:

حضرت مولانا محمد موسیٰ خان روحانی البازیؒ، حضرت مفتی صاحبؒ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں اور حضرت مفتی صاحبؒ کی مجلس کے حاضر باش تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

" مفتی صاحبؒ کی حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے اسباق کے دوران بھی بعض ہنگامی مسائل پر فتویٰ لینے کے لئے لوگ درس گاہ میں آجاتے تھے۔ مفتی صاحبؒ کو اہم مسائل کے لئے بھی کتابیں دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں

آتی تھی، وہ بیٹھے بیٹھے فتویٰ لکھ لیتے اور حوالے کے لئے کتابوں کی عبارات حافظے سے لکھ دیتے۔ فتوے کے لئے شامی ان کی پسندیدہ کتاب تھی اور اسی سے زیادہ مسائل کا جواب دیتے تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ مسئلے کی تلاش کے لئے ہم نے انہیں شامی کی فہرست دیکھتے ہوئے کبھی نہیں پایا۔ وہ براہِ راست کتاب کھولتے اور دیکھتے ہی دیکھتے متعلقہ صفحہ نکال کر ایک نظر ڈال لیتے، حالانکہ بڑا ماہر فقیہہ بھی باب دیکھنے کے لئے فہرست ضرور دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شامی کا ایک ایک صفحہ ان کی نظر میں تھا۔ انہیں کتاب کھولتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ کون سے مسائل پہلے صفحات میں ہیں اور کون سے پچھلے صفحات میں۔ فقہ سے اپنی دلچسپی کا وہ خود بھی ذکر کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ فقہ بنیادی طور پر پٹھانوں ہی کا علم ہے، اس لئے اس میں علمائے پنجاب زیادہ ماہر نہیں ہوتے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۸۷)

حضرت مفتی صاحبؒ فتاویٰ نویسی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ فتاویٰ میں اصابتِ رائے آپ کا طرہ امتیاز تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ بحیثیت مفتی انتہائی اعتدال پسند تھے۔

میں مفتی ہوں:

" حضرت مفتی صاحبؒ ایک مرتبہ قاہرہ تشریف لے گئے۔ وہاں کانفرنس ہو رہی تھی۔ حضرت بنوریؒ، حضرت مفتی صاحبؒ، حضرت مولانا ہزاروی صاحبؒ یہ تینوں حضرات تھے۔ ایک دن کہیں جا رہے تھے، آگے حضرت بنوریؒ بیٹھے ہیں اور پیچھے درمیان میں حضرت مفتی صاحبؒ ہیں، بائیں طرف

مولانا ہزارویؒ ہیں ۔ چلتے ہوئے مولانا ہزارویؒ نے فرمایا: مفتی صاحب! آپ فلاں شخص کے بارے میں کفر کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے، بڑے جلال کے ساتھ اور بڑے جوش میں باتیں کر رہے ہیں، دلائل پیش کر رہے ہیں ۔ مفتی صاحبؒ مسکرا رہے ہیں اور مسکرانے کے بعد فرمایا کہ مولانا مصیبت یہی ہے کہ میں مفتی ہوں، مشکل بات تو یہی ہے کہ میں مفتی ہوں اس لئے میں فتویٰ نہیں دے سکتا ۔ ان کی طبیعت میں کوئی جذباتیت نہیں تھی اور جانتے تھے کہ فتویٰ کیا چیز ہے اور کب کس موقع پر دیا جاتا ہے ۔"

قاسم العلوم ملتان میں حضرت مفتی صاحبؒ نے ۲۵ سال تک دارالافتاء والارشاد میں تقریباً ۲۲ ہزار فتوے صادر کیے ۔ کسی ایک فتوے کو بھی کوئی عالم یا مفتی چیلنج نہیں کر سکا ۔ آپ کا فتویٰ ہمیشہ مختصر اور جامع ہوتا تھا ۔ دوسرے مفتیان کرام جس بات کو صفحات میں لکھتے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ اسے چند لائنوں میں لکھا کرتے تھے ۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ پر سب کو اعتماد تھا ۔

ذیل میں حضرت مفتی صاحبؒ کی فقہی بصیرت اور فتویٰ دینے میں حزم و احتیاط کے چند نمونے ملاحظہ ہوں ۔

مشینی ذبیحہ:

جمعیت علمائے اسلام کے مرکزی رہنما حضرت مولانا محمد اجمل خان مدظلہ، حضرت مفتی صاحبؒ کی فقاہت اور فقیہانہ باریک بینی کو یوں بیان کرتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ کے متبحر عالم دین اور منفرد مفتی ہونے کا واقعہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ساتھ مشینی ذبیحہ کے مسئلے

پر اختلاف کی صورت میں سامنے آیا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا فرمان تھا کہ اگر کسی مسلمان شخص نے "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر مشین کا بٹن آن کر دیا تو مشین کے چلنے سے جتنے جانور ذبح ہوں گے وہ سارے حلال ہوں گے کیونکہ مشین چلانے والا مسلمان ہے اور اس نے بوقت ذبح اللہ کا نام لیا ہے۔ مشین چونکہ تکبیر کی شرط پوری نہیں کر سکتی وہ شرط اس مسلمان نے بٹن آن کرتے وقت پوری کر دی تو یہ ذبیحہ حلال ہوگا حالانکہ تکبیر اور ذبح دونوں کا ظہور ہوا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا فقہی استدلال:

حضرت مفتی صاحبؒ کا استدلال تھا کہ جانور پر تکبیر پڑھنے والے مسلمان شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود ذابح ہو۔ ذبح کا سبب نہ ہو۔ مشین چلانے والے عمل میں مسلمان ذابح نہیں بنتا بلکہ صرف ذبح کا سبب بنتا ہے۔ ذابح وہ مشین ہوتی ہے جو بٹن آن کرنے سے چلتی ہے اس لئے اس صورت میں ذبح کی شرط "مکبر ذابح" کی ختم ہو جاتی ہے لہٰذا یہ ذبیحہ حرام ہوگا، حلال نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحبؒ نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے سامنے یہ مثال پیش کی کہ فرض کریں ایک مجوسی شخص جانور ذبح کرنا چاہتا ہے اور ایک دوسرا شخص اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ذبح کے عمل سے روک دیتا ہے، اچانک ایک مسلمان وہاں پہنچ کر اس دوسرے روکنے والے آدمی کو پکڑ لیتا ہے اور مجوسی سے کہتا ہے اپنا کام کر۔ جب مجوسی جانور کی گردن پر چھری چلاتا ہے تو مسلمان "بسم اللہ اللہ اکبر" کہتا ہے، کیا ایسا ذبیحہ

حلال ہو گا جس پر ایک مسلمان نے تکبیر کہی اور ایک مجوسی نے اسے ذبح کیا؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے کہا یہ ذبیحہ حرام ہو گا، حلال نہیں ہو گا کیونکہ مسلمان یہاں ذبح کا سبب بنتا ہے، اس نے تیسرے آدمی کو پکڑ کر صرف رکاوٹ کو دور کیا ہے۔ رکاوٹ دور کر کے اس نے تکبیر کہہ دی لیکن چونکہ وہ مکبر خود "ذابح" نہیں اس لئے ذبیحہ حرام ہے۔ ذابح مجوسی ہے، ذبح میں جس کے ہاتھ استعمال ہوئے ہیں جس طرح مجوسی کا ہاتھ پکڑنے والا شخص مجوسی کے ذبح میں رکاوٹ تھا اسی طرح مشین کے چلنے میں وہ بٹن رکاوٹ ہے۔ جس طرح مجوسی کو روکنے والے شخص کو ایک مسلمان آدمی پکڑ کر رکاوٹ دور کرتا ہے اسی طرح مشین کا بٹن آن کر کے ایک مسلمان اس رکاوٹ کو دور کرتا ہے اور مجوسی کے ہاتھ کی طرح مشین چل پڑتی ہے۔

اگر مجوسی کا ذبیحہ حلال نہیں تو اس مشین کا ذبیحہ بھی حلال نہیں کیونکہ یہ دونوں ذابح نہیں ہیں، مکبر نہیں ہیں۔ یہ جو مسلمان ان دونوں کو متحرک کرنے کے لئے متحرک ہوا ہے اس نے سبب بن کر رکاوٹ کو دور کیا ہے جبکہ ذبح کے لئے اس کا ذابح ہونا ضروری تھا اور ان دونوں حالتوں میں یہ ذابح بن ہی نہیں سکتا، لہٰذا جس طرح مجوسی کا ذبیحہ حرام ہے اسی طرح اس مشین کا ذبیحہ بھی حرام ہے۔

بالآخر محققین علماء نے حضرت مفتی صاحبؒ کی تائید کی اور عدم جواز کا اعلان کیا۔ یوں حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی فقہی بصیرت سے تمام امت کو حرام کھانے سے بچایا۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۲۶)

ناجائز کی سفارش کو جائز نہیں سمجھتا:

حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ، حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی اور فقہی بصیرت کے اعتراف میں رقم طراز ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ان دنوں سرحد بنک میں ایک بڑی ملازمت کی جگہ خالی ہوئی جس کے لئے غالباً اخبار میں اشتہار چھپا۔ میں کراچی میں تھا، ایک دوست میرے پاس آیا اور اس نے مجھے کہا کہ اس بنک کی ملازمت کے لئے آپ مفتی صاحب کے پاس سفارش کے لئے چلئے۔ میں نے اس سے کہا کہ بجائے جانے کے میں پہلے مفتی صاحب سے ٹیلی فون پر بات کروں گا۔ اگر انہوں نے کہا کہ آجاؤ تو چلا جاؤں گا، ورنہ میرا ٹیلی فون کافی ہوگا۔ بہر حال میں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے فون پر بات کی۔ انہوں نے فرمایا کہ بنکنگ کا شعبہ تو میرے پاس نہیں ہے، یہ تو غلام فاروق خان کے پاس ہے، میں اس میں زیادہ سے زیادہ سفارش کرسکتا ہوں مگر ایک بات پہلے تم سے پوچھتا ہوں اگر تم نے بحیثیت مفتی اثبات میں جواب دیا تو پھر سفارش کروں گا، ورنہ نہیں۔ پھر سوال کیا کہ شرعی حکم کے مطابق کیا بنک کی نوکری جائز ہے؟ میں نے جواب دیا کہ آپ خود مفتی ہیں، آپ بہتر فتویٰ دے سکتے ہیں۔ مفتی صاحبؒ نے کہا کہ نہیں، تم فتویٰ دو۔ اگر تم نے جواز کا فتویٰ دے دیا تو میں اپنے فتوے کو چھوڑ کر تمہارے فتوے پر عمل کرلوں گا۔ میں نے مفتی صاحبؒ سے کہا کہ آپ اپنا فتویٰ بتائیں۔ مفتی صاحبؒ نے جواب میں فرمایا کہ میں بنک کی نوکری کو ناجائز

سمجھتا ہوں، اور جو چیز ناجائز ہو، اس کی سفارش کو بھی جائز نہیں سمجھتا۔ بہر حال میں نے اس شخص کو پوری بات بتا دی۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے، اس نے اس نوکری کا ارادہ ترک کر دیا۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۳۲)

ایک قابل اعتماد مفتی:

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ میرے مخدوم و مکرم تھے۔ ان سے تعلق بھی پرانا ہے اور رشتہ محبت بھی قدیم۔ پہلی ملاقات ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ حضرت والد محترم اس وقت بقید حیات تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو انہوں نے کندیاں شریف بلایا تھا۔ ان کی آمد یہاں ایک فتوے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ ہمارے یہاں دو خاندانوں کا مسئلہ طلاق پر باہمی جھگڑا تھا۔ ایک عورت کو طلاق ہوئی۔ ایک فریق کہتا تھا طلاق ہوگئی ہے اور دوسرا فریق اس سے مختلف موقف رکھتا تھا۔ علاقے کے علمائے کرام اور مفتیان عظام اس مسئلے پر اپنی اپنی رائے پیش کر چکے تھے لیکن جھگڑا ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ غالباً یہ لوگ حضرتؒ کے پاس یہ پوچھنے کے لئے آئے کہ ان کی نظر میں جو مفتی سب سے زیادہ قابل اعتماد ہو، اس کا نام بتا دیں۔

انوکھا طریق معلومات اور طرز استدلال:

حضرتؒ نے حضرت مفتی محمود صاحبؒ کا نام تجویز کیا اور خود ہی ان کو کندیاں شریف اپنا مہمان بنا کر بلایا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے مقامی علماء

سے بات چیت کی۔ فریقین کا موقف معلوم کیا، پھر فریقین کی براہِ راست بات سنی۔ ان کے موجودہ اور سابقہ موقف کا موازنہ کیا۔ پھر جب وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے تو اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔ ان کا فیصلہ وہی تھا جو دوسرے علماء پہلے دے چکے تھے لیکن طریق معلومات اور طرزِ استدلال انوکھا تھا۔ ان کے اس طریقہ معلومات اور طرزِ فتویٰ پر مقامی علماء ان کے گرویدہ ہو گئے اور مقامی علماء میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ذات موضوع گفتگو بن گئی۔"

• (فتاویٰ مفتی محمود، ص ۱۰۰)

گٹر کے مسئلے پر سعودی علماء سے مذاکرہ:

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب راوی ہیں:

" مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر عبدالمحسن عباد نے حضرت مفتی صاحبؒ کے اعزاز میں مدینہ منورہ کے ایک بڑے ہوٹل میں بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا تھا اور مدینہ منورہ کے بڑے بڑے علماء کو مدعو کیا۔ ہم طلبہ نے قائدِ ملت حضرت مفتی صاحبؒ کے لئے سپاسنامہ تیار کیا لیکن یونیورسٹی کے چانسلر عبدالمحسن عباد نے یونیورسٹی اور اساتذہ کی طرف سے خود سپاسنامہ پیش کیا، حالانکہ وہ بادشاہوں کو بھی سپاسنامہ پیش نہیں کرتے تھے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ان دنوں سعودی عرب میں گٹر کے پانی کا مسئلہ چل رہا تھا کہ گٹر کے پانی کو اگر کیمیکل اور ٹیکنیکل مشینوں سے گذار کر اور مخصوص دوائیاں ڈال کر بالکل

صاف کر دیا جائے کہ وہ اپنی اصلی حالت میں آ جائے، یعنی ذائقہ، بو اور رنگ میں کوئی تبدیلی محسوس نہ ہو تو آیا شرعاً یہ پانی پاک ہوگا یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا ہاں! یہ پانی جائز ہوگا اور اس پر بڑے وزنی دلائل دیئے جن کے تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ سعودی علماء بڑے متاثر ہوئے اور ملکی سطح پر ایک لاینحل اور مشکل ترین مسئلہ پر سب کا اتفاق ہو گیا۔"

فتاویٰ مفتی محمود:

فقہ وحکمت اور فہم وذکاوت کی وجہ سے حضرت مفتی صاحبؒ کے لئے لفظ "مفتی صاحب" اسم علم بن گیا ہے۔ جب بھی مطلقاً مفتی صاحب کہا جائے تو ذہن فوراً حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی طرف جاتا ہے اور آپ اس کے مصداق اتم قرار پاتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ۲۲ ہزار فتوے جاری کیے جن کی نقول مدرسہ قاسم العلوم کے دارالافتاء میں محفوظ ہیں۔ سردست قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا حافظ ریاض درانی کی محنت و جانفشانی سے پہلی جلد ترتیب و تدوین کے مراحل سے گذر کر چھپ چکی ہے۔ اگلی جلد بھی زیر طبع ہے۔ جلد اول کتاب العقائد، کتاب الطہارت، احکام مساجد، کتاب الاذان اور مواقیت الصلوٰۃ پر مشتمل ہے۔

اس سلسلے میں مولانا فضل الرحمٰن مبارک باد کے قابل ہیں۔ اللہ کرے بقیہ جلدیں بھی جلد شائع ہوں تا کہ امت اس علمی ذخیرے سے مستفید ہو۔ فتاویٰ مفتی محمود سے چند فتوے نذر قارئین ہیں۔

خاک شفا اور مٹی کھانے کا حکم:

۱۔ سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مطلقاً مٹی کا کھانا جائز ہے یا حرام

اور خاک شفا کا کیا حکم ہے؟

جواب: مٹی کا کھانا مطلقاً حرام ہے اگر چہ مٹی پاک ہے لیکن ضروری نہیں کہ جو چیز پاک ہو اس کا کھانا بھی حلال ہو، البتہ ضرورۃً قدر قلیل کھانا جائز ہے۔ جیسا کہ چونا جو کہ جنس زمین میں سے ہے، پان پر لگا کر تھوڑا سا کھانا جائز ہے۔ اس طرح متبرک مٹی مثلاً خاک شفا کو اگر اس طرح استعمال کیا جائے کہ پانی میں ڈال کر پانی کو نتھار کر پئیں تو جائز ہوگا کیونکہ مٹی نیچے بیٹھ جائے گی اور اس کی برکت پانی کے ذریعے سے حاصل ہو جائے گی۔

"و ذکر شمس الائمه الحلوانی اذا کان یخاف علٰی نفسه انه لو اکله اورثه ذلک علة او افة لا یباح له التناول و ان کان یتناول منه قلیلاً او کان یفضل ذلک احیانا لا باس به کذا فی المحیط"

(عالمگیری، ج ۴، ص ۱۰۴) (فتاویٰ مفتی محمود، ص ۲۲۶)

اہل علم کو گالیاں دینا:

۲۔ سوال: کیا فرماتے علماء دین دریں مسئلہ کہ عالم دین کو گالیاں دینے والا شخص گناہ گار ہے یا کافر؟

جواب: علم دین کی اہانت اور علماء حق کو اس لئے گالیاں دینا کہ وہ حاملین دین ہیں، کفر ہے۔ " قال فی الریقة المحمودیة شرح الطریقة المحمدیة ، قال فی الاشباه الاستهزاء بالعلم والعلماء کفر " لیکن اگر عالم کو ذاتی دشمنی یا دیگر کاروباری امور کی وجہ سے برا بھلا کہا جائے تو یہ کفر نہیں، گناہ ہے۔

(فتاویٰ مفتی محمود، ص ۲۲۶)

مسجد میں سپرے کا حکم:

۳۔ سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ مسجد میں زہریلے جراثیم، مچھر وغیرہ ختم کرنے کے لئے سپرے کرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: مسجد میں ایسی سپرے کرانا جس سے مسجد بدبودار ہو جائے، جائز نہیں۔ حضرت جابرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: **من اکل هذه الشجرة المنتنة فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتاذى مما يتاذى منه الانس** (بخاری و مسلم) کہ جو شخص بدبودار درخت یعنی پیاز کھائے، وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے اس لئے کہ فرشتوں کو بھی ان تمام چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے جن سے انسانوں کو ایذا ہوتی ہے۔ اس حدیث میں اگرچہ صراحۃً تو لفظ کھانے کی چیز کا ذکر ہے لیکن چونکہ اخیر میں اس کی دلیل بھی یہ فرمائی ہے کہ فرشتوں کو بھی ان چیزوں سے ایذا ہوتی ہے جن سے انسانوں کو ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم فقط کھانے کی چیزوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام استعمال کی چیزوں کا بھی یہی حکم ہے اور اس وجہ سے مسجد میں مٹی کا تیل جلانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

(فتاویٰ مفتی محمود، ص ۲۳۵)

مسجد سے بجلی کنکشن لینے کا حکم:

۴۔ سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ کوئی شخص مسجد کی بجلی یا میٹر سے تار چسپاں کر کے اپنے مکان میں روشنی حاصل کرتا ہے اور کہتا ہے جتنا خرچہ ہو سب بل میں ادا کروں گا۔ کیا یہ فائدہ اٹھانا جائز ہے؟

جواب: چونکہ اس صورت میں مسجد کو فائدہ ہی فائدہ ہے اور اس صورت میں مسجد کے

وقف مال کا استعمال بھی لازم نہیں آ رہا ہے اس لئے متولی کی اجازت سے مسجد کے میٹر وغیرہ سے کنکشن لے سکتا ہے اور اگر متولی اس کی اجازت نہ دے تو کنکشن نہیں لے سکتا۔

(فتاویٰ مفتی محمود، ص ۵۳۹)

فقہی مسئلہ! زندگی کا آخری کام:

حضرت مفتی صاحبؒ نے فتویٰ نویسی میں مفتیان کرام کے عام اسلوب اور طریقہ کار سے جداگانہ روش اختیار کی جس سے ایک طرف فتویٰ کی شوکت اور فقہی باریکیاں بھی برقرار رہیں اور دوسری طرف اس کی عبارت میں سلاست اور عام فہمی پیدا ہوئی۔ فتویٰ اور فقہی احکامات کے ساتھ آپ کا لگاؤ، انہماک، شوق، ولولہ اور شغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی کا آخری کام جو وفات سے چند لمحات پہلے انجام دے رہے تھے وہ بھی ایک فقہی مسئلہ تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ جو اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، فرماتے ہیں:

> " جب زکوٰۃ و عشر آرڈی نینس نافذ ہوا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے بھی اس موضوع پر ایک فتویٰ تحریر فرمایا تھا اور ہماری مجلس تحقیق مسائل حاضرہ (کراچی) کے کئی اجلاسوں کے بعد ایک تحریر مرتب ہوئی تھی اور ان دنوں فتوؤں میں بعض مسائل میں اختلاف موجود تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ کسی وقت اس مسئلہ پر زبانی گفتگو ہو جائے۔ حضرت مفتی صاحبؒ سفر حج کے ارادے سے کراچی تشریف لائے تو ہماری ملاقات ہوئی۔ ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ جب حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ اچھا اب نمازِ ظہر سے

پہلے اس مسئلے سے متعلق کچھ بات کر لی جائے؟ ہم نے تائید کی اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔

مفتی صاحبؒ نے فرمایا: سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ زکوٰۃ کا مسئلہ چونکہ خالص دینی مسئلہ ہے اس لئے ہمیں اس پر خالص فقہی نقطہ نظر سے گفتگو کرنی چاہیئے اور کسی بھی دوسرے نقطہ نظر یا کسی قسم کی نفسانیت کو درمیان میں نہیں آنا چاہیئے۔ الحمد للہ، مجھے اس پر اطمینان ہے کہ اگر آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی تو اسے قبول کرنے میں مجھے کوئی عذر نہیں رہے گا اور یہی امید بحمد للہ آپ سے بھی ہے کہ اگر میری بات آپ کی سمجھ میں آ گئی تو آپ اپنی بات پر اصرار نہیں کریں گے اور اسی امید پر میں نے زبانی گفتگو مناسب سمجھی ہے تاکہ اگر فتووں میں اتفاق کی صورت پیدا ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم خود اس کے خواہش مند ہیں کہ اس مسئلے پر خالص فقہی انداز سے گفتگو کر کے کسی متفقہ نتیجے پر پہنچ جائیں۔

فرمانے لگے کہ ہاں! پچھلی مرتبہ آپ ہسپتال میں آئے تو بیماری اور ہسپتال کے ماحول کی وجہ سے تفصیلی بات کا موقع نہ تھا اس لئے وہاں یہ بات نہ ہو سکی۔ بہرحال اب بحمد اللہ اس کا موقع مل گیا ہے اور اب یہ بات ہونی چاہیئے۔

اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: میں نے آپ کی (یعنی مجلس تحقیق مسائل حاضرہ) کی تحریر کو غور سے پڑھا ہے اور اس پر مجھے صرف تین اشکالات ہیں۔ اگر وہ تین اشکالات حل ہو جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔

حضرت مفتی صاحبؒ ان شخصیات میں سے تھے جن کی مثالیں ہر دور میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و فضل کی گہرائی کے ساتھ انابت و تقویٰ، اصابت رائے، قوتِ فیصلہ اور اخلاقی کمالات کے اعلیٰ اوصاف عطا فرمائے تھے کہ سلفِ صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ صد حیف کہ اب یہ بزرگ ہستیاں، یہ علم و عمل کی تصویریں، اسلام کی دیرینہ روایات کی حامل شخصیتیں روز بروز عنقا ہوتی جا رہی ہیں ....

ہزاروں منزلیں ہوں گی، ہزاروں کارواں ہوں گے
نگاہیں ہم کو ڈھونڈیں گے، نہ جانے ہم کہاں ہوں گے

میں یہ تینوں اشکالات آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر مفتی صاحبؒ نے پہلے اشکال کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ حضرات نے بنک اکاؤنٹ کو اموال ظاہرہ میں شمار کیا ہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ بنک میں جو رقم رکھوائی جاتی ہے وہ فقہی اعتبار سے امانت نہیں بلکہ قرض ہوتی ہے اور جب کسی کو کوئی رقم بطور قرض دے دی جائے تو وہ قرض دینے والے کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت ہو جاتی ہے، لہٰذا بنک کی رقوم اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتیں اسی لئے ان پر زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہیں جب تک اکاؤنٹ ہولڈر اس رقم کو واپس نہ لے لے، لہٰذا بنک کو جو مقروض ہے، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ازخود اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف سے زکوٰۃ وضع کرے اور نہ مصدق کو یہ حق ہے کہ وہ بنک کی رقم سے جو بنک کی ملکیت ہو چکی ہے اکاؤنٹ ہولڈر کی زکوٰۃ وصول کرے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس نکتے کی وضاحت بڑی تفصیل کے ساتھ مدلل انداز میں فرمائی۔ اس پوری گفتگو میں کسی ادنیٰ کمزوری، غائب دماغی یا کسی جسمانی یا ذہنی تکلیف کا مطلق احساس نہیں ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ اپنے پہلے نکتے سے فارغ ہو چکے تھے اور دوسرے نکتے کو بیان کرنے سے پہلے بات کو سمیٹ رہے تھے کہ ان پر ہارٹ اٹیک کا حملہ ہو گیا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۲۶۱)

باب : ۸

محدثانہ جلالتِ قدر، تصنیف و تالیف، دعوت وخطاب، زبان وادب اور درسی افادات

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ فرمایا کرتے کہ تصنیف، تدریس اور تقریر کی خوبیاں اور اوصاف کا بیک وقت کسی ایک شخص میں جمع ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کوئی عالم مصنف ہے تو مدرس نہیں، بہترین مدرس ہے تو مقرر نہیں اور اگر میدان خطابت کا شہسوار ہے تو تصنیف کے میدان میں نہیں چل سکتا۔

لیکن اللہ نے قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو تینوں اوصاف بیک وقت ودیعت فرمائے تھے اور حضرت مفتی صاحبؒ تینوں کے جامع تھے۔ قاسم العلوم ملتان میں جب دارالحدیث میں بیٹھ کر بخاری شریف کا درس دیتے تو یوں معلوم ہوتا کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی زبان بول رہی ہے۔ جب وعظ و نصیحت اور تقریر کے لئے منبر و محراب کو زینت بخشتے تو حضرت شاہ صاحبؒ کی یاد تازہ ہو جاتی۔ تصنیف کی طرف اگرچہ باقاعدہ طور پر حضرت مفتی صاحبؒ زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ اگر چاہتے تو

تصانیف کا انبار لگا سکتے تھے۔ ان کی ترمذی شریف کی شرح **زاد المنتهى** کے نام سے چھپ کر علمی دنیا میں اپنی عظمت کا سکہ منوا چکی ہے۔ اس کے علاوہ قادیانیوں کے خلاف حضرت مفتی صاحبؒ نے "**المتبني القادياني**" کے نام سے کتاب لکھی۔ پہلی دفعہ اس کی اشاعت کا اہتمام مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے ہوا تھا۔ آج کل ترکی کے ایک مکتبہ کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ کئی سال تک ہفت روزہ خدام الدین لاہور ہفت روزہ ترجمان اسلام اور بعض دیگر دینی جرائد میں اداریے بھی لکھتے رہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ تحریر کے بادشاہ تھے۔ ایک بار ایک عرب عالم نے کہا: "میں نے پاکستانی علماء میں شیخ الحدیث حضرت مولانا موسیٰ روحانی البازیؒ کی بہت سی کتب دیکھی ہیں، ان جیسے علماء عرب میں بھی موجود نہیں۔" اس پر مفتی صاحبؒ کے ایک ساتھی مولوی یاسین صاحب نے کہا کہ آپ جس شیخ موسیٰ کو عربوں پر فوقیت دے رہے ہیں وہ شیخ موسیٰ، حضرت مفتی صاحب کے تلمیذ اور شاگردِ رشید ہیں اور فنون کی تمام کتابیں حضرت مفتی صاحبؒ سے پڑھی ہیں۔ آپ کو شیخ موسیٰ کے علم سے حضرت مولانا مفتی محمود کے علم کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ اس عرب عالم دین نے پھر براہِ راست حضرت مفتی صاحبؒ سے پوچھا آپ نے تصنیفات کی طرف توجہ کیوں نہیں دی؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: آپ نے میری ایک تصنیف شیخ الحدیث مولانا موسیٰ کو پڑھ لیا ہے، اگر اس قسم کی دو چار اور کتابیں پڑھ لیں تو آپ کو مجھ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے قرأت و تجوید کے ابتدائی طالب علموں کے لئے ایک

رسالہ تحریر فرمایا تھا جس کو جمعیت علماء اسلام کے صوبائی رہنما حضرت مولانا قاری فیاض الرحمٰن صاحب مدظلہ (مہتمم دار القراء نمک منڈی پشاور) نے زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ کے ہزاروں کی تعداد میں فتاویٰ موجود ہیں جن کی پہلی جلد جمعیت علماء اسلام کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہ اور حافظ ریاض درانی کی کاوشوں سے "فتاویٰ مفتی محمود" کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے۔ امید ہے مزید جلدیں بھی جلد طبع ہو جائیں گی۔ علاوہ ازیں حضرت مفتی صاحبؒ کے خطبات بھی علمی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، انہیں بھی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

محدثانہ جلالتِ قدر:

قائدِ ملت حضرت مفتی صاحبؒ کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر کے اعتبار سے جید مدرسین اور بڑے محدثین میں شمار ہوتے تھے۔ جب بخاری شریف کا سبق پڑھاتے تو دار الحدیث میں اور دار الحدیث کے باہر بھی شہری لوگوں کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی عادت تھی کہ متعلقہ جملہ مباحث (جس کی تفصیل آپ کے طرزِ تدریس میں گذر چکی ہے) کے علاوہ ہر راوی پر مفصل بحث کرتے۔ راوی کا ثقہ ہونا یا غیر ثقہ ہونا بھی بیان کرتے اور حدیث کی ایسی دلنشین اور حکیمانہ تشریح کرتے کہ سامعین عش عش کر اٹھتے۔ دورہ حدیث کی سب سے اہم کتابیں صحیح بخاری شریف اور جامع ترمذی آپ کے زیر درس رہیں۔

درسی افادات کی چند مثالیں:

بطور نمونہ چند احادیث کی تشریح نذر قارئین ہے جن میں حدیث کے

متعلقات، بیانِ مذاہب، ترجیح مذہب حنفیہ، روایات میں تطبیق وتوافق اور دیگر متعلقہ امور کو پوری شرح وبسط سے بیان فرمایا ہے۔

وضو کے ساتھ گناہوں کے نکلنے کی تشریح:

چنانچہ باب **فضل الوضوء الطہور** کے تحت ایک حدیث کی دلنشین تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

" یہ حدیث مشکلات ومعضلات کے قبیل سے ہے۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ وضو کے ساتھ گناہ نکلتے ہیں اور کسی چیز کا نکلنا اس کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ خارج ہونے والی چیز ذی جرم اور ذی جثہ ہو اور ذنوب تو معنوی اور عرضی چیز ہیں تو اس اشکال کے جواب میں متعدد وجوہ بیان فرمائے ہیں۔

کہ اس کا وجود اگرچہ عالم الشہادۃ میں نہیں ہے لیکن عالم الامثال میں یہ اعمال موجود ہیں۔ جیسا کہ ہوائی لہروں کے ذریعہ آوازیں (اصوات) محفوظ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے اعضاء وجوارح بھی اپنے اعمال صادرہ کو محفوظ ومنجل کرتے ہیں۔ پھر اسی پانی کے ساتھ جو وضو کے لئے استعمال کیا جائے یہ اعمال (**خطایا و الذنوب**) بقدرت باری تعالیٰ دور ہوتے ہیں اور نکلتے ہیں اور اس کی تائید کے لئے ایک حدیث بھی نقل فرمائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی بندہ گناہ کرے تو یہ گناہ اس کے دل میں ایک کالے داغ کی صورت میں نقش بن جاتا ہے۔ پھر وہ جب توبہ کرتا ہے تو یہ داغ نکلتا ہے اور اس کا دل صاف ہوجاتا ہے اور اگر وہ گناہ کی طرف پھر لوٹ آیا تو یہ داغ زیادہ پھیلتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل پر محیط ہوجاتا ہے اور یہ

وہی ران ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے ﴿ **کلا بل ران علی قلوبهم** ...... **الخ** ﴾ صحیح ابن خزیمہ کے حوالے سے نقل فرمایا کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حجرِ اسود جنت سے یاقوت سفید کی شکل میں آیا تھا اور اس کی سفیدی برف کی سفیدی سے بھی زیادہ تھی لیکن مشرکین کے گناہوں نے اس کو کالا کر دیا۔ تو جب گناہ اور خطایا کا اثر پتھر میں پایا جا سکتا ہے تو اجسام میں بطریق اولیٰ پایا جانا چاہیے۔" (**زاد المنتهی**، ج۱، ص۵۳۔۵۴)

حدیثِ قلتین کی آسان اور عام فہم تشریح:

حدیث میں اضطرابِ متن اور سند ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ:

" خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے اور اضطراب کی وجہ سے یہ ضعیف شمار ہوگی۔ اس کے علاوہ حدیث مقدارِ قلتین اور اس کی تحدید سے بھی ساکت ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ: اگر حدیثِ مذکور صحیح مان لی جائے تو قلتین کے معنی یہ ہے کہ پانی زیادہ ہو اور برتنوں میں جمع کرنے اور چھپانے سے زائد ہو تو ایسا پانی نجاست گرنے سے نجس نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر نجاست کا حکم دیا جائے تو اس کی وجہ سے بہت سارے پانی کے ذخائر کا استعمال معطل ہوگا کیونکہ وہ مصؤن اور محفوظ تو نہیں ہوتے جیسا کہ صحراؤں کے کنویں، جبکہ تعطل میں حرج عظیم واقع ہوگا۔ تو ذکر قلتین یا **ثلاث قلل** برائے تحدید نہیں۔

امام سمعانیؒ نے امام ابو یوسفؒ سے نقل فرمایا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے مجھ سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کے بارے میں پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کے اس ارشاد گرامی "**اذا بلغ الماء قلتين**" کا کیا مطلب ہے؟ میں نے اس کی ایسے تاویلات کیں جن پر وہ راضی اور مطمئن نہ ہوئے۔ میں نے کہا تب اس کا مطلب کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرماویں۔ فرمایا: اس کا معنی یہ ہے "**وجاريا أى كثير**" (بہتا ہوا زیادہ پانی) امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں میں نے ابو حنیفہؒ کا سر چوما اور زیادہ خوشی سے رو پڑا۔

اسی قول کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ اپنی مزید وضاحت کرتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اصل سوال پر نظر کرنا چاہیئے کہ سوال میں تصریح موجود ہے اس بات پر کہ انہوں نے ایسے پانی کے بارے میں سوال کیا تھا جو صحرائی زمین میں پھیلا ہوتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس قسم کے پانی کی مساحت زیادہ ہوگی اور اس کی گہرائی بالکل نہ ہوگی اور نجاست کا اثر دور ہونا یہ مساحت کی قلت و کثرت کے ساتھ متعلق ہوگا نہ پانی کی کثرت وقلت کے ساتھ۔ تب جب پانی دو قلہ ہوگا اور زمین پر منتشر ہو تو نجاست کا متحمل نہ ہوگا کیونکہ نجاست اس صورت میں دوسری جانب سرایت نہیں کرسکتی اس لئے کہ پانی کی مساحت وسیع اور کشادہ ہے۔

اس کے خلاف کسی کنویں یا تنگ جگہ میں پانی دو قلہ ہو تو ضرور اس کی مساحت کم اور تنگ ہوگی تو اس کے نتیجے میں نجاست کی سرایت سارے پانی میں ہوگی اور نجاست اس کے سر پر ابھر کر ظاہر ہوگی جس کی وجہ سے لامحالہ پانی نجس ہوگا۔ اگر چہ یہ پانی چالیس قلل کیوں نہ ہو، جیسا کہ عام کنوؤں میں پانی کا اندازہ اس طرح ہوتا رہتا ہے جیسا کہ ایک صحیح خبر میں ہے کہ ایک اعرابی

زمزم کے کنویں میں گر پڑا تو اس کا سارا پانی نکالا گیا۔ اسی طرح دوسرے آثار بھی کنوؤں میں نجاست گرنے کے وقت سارے پانی کے نکالنے پر دلالت کرتے ہیں۔" (زاد المنتھی، ج۱، ص۱۹۳)

حدیثِ وضع جریدتین:

حدیث وضع جریدتین کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

" اس حدیث سے بعض لوگ مختلف قسم کی بدعات کے جواز پر استدلال پیش کرتے ہیں اور خاص کر عاشورا کے دن مرد و عورتیں قبرستان جاتے ہیں اور وہاں قبروں پر درختوں کے پتے اور ٹہنیاں رکھتے ہیں اور پانی کا چھڑکاؤ وغیرہ قسم کی بدعات و رواجات کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس کو لازم سمجھتے ہیں یہاں تک کہ جو لوگ ان کے ساتھ اس میں شامل نہیں ہوتے تو ان پر نکیر کرتے ہیں اور مختلف طعنے دیتے ہیں اور اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ایک بار دو قبروں پر گذر ہوا تو فرمایا یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں تو حکم فرمایا کہ درخت کی تازہ ٹہنیاں لاؤ تو جب ٹہنیاں لائی گئیں تو ایک ایک قبر پر رکھی اور دوسری، دوسری قبر پر۔

حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کا استدلال اس حدیث پر از قبیل **تثبث الغریق با لحشیش** ہے اور اس کے لئے کئی وجوہ بیان فرمائے۔

(۱) کہ یہ فعل نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خاص ہے اس لئے کہ یہ کام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی ایک کثیر جماعت کے

سامنے کیا مگر اس کے باوجود یہ کسی صحابی سے منقول نہیں ہے کہ انہوں نے بھی یہ کام کیا ہو اور صحابہ رضوان اللہ عنہم سے کون احق بالاتباع ہوگا، وہ تو ہم سے زیادہ پابندِ حق تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ رکھیں۔

(۲) حدیث میں دن کا بھی ذکر نہیں ملتا تو یوم عاشور کی تخصیص بھی دعویٰ بلا دلیل ہے اور محض بدعت اور ضلالت ہے۔

(۳) یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم بالتعذیب کے بعد پیش آیا تھا کہ جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں تو حکم فرمایا بوضع الجریدتین، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو رحمۃ للعالمین ہیں تو پھر ان دونوں قبروں کے علاوہ دوسرے قبور پر بھی وضع کا ثبوت ہونا چاہیئے تھا۔

(۴) اصل بات یہ ہے کہ یہ طائفہ مبتدعہ جو بدعات و رسومات کا مرتکب ہوتا ہے، یہ دراصل ہندوستان کے ہندوؤں کے تقلید کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنے خودساختہ معبودوں اور بتوں پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے ہیں اور ان لوگوں نے اولیاء کرام کے قبور کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو ہندو کرتے ہیں اس زعم پر کہ اس فعل کی وجہ سے یہ اولیاء ان کی امداد و نصرت فرمادیں گے ورنہ اولیاء غیر مشہور بھی موجود ہیں تو ان کے قبور پر کیوں نہیں جاتے۔"

(**زاد المنتهی**، ج ۱، ص ۲۰۴۔۲۰۵)

تحریری افادات اور ادبی شہ پارے:

حضرت مفتی صاحبؒ نے بہت کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا وہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ **زاد المنتهی** بھی آپ کی تصنیفی صلاحیتوں کا بین ثبوت ہے۔

زاد المنتھی کا مختصر تعارف:

جامع السنن للترمذی کی عربی شرح ہے جو قائدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے درسی افادات پر مشتمل ہے۔ آپؒ نے اپنے درس ترمذی کے دوران خود اپنی قلم سے ترمذی پر حواشی، مختصر نوٹ، توضیحی اور تشریحی اور مختصر مگر جامع شرح لکھی۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ آپ سفر بیت اللہ کو جاتے ہوئے اللہ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ آپ کے لائق فرزند اور آپ کے مشن کے علمبردار امیر جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا فضل الرحمٰن نے اپنے عظیم والد کی عظیم علمی شرح کی ترتیب و تحقیق اور مراجعت و اشاعت کے لئے بے چین رہے اور اکابر اساتذہ سے رابطہ کرتے رہے۔ بالآخر حضرت مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب مدظلہ نے اس پر اپنی ہمہ تن توجہ مبذول فرمائی اور ترتیب و تدوین کے بعد زیورِ طباعت سے آراستہ فرمایا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے لکھے ہوئے چند اداریوں کے نمونے بھی ملاحظہ ہوں:

ملک و ملت کے مسائل کا واحد حل:

ملک کی اندرونی صورتِ حال پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

" جس ملک کی خاطر ان گنت نوجوانوں نے خون دیا، ہزاروں بہو بیٹیوں نے اپنی عصمتیں قربان کر دیں، لاکھوں افراد کو آگ اور خون کا سمندر عبور کرنا پڑا۔ اس ملک کا یہ حال ہے کہ اُسے اپنی زندگی میں ایک دن بھی استحکام کی نعمت نصیب نہ ہو سکی۔ ہر آنے والا دن پہلے سے کہیں زیادہ اندوہناک اور پریشان کن ثابت ہو رہا ہے۔ طالع آزما، مفاد پرست اور دولتِ ایثار و

خلوص سے تہی دامن عناصر اس کی قسمت سے بری طرح کھیلتے رہے۔ میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اگر اس کو چلانے والے مخلص و ایمان دار ہوں تو ملک وملت کے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۲۱۱)

خلوصِ نیت:

ایک اور موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

" تو عزیزان گرامی! ہر چند کہ استبداد صفت حکمرانوں نے زر وزور کے روایتی ہتھکنڈے اپنا کر اور اخلاق وانسانیت سوزی کی نئی مثالیں قائم کر کے جینا دوبھر کر دیا ہے اور عمل وحرکت کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں پھر بھی پیغمبر اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی اور خادم ہونے کی حیثیت سے ہم سب کا فرض ہے کہ حوادثِ روزگار کی پروا کیے بغیر عمل اور مسلسل عمل کا انداز اختیار کریں۔

یاد رکھیں! نیت صحیحہ کے ساتھ سچے مقصد کے لئے حرکت وعمل اور سعی و کاوش یہ انسان کا فرض ہے۔ نتائج خدائے بزرگ وتوانا کے ذمے ہیں لیکن اس میں جیسا کہ عرض کیا گیا نیت خالص ہونی ضروری ہے۔ مقصد کا تعین از بس ضروری ہے، اس کے بعد اٹھنے والا ہر قدم نیکی میں شمار کیا جائے گا۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۲۱۲)

دستور کا تقدس:

دستور کے تقدس اور اس کی اہمیت اور وقار کو اجاگر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

" میں اپنی اس سوچی سمجھی رائے کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر حکمران

طبقہ مخلص ہوتا تو اس دستور سے سو فیصد نہیں تو پچانوے فیصد مسائل ضرور حل ہو جاتے لیکن چونکہ آنے والے ایک مخصوص سوچ کے مالک ہیں جس میں یمین و یسار کی آمیزش بھی ہو سکتی ہے اس لئے وہ بالکل مست ہاتھی کی طرح "دیوانہ بکارِ خویش فرزانہ " کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

وہ دستور جس کا انہوں نے حلف اٹھایا ہے وہ انہی کے ہاتھوں مجروح ہے اور اس کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ الامان!

باقی باتوں سے قطع نظر صرف بنیادی حقوق کا حصہ دیکھیں اور پھر اس پر عمل کی کیفیت دیکھیں؟ اس میں نقل و حرکت کی آزادی کا حسین عنوان موجود ہے، لیکن پارلیمنٹ کے ممبروں تک کے لئے ملک کے بعض علاقوں میں آمد ورفت مشکل ہے۔

اس میں اظہار رائے کی آزادی کا دلفریب نعرہ تو موجود ہے لیکن اس کے ممکنہ وسائل حکمرانوں کی استبدادی پالیسی کا شکار ہیں۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۲۱۴)

دیدۂ بینا:

محبِ وطن افراد کی خدمت میں درخواست پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ملک کسی کی جاگیر نہیں کہ کوئی ایک طبقہ حق حکمرانی کو اپنے لئے الاٹ کرالے اس لئے از بس ضروری ہے کہ محبِ وطن عناصر اور بہی خواہانِ ملک و ملت مثالی اتحاد اور مخلصانہ سعی سے ان بندھنوں کو توڑ ڈالیں۔ ساتھ ہی حکمران طبقہ پر لازم ہے کہ وہ نوشتہ دیوار پڑھیں۔ رات کے بعد دن کا آنا

فطری عمل ہے اور جو فطری عمل کے برعکس رویہ اختیار کرتا ہے اس کے عبرتناک انجام سے صفحاتِ تاریخ اٹے پڑے ہیں۔ صرف ان کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے لئے دیدۂ بینا، گوش حق نیوش اور قلبِ سلیم کی ضرورت ہے۔ "

(قومی ڈائجسٹ، ص ۲۱۶)

وعظ و تبلیغ:

وعظ، تقریر، خطابت اور بیان سنتِ انبیاء ہے، سنت صحابہؓ ہے۔ حضرات انبیاء کرام اور صحابہ کرامؓ وعظ کہا بھی کرتے تھے اور سنا بھی کرتے تھے۔ خصوصاً امیر المومنین حضرت عمر فاروق ؓ بھی اپنے لئے وعظ سننے کا اہتمام کیا کرتے تھے اور ناصحین کے سامنے احتیاجِ وعظ کا اظہار کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق ؓ، حضرت کعبؓ سے وعظ کہنے کی استدعا کیا کرتے تھے۔ خود حضرت کعبؓ کی روایت ہے کہ میں ایک بار امیر المومنین حضرت عمر فاروق ؓ کے پاس بیٹھا تھا، آپؓ نے مجھ سے فرمایا اے کعب! ہمیں اللہ کا خوف دلایئے۔ میں نے عرض کیا اے امیر المومنین! کیا آپ کے پاس کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں ہے؟ فرمایا: بالکل ہے لیکن آپ ہمیں ضرور ڈرایئے۔ میں نے عرض کیا یا امیر المومنین! ایک آدمی کے بس میں جتنا ہو سکے، اتنا نیک عمل کرے، قیامت کے روز ستر انبیاء کرام کے برابر بھی عمل ہوں تو وہ کم پڑ جائیں گے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ حضرت کعبؓ جو کچھ سنا رہے تھے اور حضرت عمرؓ جو کچھ سن رہے تھے یہی ان کا قال بھی تھا اور یہی ان کا حال بھی تھا۔

آج گفتار کے سب غازی ہیں، لٹریچر کی فراوانی ہے، ہر طرف وعظ و نصیحت کا شور ہے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، وی سی آر، ڈش

کیبل، سینما گھر، اخبارات و جرائد کے فحش پروگرام، عریانی و فحاشی کے مناظر سب کے سامنے ہیں۔

دعوت و خطابت:

قائدِ ملت حضرت مفتی صاحبؒ اصلاح انقلاب امت کے داعی اور بہت بڑے مبلغ تھے۔ تاریخ اور سلفِ صالحین کے واقعات پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ایک قائد، لیڈر، رہنما اور داعی کے لئے جہاں عظمتِ کردار، شخصی وجاہت، علمی تبحر، سوز دروں اور بلند نظری ضروری ہے وہاں اظہار مافی الضمیر کے لئے خطابتی حسن بھی ناگزیر ہے۔ ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بلند پایہ خطیب تھے۔ ان کی خطابت کے سحر سے لوگ راتیں جاگتے تھے۔ برصغیر میں ان کی خطابت کا طوطی بولتا تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے۔ خطابت صرف الفاظ کی موزونیت اور فقروں کی ترتیب کا نام نہیں بلکہ دل سے نکلنے والی اس حقیقت اور سوز کا نام ہے، وہ جس زبان اور جس انداز میں بھی ادا ہو، اپنے سامعین کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر:

حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر میں شاہ اسماعیل شہیدؒ کا جوش جہاد، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ کا تفقہ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی مدبرانہ سیاست، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حکمت و بصیرت، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا تصوف و سلوک، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا سوز دروں اور حضرت مولانا عبید اللہ

سندھیؒ کی فکر اور قرآن کا انقلابی تصور ہوا کرتا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ تقریر میں اپنے مخالفین اور حریفوں کے لئے کبھی اخلاق سے گرے ہوئے الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے اور اپنے مخاطب کی عزت نفس کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔

منفرد خطیب:

حضرت مولانا ضیاء القاسمی، حضرت مفتی صاحبؒ کی خطیبانہ صلاحیت اور اندازِ بیان کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

> " حضرت مفتی صاحبؒ خطیبوں میں ایک منفرد خطیب تھے۔ مجھے آپ کے بعض خطیبانہ جملے سن کر وجد آ جاتا تو بعض اوقات سوال کرتا کہ حضرت! آپ تو قبائلی علاقے میں رہے ہیں، وہیں پروان چڑھے ہیں، آپ اس قدر فصاحت و سلاست سے اردو بولتے ہیں کہ کبھی گمان بھی نہیں ہوتا کہ آپ پٹھان ہیں بلکہ اردو کے لہجہ میں بہت ہی تمکنت اور صفائی ہے، تو مسکراتے ہوئے فرماتے میں نے تعلیم کے دوران کافی وقت یو پی (انڈیا) میں گذارا ہے جس سے میری اردو بہت مصفا ہو گئی ہے۔ بعض اوقات تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اردو میری مادری زبان ہے اور صاحب زبان میرے لہجے اور تلفظ کی غلطی نہیں پکڑ سکتا۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۲۵)

حضرت مفتی صاحبؒ اردو کے ساتھ ساتھ پشتو کے بھی اعلیٰ خطیب تھے۔ جب اپنے علاقہ میں پشتو میں تقریر کرتے تو عوام کی داد و تحسین، نعرہ ہائے تکبیر اور سبحان اللہ سبحان اللہ کے شور سے اندازہ ہوتا کہ آپ کی خطابت نے ان پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے جذبات میں سمندر کی لہروں کا سا سماں ہے۔

ایک حکیمانہ تدبیر:

حضرت مفتی صاحبؒ نے حتی المقدور ہر جگہ اللہ کا دین پہنچایا اور اس راستے میں تکالیف، پریشانیوں اور مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ جن مشکل حالات میں وہ ملک کے کونے کونے میں پہنچے وہ فقط انہی کا حوصلہ تھا۔

جناب عبدالخالق ندیم صاحب، حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر کا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> " ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے زمانہ میں اہل اوکاڑہ کے دل میں حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر سننے کی خواہش جاگی اور یہ خوش گوار فرض میرے ذمہ سونپا گیا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اوکاڑہ لاؤں۔ میں لاہور پہنچا، حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں درخواست پیش کی۔ حضرت مفتی صاحبؒ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اوکاڑے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم کار کے ذریعے اوکاڑہ پہنچے۔ اوکاڑہ پہنچ کر ایک نئی اور غیر متوقع صورتِ حال سے سابقہ پڑا۔ وہ یہ کہ بس کے اڈے پر اعلان ہو رہا تھا کہ حضرت مفتی صاحب کے ضلع ساہیوال میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ میں تو سن کر ششدر رہ گیا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مشکل اور سنگین صورتحال کا مقابلہ کیونکر ممکن ہے۔ آخر اسی شخص نے جو حوصلوں کی جان اور ولولوں کی آن تھا اور جس کا نام مولانا مفتی محمودؒ تھا، مجھے تسلی دی اور فرمایا کہ اگر آپ تیار ہیں تو میں ان پابندیوں کی کوئی پروا نہیں کرتا کہ ان رکاوٹوں اور بندھنوں کی میری ذات کے منشور میں کوئی جگہ نہیں۔ پھر طے یہ پایا کہ مفتی صاحبؒ کو شہر کے نزدیکی

مضافات میں کسی مکان پر ٹھہرایا جائے اور جلسہ شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق جلسہ شروع ہو گیا۔ اب مفتی صاحبؒ کو جلسہ کے اسٹیج پر لانا بھی ایک مسئلہ تھا لیکن تمام مسئلوں کا حل مفتی صاحبؒ کی شکل میں ہمارے پاس موجود تھا۔ پھر ایسے مسئلے کہاں ٹھہرتے؟ آپ نے ایسے کشیدہ ماحول میں عوام کے جوش و خروش کا اندازہ لگا لیا ہوگا، ابھی یہ ہنگامہ حق و باطل پورے زور و شور سے جاری تھا کہ ایک کار جس میں چند باشرع شخصیتیں براجمان تھیں، جلسہ گاہ کی جانب آتی دکھائی دی۔ دفعۃً شور اٹھا کہ "مفتی صاحب آ گئے، مفتی صاحب آ گئے۔"

تمام لوگ اور انتظامیہ کے ارکان اس کار کی جانب لپکے اور اسی مختصر عرصے میں مفتی صاحبؒ دوسری جانب سے اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ اسکیم یوں تیار کی گئی تھی کہ ایک کار میں چند شخصیتوں کو اسٹیج کی جانب روانہ کیا جائے۔ جب انتظامیہ اس طرف متوجہ ہو تو جمعیت کے ورکر ضیاء صاحب اپنے سکوٹر پر مفتی صاحب کو اسٹیج تک پہنچا آئیں اور یونہی ہوا۔ مفتی صاحبؒ اسٹیج پر پہنچ گئے تو عوام کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ نعرہ ہائے تکبیر اور مفتی محمود زندہ باد کے نعروں سے فضا کانپ رہی تھی۔ اس گول چوک میں جہاں پر جلسہ ہو رہا تھا مفتی صاحبؒ کی تدبیر نے انتظامیہ کی تزویر پر گول کر دیا تھا۔ پھر تو بڑے ٹھاٹھ کی تقریر ہوئی۔ آج بھی اوکاڑے کے عوام کو وہ منظر، وہ جلسہ اور حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر یاد آتی ہے تو بے اختیار سر دھنتے اور سبحان اللہ کہتے ہیں۔"

(ترجمان اسلام، ص ۸۱)

وعظ و تبلیغ فریضہ منصبی:

حضرت مفتی صاحبؒ روایتی مبلغین کی طرح وعظ و نصیحت کی اجرت "کرایہ" کے نام پر وصول نہیں کرتے تھے بلکہ تبلیغ کو اپنا فرض منصبی سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ حضرت ابوسلیمان الدارانیؒ فرمایا کرتے: "وہ شخص کیسے لذات دنیا ترک کرے گا جس کو ایک طرف تم خطباء اور واعظین قوم درہم اور دینار چھوڑنے کی وصیت کرتے ہو اور جب وہی شخص تمہیں درہم و دینار پیش کرتا ہے تو تم جھٹ اس سے لے لیتے ہو۔"

حضرت مولانا محمد اسفند یار صاحب مدظلہ لکھتے ہیں:

"ایک بار ہم نے کراچی میں شریعت کانفرنس منعقد کی۔ اس پر تقریباً ۳۵ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ کچھ عرصے بعد مفتی صاحبؒ نے ہم سے پوچھا کہ شریعت کانفرنس پر آپ لوگوں نے کتنا خرچہ کیا؟ ہم نے ان کو بتایا تو مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "آپ لوگوں نے اتنی رقم جمع کی مگر جب میں ایئرپورٹ گیا تو میرے پاس بمشکل اتنے پیسے تھے کہ رکشے کا کرایہ ادا کیا جاسکے۔ وہ بھی بڑی مشکل سے پورے ہوئے۔" یہ ان کی خودداری تھی کہ اس وقت منتظمین ان کے ساتھ موجود تھے لیکن انہوں نے نہ تو کسی سے پیسے طلب کیے اور نہ کسی کو اپنی حالتِ زار کا علم ہونے دیا۔ حالانکہ اگر وہ کانفرنس کے منتظمین سے کرایہ وغیرہ طلب کرتے تو اس میں کوئی قباحت نہ تھی کہ یہ ان کا حق تھا۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۱۵۳)

عربی میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ہم پلہ:

حضرت مفتی صاحبؒ کو اردو، پشتو، فارسی اور دوسری مختلف زبانوں کے علاوہ

عربی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا اور حضرت مفتی صاحبؒ ایسی شاندار عربی بولتے تھے کہ بقول حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ پورے پاک و ہند میں سوائے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے اور کوئی بھی عربی فصاحت و بلاغت میں حضرت مفتی صاحبؒ کا ہم پلہ نہیں تھا۔

عربی ادب و خطابت:

شیخ الحدیث حضرت مولانا زرولی خان صاحب فرماتے ہیں:

" ایک بار حضرت مفتی صاحبؒ، حضرت الاستاذ مولانا یوسف بنوریؒ کے ساتھ پہلی مرتبہ جمال ناصر کے زمانے میں مصر تشریف لے گئے تو مولانا یوسف صاحب بنوریؒ تو عربی میں بہت مشہور تھے۔ سید سلیمان (ندوی) اور مفتی کفایت اللہ (دہلوی) اور مولانا شبیر احمد (عثمانی) رحمہم اللہ کا نمائندہ بن کر کانفرنس میں انہوں نے عربی میں خطاب کیا تھا اور اپنے اکابر سے دادِ تحسین لے چکے تھے۔ انہیں خیال نہیں تھا کہ شاید کوئی اور عالم بھی اتنا برجستہ اور شستہ اور صحیح اور قابل قدر عربی پر قادر ہے۔ وہاں ان کو موضوعات دیئے گئے تھے جیسے مقالے ہوتے ہیں۔ اچانک پتہ چلا کہ مصر کے علماء خواہش رکھتے ہیں کہ پاکستان میں علماء کی سیاست کس ڈھنگ کی سیاست ہے تو مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ بس میں اسی موضوع پر بات کروں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے سمجھایا کہ جو موضوع آپ تیار کر چکے ہیں اس پر بات کریں بولے نہیں۔ آپ فکر نہ کریں، میں اسی موضوع پر بات کروں گا۔ مولانا یوسف صاحب بنوریؒ نے کہیں بینات کے کسی شمارے میں لکھا بھی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں

کہ جب اس شخص نے تقریر کی تو میں سمجھ گیا کہ جیسے اور صلاحیتوں میں یہ لاثانی ہیں، عربیت میں بھی یہ مجتہد زمانہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے وارث الانبیاء کا جو منصب انہیں عطا فرمایا تھا، یہ اس کی برکت تھی۔"

(مفتی محمود ایک قومی رہنما، ص۲۳۲)

خطبات سے اقتباسات:

حضرت مفتی صاحبؒ کی تقاریر صاف، سادہ اور مؤثر ہوا کرتی تھیں۔ اپنی بات کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کا انہیں ملکہ حاصل تھا۔ ان کی تقریر "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مظہر ہوتی تھیں۔ ذیل میں مختلف مواقع پر کی گئی تقاریر سے چند اقتباسات نذرِ قارئین ہیں۔

نظام حیات:

" انتخابات کا اصل مقصد مضبوط جمہوری حکومت کا قیام ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہم سیاسی قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اقتدار کا حصول، اعلیٰ مقصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہمارا مقصد نظام مصطفیٰ کا قیام ہے۔ اسی مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ نظام مصطفیٰ وہ نظام حیات ہے جو خالق کائنات نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ عوام کے مسائل کا حل نمائندہ حکومت کا قیام ہے اور جمہوریت کے قیام کا مقصد قانون کی بالادستی، عوام کی خوشحالی اور ہر قسم کے استحصال کا حقیقی خاتمہ ہے۔ جمعیت علماء اسلام ہر قسم کے استحصال سے پاک اسلامی نظام کی حامی ہے۔ حق تعالیٰ پاکستان کی سلامتی، ترقی اور

اس کے باشندوں کو خوشحالی نصیب فرمائے اور ہمیں اپنی رضا نصیب فرمائے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۸۰)

قومی بیداری کا وقت:

ایک اور موقعہ پر فرمایا:

" یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک مخصوص طبقہ قومی دولت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ سمیٹ کر امیر کبیر بن جائے، اُن کے بچے دنیا کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کریں اور دوسری طرف غریبوں کے مظلوم بچوں کو بنیادی تعلیم تو کیا، تن ڈھانپنے کو لباس اور باوقار نان جویں تک میسر نہ ہو۔

ان سَروں، خان بہادروں اور انگریز کے پروردہ خاندانوں کے بچے شہزادوں جیسی زندگی بسر کریں۔ ان کے کتوں کو بنگلے اور کاریں میسر ہوں جبکہ غریب عوام پستیوں کی دلدل میں جی رہے ہوں اور انہیں خوشنما نعروں اور حسین وعدوں کے سبز باغ دکھا کر فریب دیا جاتا رہے۔ انشاء اللہ اب ایسا ہرگز نہیں ہونے دیا جائے گا۔

وہ درباری مولوی جو ظلم کی اس اندھیری رات کو اسلام کی صبح سعادت قرار دے رہے ہیں، انہیں بھی پہچانیے۔ یہ وہی جبہ پوش روحیں ہیں جن کی غداریوں نے تاتاریوں کے ہاتھ بغداد کو لہولہان کیا اور ٹیپو سلطانؒ و اسماعیل شہیدؒ جیسے سرفروشوں کی لاشیں تڑپیں۔

اگر آپ بیدار رہے تو آپ کا گھر محفوظ، آبرو محفوظ، مال محفوظ! اور اگر خدانخواستہ آپ نے غفلت کی یا دشمن کو نہ پہچانا تو ظاہر ہے کہ خود کردہ را

علاجے نیست۔"   (ترجمان اسلام، ص ۱۸۸)

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جنگ:

ایک بار لاہور میں نمازِ جمعہ سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے کہا:

" اسلام میں جاگیرداری نظام کی گنجائش نہیں ہے اور اسلام میں بنجر اور بے آباد زمین کا ہر وہ شخص مالک ہے جو اُسے قابل کاشت بناتا ہے۔

محض نعروں اور اسلام کے ساتھ وابستگی کا واسطہ دینے سے عوام کو اسلام کے قریب نہیں رکھا جا سکتا بلکہ معاشرہ میں اسلام کی صحیح تعلیمات کا شعور عام کرکے اور لوگوں کو یہ احساس دلا کر کہ اسلام ان کے حقوق اور مفادات کا ضامن ہے، اسلامی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

اسلام سوشلزم کا اس قدر مخالف نہیں ہے جس قدر سرمایہ دارانہ نظام کا اور غیر ملکی امداد سے جو کارخانے لگائے گئے ہیں اور جن کا بوجھ ساری قوم پر پڑ رہا ہے انہیں قوم اپنی ملکیت میں لینے کا حق رکھتی ہے۔

اس ملک میں اگر کوئی لڑائی ہے تو وہ اسلام اور سوشلزم کی نہیں بلکہ اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام کی ہے کیونکہ گذشتہ اکیس سال کے دوران پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام سے پہنچا ہے۔

دیہات میں مزارعین بڑے زمینداروں کے زیر سایہ جس طرح وقت گذار رہے ہیں اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مزارعین

اور کاشتکار بڑے زمینداروں کے کتوں کو جو دودھ اور مکھن کھلاتے ہیں خود اس سے محروم ہیں۔ اس معاشرہ میں زمیندار کے کتے کو دودھ مل جاتا ہے لیکن کاشتکار اس کے لئے ترستا ہے اور زمیندار مزارعین کے خون پسینے کی کمائی پر جس طرح عیش کرتے ہیں اس سے انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔"

(ترجمان اسلام، ص ۱۹۱)

حضرت مفتی صاحبؒ نے بجا فرمایا اور مجھے اپنے بچپن کا کہیں سے سنا ہوا شعر یاد آیا۔ لیجئے قارئین بھی محفوظ ہوں ......

اِدھر انسان بستے ہیں، اُدھر انسان بستے ہیں
ان کے جوتوں پر چمک ہے، ان کے چہروں پر نہیں

امریکی سامراج، عالم اسلام کا بڑا دشمن:

21 اکتوبر 1969ء کو لاہور میں منعقدہ ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا:

" عربوں کی شکست کے نعرے لگانے والے امریکی ایجنٹ ہیں جو عربوں اور تمام مسلمانوں کے حوصلے پست کر کے امریکہ و یہود کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود عرب مسلمان یہودیوں سے افضل ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ عالم اسلام کا سب سے بڑا دشمن امریکی سامراج ہے جس کے ہر قسم کے اثرات ختم کرنے سے ہی مسلمانوں کے مصائب دور ہو سکتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ جس دل میں امریکی سامراج کے خلاف نفرت نہ ہو وہ مسلمان کا دل ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

پورے کلمہ پر عمل کی ضرورت:

ہری پور جیل میں زمانہ اسارت کے دوران 5 اپریل 1977ء بروز جمعۃ المبارک خطاب فرمایا جسے استاذ مکرم حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ جو اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ جیل کے ساتھی تھے، نے قلم بند فرمایا۔ یہ خطاب پوری امتِ مسلمہ کے لئے آج بھی دعوت غور و فکر اور دعوت عمل ہے۔

" آج ہمارے ملک پاکستان میں کیا خدا کے دین کے احکام میں حیلے نہیں ڈھونڈے جا رہے، کھلم کھلا نافرمانی نہیں ہو رہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا کا دین آج یہاں پر نافذ نہیں۔ آپ نعرے تو لگاتے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ، مگر یہ نہیں سوچتے کہ یہاں دین اسلام پر بننے والے ملک میں ایک بھی قانون اسلام کا نافذ نہیں۔ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حکم بھی نافذ ہوا؟ ایک بتاؤ تو میں مانوں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جو نعرہ پاکستان کا مطلب کیا کا لگایا، یہ نعرہ اصل میں ادھورا تھا۔ لا الٰہ تو کہدیا مگر محمد رسول اللہ نہیں کہا، تو اللہ تو ہے، ایک ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے، اسے عیسائی بھی، یہودی بھی مانتے ہیں۔ پھر پاکستان کا مطلب صرف لا الٰہ کہہ کر بات کیا ہوئی؟ جب تک محمد رسول اللہ کا نظام یہاں نہیں لائیں گے تو ایمان مکمل نہیں ہوگا۔ ادھورے کلمہ سے کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا۔ یہودی بھی لا الٰہ کہتے ہیں مگر محمد رسول اللہ نہیں مانتے۔ اگر پورا کلمہ نہیں تو پاکستان کا مطلب حاصل نہیں ہوسکتا۔ انگریزوں کا قانون یہاں پر رائج ہے، مرزائیوں کا مسئلہ ہے، منکرین حدیث موجود ہیں۔ یہاں سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ہم نے کلمہ ادھورا پڑھا

ہے۔ جب تک آپ قصد نہ کریں کہ ہم پاکستان میں محمد رسول اللہ کا نظام لائیں گے اور کفر والحاد اور زندقہ کو اور اس کے نظاموں کو درہم برہم کریں گے، اسلام کا عادلانہ نظام لائیں گے اس وقت تک ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۲۱۸)

اعمال تولے جائیں گے:

اسلام اور سائنس کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

" دیکھئے حرارت اور برودت دونوں اعراض ہیں اور آج یہ دونوں تولے جاتے ہیں۔ آپ گرمیوں میں روزانہ سنتے ہوں گے کہ آج درجۂ حرارت یہ ہے اور کل یہ تھا۔ آج گرمی اتنی پڑی، فضا میں آج برودت کم یا زیادہ ہے۔ تو سائنس نے ان دونوں کے تولنے کے لئے میزان بنائی ہے جس سے یہ تولے جاتے ہیں۔

میزان سے مراد صرف وہ ترازو نہیں ہے جس سے گڑ وغیرہ تولا جاتا ہے بلکہ ہر چیز کے لئے جدا جدا میزان ہوتی ہے۔ آپ اپنے جسم کی گرمی اور حرارت بھی تولتے ہیں۔ جب کبھی ہم میں سے کسی کو بخار ہوتا ہے تو ڈاکٹر ہمارے منہ میں تھرمامیٹر رکھ کر بتا دیتا ہے کہ اتنا بخار ہے۔ تو بخار تولنے کی ترازو نہیں جس سے پیاز اور گڑ تولتے ہیں بلکہ بخار تولنے والی میزان یہی تھرمامیٹر ہے۔ تو ہر چیز کے لئے الگ الگ ترازو ہوتی ہے۔ تو اعمال تولنے کے لئے بھی میزان ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیسی ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ اعراض تولے جا سکتے ہیں۔ گرمی اور سردی دونوں کا کوئی جسم نہیں ہے،

دونوں اعراض ہیں مگر سائنس دونوں کو تولتی ہے۔ تو آج سائنس کی روشنی میں دنیا پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ہمارا یہ عقیدہ کہ اعمال تولے جائیں گے، بالکل درست اور صحیح ہے اور معتزلہ کا یہ دعویٰ کہ اعمال کا وزن عقلاً مستحیل ہے، غلط اور سراسر حماقت پر مبنی ہے۔

ہم تو کہتے ہیں کہ نہ صرف اعمال تولے جائیں گے بلکہ ایک ہی قسم کے دو عملوں میں بھی میزان کے ذریعے فرق ظاہر کیا جائے گا۔ مثلاً دو آدمیوں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ ایک نے زیادہ خشوع وخضوع سے ادا کی، ایک نے خضوع وخشوع کا زیادہ لحاظ نہ رکھا۔ تو میزان میں خضوع وخشوع سے پڑھی گئی نماز کا وزن دوسری نماز سے زیادہ ہوگا۔ تو نہ صرف نماز تولی جائے گی بلکہ اس کے اندر جو خضوع وخشوع ہے اس کا بھی وزن ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ آج اس سائنسی دور میں معتزلہ کا دعویٰ خود بخود غلط ثابت ہوا اور مسلمانوں کے عقیدے کی تائید ہوگئی۔" (ترجمان اسلام، ص ۴۶۰)

دارالعلوم دیوبند ایک تحریک:

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

" مجھے دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جس کے لئے میرے دل میں مسرت کے جذبات موجزن ہیں۔ دارالعلوم سے ہماری عقیدت صرف اس خطہ اور زمین کی وجہ سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ دارالعلوم نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں علم و ہدایت کا نور پھیلایا۔ اگر آج یہ نور نہ ہوتا تو میں کہتا ہوں کہ اس دنیا کی ہدایت

کا بظاہر اور کوئی سبب نہیں تھا اور اس لئے دار العلوم کا پورے عالم اسلام پر احسان ہے۔ توحید کے عقیدہ، اتباع سنت اور اعتدال کے طریقے کو محفوظ رکھا۔ دار العلوم ان حضرات واکابر کا مرکز رہا جن کو آپ بھی جانتے ہیں۔

حضرت مولانا نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ اور کتنے بزرگ ہیں کہ جنہوں نے یہاں پر اس ہدایت کے پھیلانے اور دین کی اشاعت میں عظیم خدمات سرانجام دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دار العلوم ایک مکتبِ فکر کا نام نہیں اور حقیقت میں اشاعتِ اسلام کا جذبہ ہے اور اس جذبہ کا نام دار العلوم ہے۔" (ترجمان اسلام، ص ۵۲۹)

اسلامی نظام کی ترویج:

۱۴/اگست ۱۹۷۲ء یوم آزادی کے موقع پر ریڈیو پاکستان سے وزیر اعلیٰ سرحد کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

" آج کے دن یہ ضروری ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں کا جائزہ لیں اور اس بات کا مصمم ارادہ کرلیں کہ ہم کسی حالت میں بھی ان غلطیوں کا اعادہ نہیں ہونے دیں گے۔ جمہوریت ہماری قوت میں شہ رگ کا درجہ رکھتی ہے اور ہم ملک کے سیاسی اور معاشی نظام کو اس وقت تک مستحکم بنیادوں پر استوار کر سکتے ہیں جب ملک میں جمہوریت کی روح جاری وساری رہے۔ ہم نے نفاق کا نتیجہ دیکھ لیا ہے اور اس کی سزا بھی بھگت لی ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم قومی اتحاد کو سب باتوں پر مقدم رکھیں اور قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیں۔ ہمیں اب ضروری مسائل میں الجھنے کے بجائے قومی یک جہتی اور قومی مسائل کو

دیکھنا ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمیں اپنی معاشرتی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ ہم ملک میں اس وقت تک ایک صحیح اسلامی معاشرہ کی تعمیر نہیں کر سکتے جب تک زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی نظام کو رائج نہ کیا جائے۔" (ترجمان اسلام، ص ۵۲۸)

مضبوط اسلامی آئین:

ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

" ہمیں چاہیئے کہ ہم پورے خلوص سے پاکستان کی سلامتی کے لئے اور اس کو بلند و بالا رکھنے کے لئے متحد ہو جائیں اور آئین کے سلسلہ میں تمام اختلافات کو پس پشت ڈال کر ایک پاکستانی کی حیثیت سے مضبوط اسلامی اور جمہوری آئین کے بنانے میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔

میرے عزیز ہم وطنو! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان کو سلامتی، اتحاد، یک جہتی اور پاکستان کو صحیح معنی میں اسلامی ملک بنانے کے لئے میں اور میری جماعت آپ کی خدمت ہر وقت کرتے رہیں گے۔ اس سلسلے میں میری جماعت جمعیت علماء اسلام کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اور انشاء اللہ حق کا بول بالا ہوگا۔"

(ترجمان اسلام، ص ۴۷۷)

علماء کا فرض:

ایک بار ارشاد فرمایا:

" علماء کا فرض ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کا احساس کریں اور عوام کی

اقتصادی الجھنوں کے حل کے لئے کتاب وسنت کی روشنی میں ٹھوس خاکہ پیش کریں۔ علماء منظم ہو کر اور سر جوڑ کر بیٹھیں تا کہ اقتصادی مسائل حل کیے جا سکیں۔ علماء کا فرض ہے کہ زمیندار اور مزارع کے تعلقات و فرائض کو متعین کر کے ایک ٹھوس خاکہ قوم کے سامنے پیش کریں تا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ اسلامی نظام حکومت سے سرمایہ داری کا خاتمہ کیسے ہوگا۔ غریب کاشت کاروں اور مزارعین کے حقوق کی حفاظت کس طرح کی جائے۔"

(مفتی محمود ایک قومی رہنما، ص ۲۰۰)

حضرت مفتی صاحبؒ کے تقاریر و خطبات کے درج بالا اقتباسات میں حضرت مفتی صاحبؒ کی خطابت کا طنطنہ، خلوص، رقت، سوز، سچائی، صداقت اور نصب العین پر یقین محکم پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی دعوت فکر و عمل پر ہزاروں نہیں، لاکھوں انسانوں نے لبیک کہا اور سر بہ کفن ہو کر میدان عمل میں نکل آئے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے ایمانی کردار اور اثر انگیز گفتار سے قرآن وسنت اور اسلامی نظام کے نفاذ کی جو خوشبو دنیا میں پھیلائی ہے اس کی مہک انشاءاللہ کبھی ختم نہیں ہوگی بلکہ روز بروز بڑھے گی، پھیلے گی۔ ان کا کردار زندہ رہے گا، ان کی آواز بلند تر ہوتی رہے گی۔

جگر کے خون سے رخ بے کساں نکھار گئے
عجیب شان سے وہ زندگی گزار گئے

باب : ۹

عزیمت واستقامت، جرأت وبے باکی اور پارلیمنٹ میں نفاذ شریعت کیلئے جدوجہد

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت بڑی ہمہ گیر، عہد آفریں اور انقلاب انگیز تھی۔ آپ گوناگوں خوبیوں، ہمہ جہت صلاحیتوں اور منفرد افکار وخیالات کے مالک تھے۔ آپ کی شخصیت بحیثیت عالم دین، مدرس، محدث، مقرر، فقیہ، خطیب، مفکر ومنتظم، سیاستدان، مربی اور مشفق استاد تمام معاصرین میں مسلّم تھی۔ لیکن یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ ان فضائل وکمالات میں مرکزی اور نمایاں صفت کونسی ہے جس کو حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت کی کلید قرار دیا جائے۔ حضرت مفتی صاحبؒ علم وفضل، جفاکشی وجان فشانی، خلوص وہمدردی، وقار وتمکنت، راست بازی وصداقت، عزتِ نفس اور سلیقہ مندی اور جرأت وہمت کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

اہم جوہری وصف:

لیکن احقر کی کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک جرأت و بہادری اور دوسری استقامت و عزیمت ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے ۔ ہم سب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے لیکن سچ یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا سب سے ڈرتے ہیں ۔ اہم سے اہم اور نازک معاملات میں جب وہ اپنی کوئی رائے قائم کرتے تو کسی خوف ، اندیشہ اور لالچ کی پرچھائیں اس پر نہیں پڑ سکتی تھیں ۔

ہر معاملہ کو کھلے دل سے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان سوچنا اور فیصلہ کرنا اور فیصلہ کر لینے کے بعد اس پر پختگی کے ساتھ جم جانا ہی ان کی فطرت و طبیعت کا خاصہ اور اہم جوہری وصف تھا ۔ ان کی زندگی میں بارہا ایسے موقعے آئے جہاں ان کی جرأت ، حوصلہ اور ثبات فکر و نظر کے لئے بڑی آزمائش درپیش تھیں مگر ان کے کردار میں کوئی تزلزل راہ نہ پا سکا ۔

عزیمت و استقامت:

آپ کی جرأت و بہادری ، حق گوئی اور بے باکی اپنی مثال آپ تھی ۔ مدمقابل کوئی بھی ہو آپ جرأت مومنانہ سے کام لیتے تھے ۔ پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ سے باہر آپ نے ہمیشہ حق بات کہی اور حق کہنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ۔ اس جرم کی پاداش میں آپ پر کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے ۔ آپ کو اسمبلی سے باہر پھینکوا دیا گیا لیکن حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے:

> " میرا ایمان ہے کہ موت اپنے معیّنہ وقت سے پہلے کسی صورت نہیں آ سکتی ۔ جو رات قبر میں ہے وہ باہر نہیں آ سکتی ، جو باہر ہے وہ قبر میں نہیں آ سکتی ۔ "

نڈر اور بے باک داعی:

قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ، حضرت مفتی صاحبؒ کے ولولوں اور حوصلوں کی کہانی سناتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ نڈر اور بے باک مجاہد تھے۔ ان پر کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے لیکن قدرت نے انہیں بچالیا۔ چنانچہ ایک دفعہ متحدہ جمہوری محاذ کی تحریک کے سلسلے میں لیڈروں کا لشکر کراچی سے بذریعہ خیبر میل ملتان کا سفر کر رہا تھا۔ جب ٹرین پانچ گھنٹے تاخیر سے ملتان اسٹیشن پر پہنچی تو اسٹیشن پر لاکھوں انسانوں کا جم غفیر لیڈروں کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ ولی خان، حضرت مفتی صاحبؒ، پیر پگاڑا وغیرہ اسٹیشن پر اترے۔ ملک بھر سے غنڈے، قاتل اور بدمعاش کاروں اور بسوں کے ذریعے دور دراز سے قاسم باغ کے جلسہ کو درہم برہم کرنے کے لئے بلائے گئے۔ سانپ اور بچھوؤں کی گٹھریاں تک پہنچائی جا چکی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن پر حضرت مفتی صاحبؒ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے اس وقت کے طالب علم مولوی حفیظ جھنگوی نے مجھے اور بہت سے جماعتی دوستوں کو اپنا وہ کرتا دکھایا جو اس کے دائیں بازو کی سائیڈ سے پھٹا ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ جب حملہ آور نے خنجر سے حضرت مفتی صاحبؒ پر حملہ کیا تو مفتی صاحبؒ گاڑی سے اتر کر بمشکل اسٹیشن پر اترے۔ دوبارہ تقریر کے لئے انہیں بلایا گیا تو جونہی وہ تقریر کے لئے ڈبے کے اندر چڑھنے لگے تو حملہ آور نے خنجر سے حملہ کر دیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ حملے کی زد سے بچ گئے۔ اس کا وار مولوی حفیظ کے دائیں بازو پر پڑا جس سے

اس کا کرتا پھٹ گیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ حملہ آور کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا گیا۔ جونہی محاذ کے کارکن پکڑنے کے لئے اس پر جھپٹے پولیس اسے بچا کر لے گئی اور اسے چھوڑ دیا گیا۔ یہ خبر اخبارات وغیرہ کو بھیجنے کے باوجود شائع نہ ہو سکی۔ ڈر اور خوف تو حضرت مفتی صاحبؒ کے قریب سے بھی نہیں گزرتا تھا۔ آپ دین اسلام کے مخلص، نڈر اور بے باک داعی تھے۔ دھونس، دھمکیاں اور قاتلانہ حملے آپ کے عزم وہمت اور ترویج شریعت کی جدوجہد میں رکاوٹ نہ بن سکے۔" (ترجمان اسلام، ص ۱۳۷)

عزم وہمت کا ہمالہ:

امروٹ شریف کے سجادہ نشین عظیم روحانی پیشوا حضرت مولانا سید محمد شاہ امروٹیؒ کا حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ بہت وقت گذرا۔ موصوف حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں اپنی دیرینہ یادیں تازہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" ۱۹۷۵ء کا زرد موسم تو آپ کو یاد ہو گا جب تحصیل سجاول (سندھ) جاتے ہوئے راستے میں حضرت مفتی صاحبؒ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ جمعیت علمائے اسلام صوبہ سندھ کے صدر ہونے کی حیثیت سے میں ان کے ساتھ ہی کار میں بیٹھا تھا کہ ہم سے آگے جانے والی پائلٹ جیپ اچانک رک گئی اور سڑک کے دونوں جانب کھڑے کئے گئے افراد نے فائرنگ شروع کر دی۔ ایک گولی پائلٹ جیپ میں بیٹھے ہوئے مولانا قاری عبداللہ صاحب کے پاؤں میں لگی۔ دفعتاً ایک بڑی بڑی مونچھوں والا کلہاڑی بردار شخص ہماری طرف بڑھا اور کار کی ونڈ سکرین پر کلہاڑی سے وار کیا۔ ونڈ سکرین ریزہ

ریزہ ریزہ ہوگئی، پر خدا کے فضل سے حضرت مفتی صاحبؒ کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ ان غیر متوقع اور خطرناک حالات سے میرا دل اس زور سے دھڑکنے لگا کہ اس کی دھڑکن میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ میری گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ یہ ناخوشگوار واقعہ ہمارے صوبہ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ مہمان نوازی سندھ کا طرہ امتیاز ہے، دل میں خدشہ جاگا کہ خدانخواستہ حضرت مفتی صاحبؒ کو کچھ ہوگیا تو ہم اپنے ضمیر اور اہل پاکستان کو کیا جواب دیں گے؟ لیکن مفتی صاحب کے چہرے پر پریشانی یا خوف کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ بالکل نارمل تھے، گویا کچھ ہوا ہی نہیں یا جو کچھ ہوا اس کے لئے وہ پہلے سے متوقع اور تیار تھے۔ رات کے وقت تحصیل سجاول میں پروگرام کے مطابق جلسہ ہوا۔ آپ یقین کیجئے کہ حضرت مفتی صاحبؒ میں وہی حوصلہ، وہی ہمت، وہی عزم اور وہی جوش وخروش تھا۔ مقصد کی صداقت کا یقین اور اللہ پر ایمان ہو تو یہ ساری متذکرہ خوبیاں تیز دھار ہو جاتی ہیں۔ قاتلانہ حملے کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ جس مکان میں ٹھہرے، حکومت کی جانب سے اس پر پولیس متعین کردی گئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے پولیس کے سربراہ سے کہا مجھے پولیس کی حفاظت کی کوئی ضرورت نہیں۔ گویا ....

یہ جان تو آنی جانی ہے
اس جان کی تو کوئی بات نہیں

پھر ایک اور بااختیار پولیس آفیسر آئے اور کہا: "اگر آپ F.I.R درج کروانا چاہیں تو کروا دیں"۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے کہا: "F.I.R درج کروائی تو ان کے خلاف کرواؤں گا جو اس حادثہ کے پس منظر میں ہیں۔ یہ فائر کرنے اور کلہاڑی چلانے والے تو بیچارے محض "حکم کے پتے" ہیں۔ ان کے خلاف شکایت درج کروانے کا کیا فائدہ؟؟" (ترجمان اسلام، ص ۱۵۵)

کوہِ استقامت:

شیخ الحدیث مولانا عبدالسلام صاحب حضرو رقم طراز ہیں:

" جامع مسجد تعلیم القرآن راولپنڈی تحریک نظام مصطفیٰ کا مرکز ہے۔ احتجاجی جلسے، گرفتاری کے لئے نکلنے والے جلوس اور لانگ مارچ کا مرکزی مقام یہی مسجد بنتی ہے۔ اس کے خطیب شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ ملک کی ممتاز مذہبی شخصیت ہیں۔ تحریک کے دوران مسلح غنڈے مسجد پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ مسجد میں اینٹوں کی بارش برسائی جاتی ہے، نمازی اور طلبہ زخمی ہوتے ہیں۔ تمام طلبہ کو پولیس گرفتار کرتی ہے۔ غنڈے مسجد کے شیشے توڑنے کے بعد دارالعلوم کی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں، سامان اور دفتر کے دروازے توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔

دارالعلوم تعلیم القرآن کے طلبہ کی گرفتاری کے بعد دارالعلوم ویران ہے۔ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ ڈسٹرکٹ جیل جہلم سے راقم التحریر اور مولانا محمد صابر صاحب صدر مدرس جامعہ اشاعت الاسلام حضرو کو حکم فرماتے ہیں کہ ہم دونوں اپنے ساتھی طلبہ کو لے کر دارالعلوم تعلیم القرآن میں اس وقت تک تدریسی کام کریں جب تک تحریک کسی کنارے تک نہیں پہنچتی۔

بیس پچیس دن ہم دارالعلوم میں گزارتے ہیں۔ عوام تو عوام علماءِ کرام بھی حالات کی نزاکت کی وجہ سے مایوس ہیں۔ ہر شخص جان و مال اور آبرو کے تحفظ میں پریشان ہے۔

اتنے میں ہمیں یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ قائد تحریک نظام مصطفیٰ، قائد قومی اتحاد حضرت مولانا مفتی محمودؒ سہالہ ریسٹ ہاؤس سے رہا ہو کر جامعہ اسلامیہ راولپنڈی تشریف لا چکے ہیں۔ ہم دونوں حاضر ہوتے ہیں۔ استقامت واستقلال کا پہاڑ کمالِ استغناء سے کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ ملاقات پر فرمایا کہ جیل میں علماء کرام اور لیڈروں کی ملاقات کے بعد ابھی دارالعلوم تعلیم القرآن آتا ہوں۔ عصر کے بعد جیل جانے کے بعد پہلی مرتبہ آپ دارالعلوم تعلیم القرآن تشریف لاتے ہیں۔ راجہ بازار میں مفتی اعظمؒ کی اچانک آمد سے ہزاروں کی تعداد میں عوام دارالعلوم کے صحن میں پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ تشریف فرما ہوتے ہیں، مدینہ مارکیٹ کے ایک تاجر جامع مسجد تعلیم القرآن کی دردناک داستان ظلم جو پیپلز پارٹی کے ہاتھوں ہوئی، سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تو یہ منظر دیکھ کر روتے تھے۔ مفتی اعظمؒ جن کے ہاں مسکرانا ہے، یہ سن کر انتہائی جلال میں فرماتے ہیں:

"روتے کیوں تھے، روتی تو عورتیں ہیں، مرجاتے جو مَردوں کا شیوہ ہے۔"

مایوسی، پریشانی اور سراسیمگی کے حالات میں حضرت مفتی اعظمؒ کے یہ گرجدار الفاظ سن کر تمام سامعین حیران تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے

تھے کہ اس کو اِ استقامت میں کتنا حوصلہ ہے، کیسا دل ہے، کتنی ہمت ہے اور کیسی مردانگی ہے۔" (ترجمان اسلام، ص ۲۶۵)

گولیوں کی بوچھاڑ میں:

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

" بھٹو کے دورِ حکومت میں راولپنڈی میں قومی اتحاد کا عظیم الشان جلسہ تھا، جمعہ کی نماز کے بعد ہم حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ گاڑی میں جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں لوگوں نے جمعیت کا جھنڈا دیکھ کر مفتی صاحبؒ کی گاڑی رکوائی اور کہا کہ جلسہ گاہ کی طرف مت جائیں، وہاں گولیاں چل رہی ہیں۔ لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے اِسے دشمن کا پروپیگنڈہ کہا اور کچھ آگے گئے تو مولانا عبدالحنان جہانگیرہ والے کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی جلسہ گاہ جانے سے روکا کہ وہاں تو آگ لگی ہوئی ہے۔ مفتی صاحبؒ نے صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے گاڑی کو واپس موڑنے کا حکم دیا۔ اس اثنا میں مفتی صاحبؒ کی گاڑی پر فائرنگ بھی ہوئی لیکن اللہ نے سب کو بچالیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ، مولانا قاری سعید الرحمٰن کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ فون پر رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ ولی خان اور دوسرے لیڈر چلے گئے ہیں، سٹیج کی صورتِ حال معلوم کی اور دوبارہ جلسہ گاہ روانہ ہوگئے۔ سٹیج پر پہنچے اور عوام سے خطاب کیا۔

لوٹ آئے جتنے فرزانے گئے
تا بہ منزل صرف دیوانے گئے

فرمایا: ہم آگ کا دریا عبور کر کے یہاں پہنچے ہیں اور اپنی آنکھوں سے کربلا کا منظر دیکھا ہے، لیکن یہ ہتھکنڈے ہمیں اپنے مقاصد سے نہیں ہٹا سکتے۔

مذہب وسیاست کا حسین امتزاج:

حضرت مفتی صاحبؒ کے سیاسی دور میں ان کے تاریخی کردار کے لاتعداد تابناک پہلو اور روشن مثالیں مشاہدہ میں آئیں جن کے تفصیلی بیان کیلئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اسلامی معیار کے عین مطابق صحیح معنوں میں دینی رہنما یعنی بیک وقت ایک عظیم مذہبی سکالر اور اعلیٰ ترین سیاسی مدبر تھے۔ جبکہ آج یہ صفات مفقود نظر آتی ہیں۔ اگر کوئی مذہبی رہنما ہے تو سیاسی بصیرت مفقود ہے اور اگر سیاسی رہنما ہے تو مذہب سے بے بہرہ۔

روٹی مانگنا جرم نہیں:

حضرت مفتی صاحبؒ کی سیاسی بصیرت کی ایک روشن مثال ملاحظہ ہو:

" نعرے لگانے والے عوام کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا رہا تھا، یعنی عوام کی مشکلات، تکالیف، صعوبتوں اور مسائل سے نظر چرائی جا رہی تھی اور ان کو کافر قرار دیا جا رہا تھا۔ گویا بے گناہ اور غریب مسلمانوں کے مسائل کا حل ان کے کافر بنانے میں مضمر تھا۔ تمام سرمایہ پرست مولوی اپنے اور دیگر سرمایہ داروں کے تحفظ کے لئے کافر سازی کے بہانے اور فتووں کی تلواریں سونپ کر میدان میں نکل آئے تھے۔ ایسے میں ان کے مقابلے میں دین

اسلام کی ایک ہی آواز اٹھی اور وہ مولانا مفتی محمودؒ کی آواز تھی۔ انہوں نے کہا کہ: "روٹی مانگنا کوئی جرم نہیں اور نہ ہی کپڑے اور مکان کا نعرہ لگانا شرعی حیثیت سے گناہ ہے۔" یوں غریب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کمیونزم کی گود میں جانے سے بچ گئی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا موقف یہ تھا کہ جو لوگ اقتصادی نظریات کی حد تک سوشلزم کا لفظ استعمال کرتے ہیں انہیں کافر نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ جب اس مسئلہ پر ایک سو تیرہ مفتیوں کا فتویٰ کفر شائع ہوا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے اس فتوے پر دستخط نہیں کئے بلکہ اس فتویٰ کو سیاسی فتویٰ قرار دیا جس سے ملک کے پسے ہوئے طبقہ مزدوروں اور کسانوں کی نگاہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں بڑا احترام پیدا ہوا۔"

تابناک تاریخی روایات:

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت کا سیاسی پہلو بڑا تابناک اور شاندار تاریخی روایات کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ آپ نے اس وقت سیاست کی ذمہ داری میں قدم رکھا جب علماءِ دین کو ملک کی سیاست سے بے دخل کر کے محض مساجد، مدارس اور خانقاہوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بے سروسامانی کی حالت میں سیاست میں قدم رکھا اور سیاست میں علماءِ حق کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم کرایا بلکہ ثابت کر دیا کہ علماء ہی اس ملک کو صحیح خطوط پر چلانے کے اہل ہیں اور علماء سے زیادہ مدبّر اور منتظم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

آمریت کے خلاف پہلی بغاوت:

حضرت مفتی صاحبؒ جب قومی اسمبلی کے ممبر بنے تو قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں رسم حلف وفاداری کے موقع پر ہی صدر ایوب خان کے غیر جمہوری، غیر اسلامی اور آمرانہ دستور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور حلف کے اس جملہ کے بعد " دستور کو باقی اور قائم رکھوں گا" ان الفاظ کا اضافہ کیا:

> " اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس کو جوں کا توں قائم رکھیں گے بلکہ اس دستور کے دیئے ہوئے اختیارات کو بروئے کار لا کر اُن جملہ خرابیوں اور خامیوں کی جو کہ کتاب وسنت یا جمہوری لحاظ سے اس میں ہوں گی، اس میں ترمیم کریں گے۔ "

حضرت مفتی صاحبؒ کے یہ الفاظ حلف کی کاروائی میں باقاعدہ درج ہوئے۔ اس معمولی سی کارروائی سے حضرت مفتی صاحبؒ کی نکتہ آفرینی، سیاسی بصیرت اور دوراندیشی کا اظہار ہوتا ہے۔ قومی اور ملکی مسائل پر آپ کی سوچ کی گہرائی اور وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

عائلی قوانین کے خلاف احتجاج:

صدر ایوب خان کے دور میں جب مسلم فیملی لا آرڈی نینس کا اجراء ہوا تو قومی اسمبلی میں حضرت مفتی صاحبؒ نے قرآن وسنت کے ناقابل تردید حوالوں سے عائلی قوانین کو خلافِ اسلام ثابت کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی تقریر سے سب نمائندگان ایوان نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ یہ قوانین اسلام کے صریح خلاف ہیں۔

قانون وراثت پر معرکۃ الآ راء بحث:

قومی اسمبلی میں حضرت مفتی صاحبؒ کی فاضلانہ، عالمانہ اور دلائل و براہین سے آراستہ معرکۃ الآ راء تقریر کی ایک جھلک نذر قارئین ہے:

"عام طور پر لوگوں کے اذہان میں لاشعوری طور پر یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مولوی سیدھے سادے لوگ ہیں، انہیں سیاست سے کیا کام؟ سیاست تو دھوکے اور فریب کا میدان ہے۔ ہوسکتا ہے موجودہ دور کی سیاست کا یہ مفہوم ہو لیکن علماء کی سیاست دھوکے کا نام نہیں بلکہ دین حق کی خدمت، عوام الناس کی خیر خواہی اور ملک کی بہتری سے عبارت ہے۔"

حضرت مفتی صاحبؒ جب قومی اسمبلی کے سٹیج پر علمی، مذہبی، سیاسی، پارلیمانی اور قومی و ملی امور پر گفتگو فرماتے تو دلائل کا انبار لگا دیتے تو بزعم خود پڑھا لکھا طبقہ انگشت بدندان ہوتا۔ قومی اسمبلی میں پرانے پارلیمنٹرین ان کے دلائل سے دم بخود ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب رقم طراز ہیں:

"غالباً ۱۹۵۶ء کی بات ہوگی کہ حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ ایک ایسی رپورٹ تیار کرے جس میں عورتوں کے وہ حقوق محفوظ ہو جائیں جو اسلام نے انہیں دیے ہیں، لیکن جن لوگوں کے ذمے یہ کام لگایا گیا انہیں اسلام کے بارے میں مطلوبہ علم نہیں تھا۔ چنانچہ جب اس نے رپورٹ تیار کرلی تو کمیشن کے واحد عالم رکن مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس پر اختلافی نوٹ لکھا۔ اس طرح وہ رپورٹ التوا میں پڑ گئی، لیکن

۱۹۵۸ء کے بعد قائم ہونے والی فوجی حکومت نے ایک آرڈی نینس کے ذریعے اس رپورٹ کے بعض حصے نافذ العمل قرار دے دیے۔ مفتی صاحبؒ کی تقریر کا موضوع اسی آرڈی ننس اور اس کی دفعات تھیں۔ مفتی صاحبؒ نے سوال کیا:

"جناب والا، اس آرڈی ننس کی پہلی دفعہ وراثت سے متعلق ہے جس میں طے کیا گیا ہے کہ کسی لڑکی یا لڑکے کا باپ سے پہلے انتقال ہو جائے تو ان کو باپ کی اسی قدر وراثت کا حصے دار تصور کیا جائے گا جو انہیں زندہ ہونے کی صورت میں ملتی۔ پھر وراثت کا یہی حصہ ان کی اولاد کو منتقل کیا جا سکے گا۔

سب سے پہلی غلطی یہ ہے کہ اس دفعہ کے ذریعے اسلامی وراثت کا مفہوم ہی بدل دیا گیا ہے۔ وہ وراثت رہی ہی نہیں، از روئے لغت وارث زندہ شخص کو کہتے ہیں جو مرے ہوئے شخص کے ترکے سے حصہ لیتا ہے لیکن آپ کا قانون وراثت مُردہ کو وارث قرار دیتا ہے جو انسان سے حصہ لینے کا مجاز ہے۔ کیا آپ دنیا کے کسی ملک کے قانون سے اس کی مثال پیش کر سکتے ہیں؟

اس قانون کے مندرجات خلافِ اسلام ہی نہیں، خلافِ عقل بھی ہیں۔

اس میں ایک مُردہ شخص کو مفروضے کے طور پر زندہ تسلیم کیا جاتا ہے، پھر اسے وارث بنا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے دو بیٹے ہیں جنہیں آپ خالد اور بکر سمجھ لیں۔ بکر اپنے باپ زید سے پہلے فوت ہو جاتا ہے اور خالد زندہ ہے۔ اس قانون کی رُو سے وراثت کی تقسیم کے وقت پہلے تو بکر کو زندہ تصور کیا جائے گا اور اُسے خالد کے برابر حصہ ملے گا، پھر فوراً ہی اسے مُردہ تصور کر کے

اس کا تمام حصہ اِس کی اولاد کو منتقل کر دیا جائے گا۔ اس طرح اس قانون نے جتنا حصہ زید کے بیٹے کو دیا اتنا ہی زید کے پوتے کو بھی دیا۔ یہ قرآن وسنت کی تقسیم کے خلاف ہونے کے علاوہ عقل ومنطق اور قوانین عالم کے بھی بالکل خلاف بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت ایسا کر کے اسلام کے سوا کسی اور دین اور پاکستان کے سوا کسی اور ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے؟

اگر ایک شخص کو مرنے کے بعد پہلے زندہ اور پھر مُردہ تصور کرنا ضروری ہے اور صرف اس لئے کہ اس کی اولاد کو اس کے باپ کی وراثت کا حقدار قرار دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس قانون میں صرف یتیموں سے کیوں ہمدردی ظاہر کی گئی ہے، متوفی کی بیوہ اور ماں کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے؟ اس فرضی ضابطے کو صرف اولاد ہی نہیں، تمام ورثا میں نافذ ہونا چاہیئے تھا۔ کیا دنیا کے کسی بھی قانون میں اس قدر اندھیر نگری دکھائی جاسکتی ہے؟

پھر اس قانون کو بناتے وقت اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا کہ جس طرح باپ کے مرنے سے بیٹا وارث بنتا ہے اسی طرح بیٹے کے فوت ہونے سے باپ کو بھی وراثت منتقل ہو جاتی ہے۔ جب زید کا بیٹا بکر فوت ہو گیا تو باپ خود بخود اس کا وارث بن گیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے اور کیسا انصاف ہے کہ باپ کو محروم کرنے کے لئے مرے ہوئے بیٹے کو خیالی طور پر زندہ کیا جائے، پھر اُسے وراثت دی جائے، پھر اُسے فرضی طور پر مار کر یہ وراثت اس کی اولاد کو منتقل کر دی جائے۔ مسلمان قرآن وسنت پر عمل کریں یا ان مستشرقین کے خیالات اور مفروضوں پر؟

میں کہوں گا کہ یہ قانون غلط ہی نہیں، خلافِ عقل اور نا قابل عمل بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص مرجاتا ہے جس کا نام زید ہے، اس کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکا زید کی زندگی ہی میں مرجاتا ہے لیکن اس لڑکے کی ایک بیٹی موجود ہے، یعنی ایک زید کی بیٹی اور ایک پوتی۔ اب اس قانون کی رُو سے وراثت کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ مرے ہوئے لڑکے کو زندہ تصور کر کے دو حصے دیے جائیں گے۔ ایک حصہ لڑکی کو ملے گا جو اس کی بہن ہے، پھر لڑکے کے یہ دونوں حصے اس کی بیٹی یعنی زید کی پوتی کو دیے جائیں گے۔ اس صورت میں مورث کی بیٹی کو تو ایک حصہ ملا لیکن پوتی دو حصوں کی حقدار بن گئی۔ یہ انصاف نہیں، ظلم ہے!

علاوہ ازیں قرآن کریم نے تقسیم وراثت کا جو اصول بتایا ہے، یہ قانون اس کی بھی نفی کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: "والدین اور قریبی رشتہ داروں کے مال میں مردوں کا حصہ ہے۔"

قرآنی اصول کے مطابق پہلا حق قریب کا ہے، اس کے بعد بعید کا۔ ہر اقرب، ابعد کو محروم کر دیتا ہے لیکن اس قانون میں اقرب کو محروم کر کے ابعد کو وارث بنایا جاتا ہے جو قرآن، قانون، اخلاق اور عقل و فطرت کے بھی خلاف ہے۔ ایک اور مثال بھی قابل غور ہے۔ ایک شخص کے دو لڑکے ہیں، ایک لڑکا تو اس کی زندگی میں مرگیا۔ اس مرے ہوئے لڑکے کی ایک لڑکی بھی ہے۔ اس موجودہ قانون کی رُو سے باپ کے مرنے کے بعد مال دو حصوں میں تقسیم ہوگا۔ ایک حصہ لڑکے کو ملے گا اور دوسرا اس کے بھائی کی لڑکی کو۔ اس طرح

مورث کا حقیقی بیٹا اور پوتی برابر حصوں کے مالک ہوں گے۔ اگر انصاف اس کا نام ہے تو پھر مجھے بتایا جائے کہ ظلم کسے کہتے ہیں؟"

اس موقع پر وزیر صحت نے سوال کیا: مفتی صاحب! اگر دو برابر حصے کر دیے جائیں تو اس میں کیا حرج ہے؟

حضرت مفتی صاحبؒ نے جواباً کہا اس میں صرف یہ حرج ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کا حکم ہے، اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے دلائل کے حق میں مذاہبِ اربعہ کے علاوہ فقہ جعفریہ سے بھی حوالے پیش کئے۔ اس طرح حضرت مفتی صاحبؒ نے ہر فقہ کی نمائندگی کر کے اپنی علمی اور پارلیمانی حیثیت کا لوہا منوایا۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۵۷)

علاوہ ازیں نکاح کی رجسٹریشن، تعدد ازدواج، عورتوں پر ہونے والے مظالم، طلاق، عدت اور نابالغوں کے نکاح جیسے مسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی اور حضرت مفتی صاحبؒ نے اس زوردار انداز سے عائلی قوانین کے تار و پود بکھیرے کہ ایوب حکومت اور اس کے حواری ششدر رہ گئے۔

تحریک ختم نبوت:

۱۹۷۲ء میں جب تحریک ختم نبوت چلی تو اسمبلی کے اندر مسئلہ ختم نبوت کا کیس حضرت مفتی صاحبؒ نے لڑا۔ دن رات محنت کرتے، عوام سے رابطہ رکھتے، لاکھوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے اور قومی اسمبلی کے اندر مرزا ناصر پر گرفت کرتے۔ بالآخر چودہ دن کی جرح کے بعد قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم قرار دیا

تحریک ختم نبوت میں حضرت مفتی صاحبؒ کا کردار اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

تحریکِ نظام مصطفیٰ:

جب ۱۹۷۷ء میں وزیراعظم بھٹو نے الیکشن میں تاریخی دھاندلی کرائی تو اس کے خلاف اور جمہوریت کی بحالی کے لئے تحریک اٹھی جو بعدازاں تحریک نظام مصطفیٰ میں بدل گئی۔ اس کی قیادت بھی حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمائی اور آپ نے جرأت، شجاعت، فراست، معاملہ فہمی سے اس تحریک میں اتنی جان ڈال دی کہ اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل قریب آ گئی لیکن رات کی تاریکیوں میں سیاسی منظر بدل دیا گیا۔ نئی سیاسی صف بندیاں ہونے لگیں اور انتخابات کی تیاریوں کا اعلان کردیا گیا جو ایک الگ داستان ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے ملک کے معاشی، سیاسی، داخلی اور خارجی، معاشرتی، تعلیمی مسائل میں ایک مصلح کا کردار ادا کیا اور پہلی بار سیاست میں ہیرا پھیری کے بجائے سادگی وخلوص، شرافت وصداقت، خدمت اور رائے کے احترام کا فلسفہ متعارف کرایا۔

حب الوطنی:

حضرت مفتی صاحبؒ ایک محبِ وطن شخصیت تھے۔ قاری سعیدالرحمٰن صاحب فرماتے ہیں:

> " ساؤتھ افریقہ کے دورے کے دوران ایک اخبارنویس نے حضرت مفتی صاحبؒ سے انٹرویو کی گذارش کی لیکن آپ نے انکار کردیا کہ ملکی حالات [illegible] بیرون ملک میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، البتہ بین الاقوامی

معاملات پر گفتگو کے لئے تیار ہوں۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۷۴)

سیاست کو بھی عبادت سمجھتے تھے:

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہ اپنے گرامی قدر والد کے بارے میں "بحیثیت سیاستدان" خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

" بحیثیت سیاستدان وہ ایک خاص ڈھب کے انسان تھے۔ سیاسی زندگی میں صبح و شام لوگوں سے ایسے وعدے کئے جاتے ہیں جن کا ایفا غیر ضروری ہوتا ہے۔ لوگ رات کو ایک بیان دیتے ہیں اور صبح اس کے بالکل برعکس ایک نیا بیان موجود ہوتا ہے۔ لیکن حضرت مفتی صاحبؒ کے نزدیک سیاست، عبادت تھی۔ اس عبادت میں جھوٹ کی آمیزش کو انہوں نے ہمیشہ گناہ سمجھا۔ جب وہ سیاست پر اظہار خیال کرتے تو ان کی گفتگو میں کوئی ابہام یا پیچیدگی یا پہیلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جس چیز پر بولتے، کھل کر بولتے۔ جس کی گرفت کرتے، کس کر گرفت کرتے۔ ذاتی حیثیت میں کسی کے دوست تھے نہ دشمن۔ ان کی دوستی بھی خدا کے لئے تھی اور دشمنی بھی خدا کے لئے۔ جب کوئی شخص اسلام کے خلاف لب کشائی کرتا تو اس سے ان کی ٹھن جاتی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا مشن:

وہ ہر بات منہ پر کرتے، پشت پر وار کرنا اور سہنا ان کے نزدیک جائز نہ تھا۔ وہ اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے نظام کو لانے کے روادار نہ تھے اور ان لوگوں کو اسلامی نظام نافذ کرنے کا اہل نہیں سمجھتے تھے جن کی اپنی زندگی اسلام کے خلاف ہے۔ بعض لوگ ان سے کہا کرتے تھے کہ فلاں آدمی ذاتی

حیثیت میں بڑا نیک ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے: " ذاتی نیکیاں اپنی ذات کے لئے ہوتی ہیں، قومی امور کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ آدمی صرف نماز روزے کا دعویدار نہ ہو، وہ دین کے بارے میں اتنا علم رکھتا ہو کہ دین کو دین کی حیثیت میں نافذ کرے۔ اگر دین سے بے خبر آدمی کامل نیک نیتی سے بھی دین کو نافذ کرنے کی کوشش کرے گا تو اپنی کم علمی کے باعث ایسی باتیں اور اقدامات کر گزرے گا جو دین کے بجائے بے دینی کے زُمرے میں آئیں گے۔ علاوہ ازیں دین کے مبلغ اور نافذ کرنے والے افراد کے لئے ان کا عادل و صادق ہونا بھی ضروری ہے۔ جو لوگ عدل سے دور ہوں، ان کا وجود ہی ظلم کی دلیل ہو اور ان کے صدق و کذب میں کوئی فرق نہ ہو، ایسے لوگ اسلام کی بدنامی کا باعث تو بن سکتے ہیں لیکن اسلام کو نافذ نہیں کر سکتے۔ " اسلام کا نفاذ ان کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ وہ ہمیں اکثر ہدایت کرتے رہتے تھے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اپنی زندگی وقف کیے رکھنا، ظلم کو ظلم کہنے سے کسی حال میں باز نہ رہنا۔ حق کی حمایت کرنا اور باطل کے خلاف بھرپور جدوجہد کرنا۔ ہمارے لئے ان کی سب سے بڑی تعلیم اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ ہم اس تعلیم کو ہرگز نہیں بھول سکتے ان کی میراث عدل و انصاف کا پیغام ہے۔ ہم اس پیغام کو تاحیات لوگوں تک پہنچاتے رہیں گے۔ ان کا مشن حق کی سرفرازی و سربلندی تھا۔ ہم اس مشن کو جاری رکھیں گے، اس وقت تک جب تک ہماری رگوں میں خون چلتا اور پہلو میں دل دھڑکتا ہے (انشاء اللہ)۔ " (قومی ڈائجسٹ، ص ۶۲)

حضرت مفتی صاحبؒ کی ساری زندگی اللہ کے دین کے لئے وقف تھی۔ وہ مسجد کے امام تھے، مدرسہ کے مدرس اور مفتی تھے، منبر ومحراب کے خطیب تھے اور میدان سیاست کے شہسوار تھے تو مقصد ایک ہی تھا کہ اللہ کا دین سر بلند اور سرفراز ہو۔

فرمایا کرتے: "میں ایسی سیاست پر لعنت بھیجتا ہوں جو دین کے تابع نہ ہو"

ان کی پوری زندگی شاعر کے اس شعر کی تصویر تھی ....

میری زندگی کا مقصد ترے دین کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں، میں اسی لئے نمازی

باب : ۱۰

حکومت اور حکمت کا حسین امتزاج، منکرات کا سدِّ باب، بلندیٔ اخلاق اور بادشاہی میں فقیری

مغربی مفکرین نے پاک و ہند میں یہ فلسفہ متعارف کرایا کہ سیاست اور مذہب دو الگ چیزیں ہیں۔ مذہب ہر آدمی کا ذاتی معاملہ ہے، اس کو امورِ سیاست میں دخیل نہیں ہونا چاہیئے جبکہ سیاست ریاست کے معاملات سلجھانے اور چلانے کا نام ہے۔ لیکن اسلامی نظام حیات میں مذہب اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے ...... ع

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہمارا مغرب زدہ طبقہ ہمیشہ یہ کہتا رہا ہے کہ مولوی کا سیاست سے کیا کام ہے؟ ان کا کام نمازیں پڑھانا، تقریریں کرنا، جنازے پڑھانا، نکاح پڑھانا، فاتحہ خوانی کرنا اور قرآن خوانی کی محافل سجانا ہے۔ لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے دین و سیاست کے درمیان اس تفریق کو ختم کر دیا۔

محدثِ کبیر استاذی الکریم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ

اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"حضرت مفتی صاحبؒ نے پاکستان میں انگریز کے اس طلسم کو توڑنے کے لئے اپنی جدو جہد کا آغاز کیا تو کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بوریا نشین علماء حکومت کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں اور ایوانِ بالا تک پہنچ سکتے ہیں مگر حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت نے اس تصور کو بالکل باطل کر دیا اور انگریز کے دو صد سالہ اس گمراہ کن پروپیگنڈے کو صرف نو ماہ میں زائل کر دیا کہ علماء حکومت نہیں چلا سکتے۔ ان کا دورِ حکومت ایک درویش، بوریا نشین، مردِ قلندر اور انگریز دشمن انسان کا مثالی دورِ حکومت تھا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں علماء کی بے آبروئی کا بدلہ چکا دیا۔"

جب حضرت مفتی صاحبؒ وزیر اعلیٰ بنے تو مغرب زدہ طبقہ کہتا رہا کہ مولوی کا سیاست سے کیا تعلق؟ ایک مولوی مسجد کا نظام چلانے اور مدرسہ کا اہتمام سنبھالنے میں بھی کمیٹی کا محتاج ہوتا ہے وہ اتنے بڑے ملک اور صوبے کے سیاسی معاملات کو کیونکر چلائے گا جبکہ وہ انگریزی سے بھی نا آشنا ہو۔ گویا انگریزی جاننا حکمران کے لئے بنیادی شرط ہے اور وہ تمام ملک نظم و نسق سے عاری ہیں جو انگریزی سے نا آشنا ہونے کے باوجود آج دنیا کی عظیم طاقتوں میں شمار ہوتے ہیں۔

لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی قابلیت، لیاقت، تدبر اور سیاسی بصیرت سے یہ ثابت کر دیا کہ امورِ مملکت چلانا علماء ہی کا کام ہے۔ علماء انبیاء علیہم السلام کے جانشین ہیں اور یہ جانشینی مسجد و منبر تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔

وزارتِ علیا کی تنخواہ لینے سے انکار:

جب حضرت مفتی صاحبؒ نے صوبہ سرحد کی وزارتِ علیا سنبھالی تو اس وقت آپ ایم این اے بھی تھے۔ فرمانے لگے: "بیک وقت دو تنخواہیں لینا ٹھیک نہیں۔" قومی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے تنخواہ وصول کرتے رہے مگر وزیر اعلیٰ کی تنخواہ لینے سے انکار کر دیا۔

قیمتی بنگلہ بھی ٹھکرا دیا:

وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کے لئے الگ شان دار بنگلے کا اہتمام کیا جانے لگا (جس کا کرایہ اس زمانے میں چار ہزار روپے ماہوار تھا) تو انکار کر دیا اور فرمایا: "ایک غریب صوبہ کے وزیر اعلیٰ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اتنے شاندار بنگلے میں رہائش پذیر ہو۔" شورش کاشمیری مرحوم نے حضرت مفتی صاحبؒ کے مستعفی ہونے کے بعد کہا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی وزارتِ پر ذاتی منفعت کا کوئی داغ نہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے صرف نو ماہ کے دور وزارتِ علیا میں ثابت کر دیا کہ علماءِ کرام حزب اختلاف اور حزبِ اقتدار دونوں میں رہ کر ہوشمندانہ اور مدبرانہ سیاست کی پوری صلاحیت و اہلیت رکھتے ہیں۔

نرا مولوی مگر ذہن کے دریچے کھلے رہتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ وزیر اعلیٰ بنے تو مختلف محکموں کے سیکرٹریوں اور اعلیٰ افسران کی ایک میٹنگ بلوائی۔ وہ افسروں سے خطاب کرنے کے علاوہ ان سے بات چیت کر کے ان کے فرائض کی نوعیت، طریق کار اور مشکلات کا

اندازہ لگانا چاہتے تھے۔ بہترین تراش خراش کے عمدہ سوٹوں اور قیمتی کپڑوں میں ملبوس سیکرٹری اور افسر کانفرنس روم میں داخل ہوتے تو وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھک جاتے۔ وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ نے عام دنوں کی طرح موٹے کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ ایک ریشمی رومال سر سے لپٹا ہوا تھا۔ دوسرا ان کے کندھوں پر پڑا ہوا تھا۔ یہ سادگی اور حلیہ دیکھ کر ان افسروں نے سوچا یہ تو واقعی نرا مولوی ہے، اسے اپنے ڈھب پر لانا کیا مشکل ہوگا لیکن جب میٹنگ کی کارروائی شروع ہوئی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا تو انہیں اپنے سارے اندازے اور قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوتی نظر آنے لگیں۔

ایک صاحب نے اپنے محکمے کی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرنی شروع کی تو وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور غور سے اُس کی باتیں سننے لگے۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہ صاحب جوش خطابت میں موضوع سے ہٹ گئے۔ مفتی صاحبؒ نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر کرسی سے ٹکا دیا۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے، جب گفتگو زیر بحث معاملے سے کچھ زیادہ ہی ہٹ گئی تو مفتی صاحبؒ نے اچانک آنکھیں کھولیں اور اپنے قریب بیٹھے چیف سیکرٹری سے مخاطب ہو کر کہا: "میرا خیال ہے ہم زیر بحث موضوع سے کچھ زیادہ ہی دور چلے گئے ہیں۔" یہ اس بے مقصد اور غیر ضروری گفتگو پر بڑی لطیف چوٹ تھی۔ افسر مذکور نے فوراً پینترا بدلا اور اصل موضوع پر باتیں چھیڑ دیں۔ اس چھوٹے سے واقعے سے میٹنگ میں موجود تمام افسروں کو

بخوبی احساس ہو گیا کہ اس شخص کی بظاہر آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن ذہن کے دریچے کھلے رکھتا ہے"۔ (قومی ڈائجسٹ، ص ۴۱)

پرامن اور مثالی دورِ حکومت:

حضرت مفتی صاحبؒ کے دورِ حکومت میں کبھی امن و امان کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ پورے نو ماہ میں صوبہ سرحد کے کسی حصہ میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ نہیں ہوا۔ کسی پر ڈنڈے نہیں برسائے گئے، گولیاں نہیں چلائی گئیں، کسی سیاسی ورکر کا سیاسی قتل نہیں ہوا، کسی کو سیاسی بنا پر جیل نہیں بھیجا گیا۔ الغرض ان کا دور مثالی دور تھا۔ اِکا دُکا اگر بدامنی کے واقعات ہوئے بھی تو حضرت مفتی صاحبؒ نے انہیں ایسے طریقے سے حل کیا کہ مخالفین انگشت بدندان رہ گئے۔

حکومت اور حکمت کی ایک عمدہ مثال:

" لتمبر، کوہاٹ کے قریب ایک مشہور گاؤں ہے۔ وہاں دن دہاڑے سڑک پر ڈاکہ کی واردات ہوئی۔ رپورٹ درج ہوئی۔ پولیس نے کچھ آدمیوں کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا اور انہیں مارا پیٹا بھی۔ کوہاٹ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا نعمت اللہ صاحبؒ (سابق ایم این اے) نے ایک آدمی جس کا تعلق جمعیت سے تھا، اس کی سفارش کی اور کہا ہمارا آدمی بے گناہ دھر لیا گیا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ اُس کی بات سن کر خاموش رہے۔

کچھ عرصے بعد شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہ صاحبؒ دوبارہ پشاور تشریف لائے اور حضرت مفتی صاحبؒ سے اصرار کیا کہ ہمارا آدمی بے گناہ ہے۔ اس بار بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور اُسے ناکام و نامراد لوٹنا پڑا۔ اس چکر میں کئی دن

گزر گئے۔ وہ آتے اور مفتی صاحب ؒ ان کی بات سن کر ٹال جاتے۔ ایک دن اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ حضرت مفتی صاحب ؒ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: میں قسم کھانے کو تیار ہوں، میری بات کا یقین کیجئے، حلفیہ کہتا ہوں کہ ہمارا آدمی بے گناہ ہے، پولیس نے خواہ مخواہ اسے دھر لیا ہے۔

"پھر؟" مفتی صاحب ؒ نے آہستہ سے کہا۔

"پھر حضرت مولانا نعمت اللہ فرمانے لگے: "پھر کیا؟ آپ انصاف کریں اور اُسے رہا کریں۔"

"اللہ کے بندے!" مفتی صاحب ؒ نے کہنا شروع کیا۔ "اس طرح وہ رہا نہیں ہوگا، انتظامیہ نے ایکشن لے لیا ہے، ہم یوں کرتے ہیں کہ اس سارے واقعے کی عدالتی تحقیقات کرا لیتے ہیں۔" اگلے دن انہوں نے اس کے لئے حکم جاری کر دیا۔

عدالتی تحقیقات کرانے کا حکم جاری ہوا تو کوہاٹ کے دو متعلقہ افسران بہت گھبرائے، انہیں اچھی طرح علم تھا کہ مولانا نعمت اللہ کا آدمی فی الواقع بیگناہ پکڑا گیا ہے۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھے کہ عدالتی تحقیقات اور انکوائری کا سلسلہ چل نکلا تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی اور نہ صرف اس شخص کی بیگناہی ثابت ہو جائے گی بلکہ اور کئی انتظامی خامیاں اور کمزوریاں بھی منظر عام پر آ جائیں گی اور ہم سب کو نکو بننا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے بیوروکریسی کے مخصوص انداز میں سوچ سوچ کر ایک کہانی گھڑی اور منصوبہ بنایا کہ کچھ ایسا

چکر چلانا چاہیئے کہ وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ کو اصل حقیقت کا کچھ پتہ ہی نہ چل سکے۔ سیدھا سادا مولوی آدمی ہے، اتنی موشگافیوں اور ہیر پھیر کا اُسے کیا علم؟

آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد ایک دن وہ مفتی صاحب سے ملنے چیف منسٹر ہاؤس پہنچ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بالآخر اصل موضوع پر گفتگو شروع ہوگئی۔ انہوں نے کہا: مفتی صاحب! آپ نے ڈاکے کی واردات کی عدالتی انکوائری کرانے کا حکم دیا ہے، یہ ٹھیک ہے لیکن عرض یہ ہے کہ اس طرح کی انکوائری سے خواہ مخواہ کئی نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ انتظامیہ پہلے ہی خاصی بدنام ہے، لوگ اور بھی زیادہ اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ غرض انہوں نے عدالتی انکوائری کے خلاف طویل تقریر کی۔ مفتی صاحبؒ خاموش بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہے۔ وہ خوش کہ بات بن گئی۔ جب انہوں نے اپنی بات مکمل کرلی تو اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحبؒ نے صرف ایک فقرہ کہا: "ٹھیک ہے اگر آپ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو پھر ہم اس واقعے کی عدالتی انکوائری نہیں کراتے!" ...... افسروں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... ایں! یہ مولوی کیا کہہ رہا ہے؟ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد خاموشی سے وہاں سے کھسک گئے۔ مفتی صاحبؒ نے یہ بات کہہ کر ان کی غلط فہمی دور کردی تھی کہ اس مولوی کو اندھیرے میں رکھ کر بھی کوئی کام کرایا جا سکتا ہے۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۴۵)

معروفات کی اشاعت اور منکرات کا سدّ باب:

قرآن کریم کی سورۃ حج آیت نمبر ۴۱ میں اسلامی حکومت کے نصب العین اور ایک مسلمان حکمران کی صفات و علامات کا جوہر وصفی بیان کرتے ہوئے اللہ رب العالمین نے فرمایا جب ان کو اقتدار ملے گا تو یہ اپنے اقتدار کو ان کاموں میں صرف کریں گے کہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کاموں کی طرف لوگوں کو دعوت دیں اور برے کاموں سے روکیں یعنی معروفات کی اشاعت اور منکرات کا رد ایک اسلامی حکومت کا فرض منصبی ہے۔ زندگی کے جن شعبوں میں خود اللہ تعالیٰ نے اور محمد عربیؐ نے معروفات اور منکرات کو معین کر دیا ہے ان میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے معروف کو منکر یا اس کے منکر کو معروف بنائے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے دورِ حکومت میں معروفات کی اشاعت اور منکرات کی رد میں تن من دھن کی بازی لگا دی تھی۔

تصویر کو کبھی درست اور صحیح قرار نہیں دیا:

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی زرولی خان صاحب فرماتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ ایک دفعہ یہاں جناح ہسپتال میں زیر علاج تھے، بالکل آخری ایام میں تو میرا ایک دوست یہاں جناح ہسپتال میں کام کرتا تھا۔ میں نے ان کو کہا کہ حضرت مفتی صاحب سے ملنا ہے، کیسے ملیں گے۔ انہوں نے کہا کہ شام چھ بجے آپ آجائیں، ہم جب وہاں پہنچے ہمارے مولانا مفتی جمیل خان صاحب بیٹھے ہیں۔ حسن حسین دو بھائی تھے وہ بھی بستر پہ تھے، خدمت کر رہے تھے اور حضرت اقدس حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن

صاحب" سرہانے بیٹھے تھے۔ غالباً وفاق المدارس کے سالانہ کچھ پرچے حضرت کو دکھا رہے تھے، ہم بھی بیٹھ گئے۔ اتنے میں سیڑھیوں پر کچھ لوگ نظر آئے تو مفتی صاحب نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا جی یہ صحافی ہیں اخبارات والے۔ حضرت نے سنتے ہی کہا کہ اللہ خیر کرے۔ ہم نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا کہ یہ بغیر تصویروں کے کام نہیں کرتے۔ میں نے جرأت کر کے پوچھا: آپ بھی تصویر سے منع کرتے ہیں؟ حضرت نے ہنستے ہوئے کہا: **انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ۔ لاحول و لا قوۃ الا باللّٰہ**۔ پھر میری طرف ایسا گرجے اور گرجتے ہوئے دیکھا جیسے شیر بپھر جاتا ہے اور فرمایا عجیب آدمی ہو، تصویر پر بھی کوئی عالم نکیر نہیں کرے گا، یہ کیسے ہوگا اور پھر فرمایا کہ شاید اخبارات میں آپ میری تصویریں دیکھتے ہیں اس سے آپ کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ فرمایا کہ میں نے اس کو کبھی بھی درست اور صحیح نہیں سمجھا ہے۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۲۳۴)

تصویر اور اکابر علماء دیوبند کا وطیرہ:

شریعت اسلامیہ نے جن امور کو ممنوع قرار دیا ہے ان میں جاندار چیزوں کا فوٹو بنانا اور رکھنا بھی ہے۔ محمد عربیؐ کا فرمان ہے جس گھر میں کتا اور تصویر ہو وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ تصویر سازی مطلقاً حرام ہے۔ عوام الناس یہ سمجھتے ہیں کہ فوٹو اگر ممنوع ہوتے تو اکابر علماء دیوبند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ اپنا فوٹو ہرگز نہ بنواتے حالانکہ کسی عالم دین اور بزرگ کا فوٹو شائع ہونے سے یہ خیال کر لینا کہ جس کا

فوٹو ہے اس نے اپنے علم واختیار سے کھنچوایا ہوگا اور اس کے نزدیک فوٹو جائز ہے، ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے اکابر تصویر کا کھنچوانا، رکھنا اور شائع کرنا سب کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ضرورتِ شدیدہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

حضرت مدنیؒ کا ارشاد:

ایک بار شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ نے فرمایا:

" میں نے خود اپنے علم وارادہ سے کبھی فوٹو نہیں کھنچوایا۔ میری لاعلمی میں ایسا ہو جاتا ہے نہ میں اس کو جائز سمجھتا ہوں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔" (مکتوباتِ شیخ الاسلام، ص۲۱۴، ج۴)

مولانا مفتی کفایت اللہ کا ارشاد:

حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب دھلویؒ کے فوٹو انڈیا سے شائع ہونے والے "بدرالاسلام" نامی اخبار میں شائع ہوئے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت نے فرمایا:

" بعض رسائل نے جو ہمارا فوٹو شائع کیا ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارا فوٹو کس نے لیا؟ کہاں لیا؟ اور کب لیا؟ اور ظاہر ہے کہ فوٹو لینے کے لئے صاحبِ تصویر کا علم ضروری نہیں۔ کسی آدمی کا فوٹو اس کی بے خبری میں لیا جاسکتا ہے اور ہمارا فوٹو بھی جس نے لیا ہے، ہماری بے خبری ہی میں لیا ہے۔" (کفایت المفتی، ج۹، ص۲۳۷)

فوٹو کا جواز، فریبِ نفس ہے:

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ فوٹو کی شرعی حیثیت کے متعلق فرماتے ہیں:

" فوٹوگرافی، تصویر سازی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کو تصویر سازی سے الگ کوئی چیز سمجھنا اور بذریعہ فوٹو حاصل شدہ تصویر کو تصویر نہ کہنا ایک بدیہی غلطی ہے اور خالص نفس کا فریب ہے۔ فوٹو کی تصویر، بت یا مورتی اور مجسمہ سب کا یکساں حکم ہے اور یہ سب حرام ہیں۔ "

(فوٹو کی شرعی حیثیت، ص ۱۶)

مفتی صاحبؒ نے اپنی تصویر ضائع کرادی:

حضرت مفتی صاحبؒ بھی اپنے اکابر کے پیروکار تھے اور فوٹو کو ناجائز سمجھتے تھے۔ جمعیت علمائے اسلام کے امیر اور حضرت مفتی صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ اپنے بچپن کی یادیں بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" ۱۹۶۵ء میں جب میں چھٹی جماعت کا طالبِ علم تھا تو والد صاحب کو صدر ایوب خان نے بلایا، ان کا کہیں جانے کا پروگرام تھا۔ وہ اپنا پروگرام ملتوی کر کے اسلام آباد تشریف لے گئے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے والد کو عام لوگ ہی اپنے گھر نہیں بلاتے، ہمارے ملک کا صدر بھی ان کی عزت کرتا ہے۔ اس ملاقات کی تصویر اخبارات میں چھپی تو ایوب خان کے ساتھ والد صاحب کے علاوہ مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور دوسرے افراد بھی موجود تھے۔ میں نے یہ تصویر اخبار سے کاٹ کر اپنی کتاب میں رکھ لی۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں اور بھی بڑے لوگ ہیں جن کی ہمارے

والد کی طرح لوگ عزت کرتے ہیں۔ ایک دفعہ والد صاحب میرا امتحان لے رہے تھے کہ کتاب میں رکھی ہوئی اس تصویر پر ان کی نظر پڑ گئی۔ مجھ سے پوچھا تم نے یہ تصویر کیوں رکھی ہے؟ میں نے جواباً کہا کہ مجھے آپ کی تصویر اچھی لگی اور میں نے کتاب میں رکھ لی۔ کہنے لگے مسلمان بچے تصویریں نہیں سنبھالا کرتے۔ اس تصویر میں غیر لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اس پر ہمارے گھر کی کسی عورت کی نظر پڑی تو بہت گناہ ہوگا۔ مسلمان عورتیں، غیر مردوں کی تصویریں نہیں دیکھا کرتیں۔ میں نے تصویر اسی وقت ضائع کر دی اور مجھے یہ تصویر ضائع کرنے کا کوئی رنج نہیں ہوا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی اچھا کام نہیں۔ مجھے انہوں نے پیار محبت سے اس طرح بات سمجھائی کہ کم عمری ہی میں مجھے دو مسئلے معلوم ہو گئے۔ ایک یہ کہ تصویر رکھنا بری بات ہے اور دوسرے یہ کہ عورتوں کے لئے غیر مردوں کا دیکھنا ہی حرام نہیں، ان کی تصویر دیکھنا بھی حرام ہے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۵۸)

شراب پر پابندی:

حضرت مفتی صاحبؒ نے بحیثیت وزیر اعلیٰ پہلا حکم جو جاری کیا وہ شراب پر پابندی ہے۔ اس حکم کی رُو سے صوبے میں شراب بنانے، پینے، رکھنے اور بیچنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ افسران بالا نے حضرت مفتی صاحبؒ کو بتایا کہ شراب کی فروخت پر عائد ڈیوٹی سے ہر سال ایک کثیر رقم حاصل ہوتی ہے۔ شراب کی بندش سے صوبہ سرحد کو ۴۰ لاکھ روپے سالانہ کی ایکسائز ڈیوٹی کا خسارہ ہوگا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب دیا: "خسارہ ہونے دیجئے، میں اپنا حکم واپس نہیں لے سکتا"......

آخرت کا خسارہ برداشت نہیں:

" میرے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد یہاں جتنی شراب پی جائے گی اس سب کا حساب کتاب روزِ آخرت میں مجھ سے لیا جائے گا اور مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔ دنیاوی خسارہ کروڑوں کا منظور ہے لیکن آخرت کا خسارہ منظور نہیں۔"

مرکزی حکومت نے درخواست کی کہ غیر ملکی مہمانوں اور مریضوں کے لئے گنجائش ہونی چاہیے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب دیا:

" جو شے اللہ نے حرام قرار دی ہے وہ انسان کے لئے کیونکر شفا بخش ہو سکتی ہے۔"

جو شراب پئے گا، وزیر نہیں رہے گا:

حضرت مفتی صاحبؒ نے جب شراب پر پابندی کا اعلان کیا تو چند دن بعد ایک دینی جماعت کے پشاور شہر کے امیر کے حوالے سے مشرق اخبار میں یہ بیان چھپا: "ایک تقریب میں صوبہ سرحد کے ایک وزیر نے خود شراب پی، اوروں کو بھی پلائی۔ جب یہ ہوتا ہے تو شراب پر پابندی کا کیا فائدہ؟" حضرت مفتی صاحبؒ نے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

" اگر اس شخص میں اخلاقی جرأت ہوتی تو جب وہ تقریب میں شریک تھا، آخر اس نے دیکھا ہوگا تب بیان دیا ہے۔ یا تو خود شراب پی ہوگی، اگر پی نہیں تو اتنا ضرور ہے اگر اخلاقی جرأت ہوتی تو وہاں کھڑے ہو کر کہتا کہ قانون کی خلاف ورزی کیوں ہو رہی ہے۔ کیوں جرأت نہیں کی؟ میرے پاس شکایت

کرنے کے لئے کیوں نہیں آیا؟ کیا میرے دروازے بند ہیں؟ میرے پاس شکایت کرنے کے لئے آتا۔ میں یقین دلاتا ہوں اگر میرا وزیر شراب پیئے گا تو میرا وزیر نہیں رہے گا۔"

سابق صدر یحییٰ خان پر شراب بند:

اس حوالے سے سرحد کے وزیر اعلیٰ حضرت مفتی صاحبؒ نے مزید کہا:

" ہمارے صوبے میں کوئی شراب نہ تو بیچی جاتی ہے، نہ خریدی جاتی ہے، نہ بنائی جاتی ہے، نہ رکھی جاتی ہے اور اخبارات میں آپ نے پڑھا نہیں کہ سابق صدر یحییٰ خان نے شراب چھوڑ دی۔ ایبٹ آباد میں وہ جو ایک قلعہ میں ایک بنگلہ میں نظر بند ہے اور شاید اس لئے کہ اب اس کو شراب سپلائی نہیں ہوسکتی اس نے شراب چھوڑ دی۔ نتھیا گلی میں ایک باہر کے ملک کے ایک بادشاہ آئے اور نتھیا گلی میں رہے لیکن شراب اس کو نہیں پلائی گئی اور اس بادشاہ نے کہا کہ جب اس صوبہ کے قانون میں شراب بند کر دی گئی ہے تو یہاں پینے کی جرأت نہیں ہونی چاہیئے۔" (ترجمان اسلام نمبر، ص ۵۵۸)

بلا سود قرضوں کا اجراء:

شراب کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ نے جوئے اور سود پر بھی پابندی عائد کر دی اور صوبہ سرحد میں پچھلے تقاوی قرضوں پر سود معاف کر دیا اور آئندہ بلا سود قرضے جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ اس اعلان سے صوبہ سرحد کے زمینداروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ سودی قرضوں نے ان کی معاشی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

اس کے علاوہ جہیز آرڈی ننس اور احترام رمضان آرڈی ننس جاری کر کے اپنی

نیکیوں کی فہرست میں مزید اضافہ کیا۔ علاوہ ازیں تعلیمی اصلاحات کے لئے تسلی بخش اقدامات کئے اور معاشرہ میں مرد و زن کے اختلاط کو کم کرنے کے لئے عورتوں کے لئے پردے کا اہتمام ضروری قرار دیا اور جمعہ کی تعطیل کے لئے مرکزی حکومت سے پرزور سفارش کی۔

سرکاری لباس:

حضرت مفتی صاحبؒ نے صوبہ سرحد کا سرکاری لباس شلوار قمیص قرار دیا تو تمام گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ افسران اسی لباس میں ملبوس نظر آنے لگے۔ لباس بدلا تو سرکاری دفتروں کا ماحول بھی بدل گیا۔ جو لوگ افسروں سے ملنے آتے انہیں بجا طور پر یہ احساس ہوتا کہ وہ جس آدمی سے مل رہے ہیں وہ اپنا آدمی ہے .... ؎

ناز کیا اس پہ کہ بدلا ہے زمانے نے تجھے
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

"بڑا صاحب" کون ہے؟:

حضرت مفتی صاحبؒ کے دورِ وزارت علیا میں آئی جی پولیس اپنے دفتر کے باہر کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے چند ماتحت بھی تھے۔ اتنے میں باہر سے ایک آدمی آیا، اس کے ہاتھ میں کوئی درخواست تھی۔ اس نے اس پر آئی جی کے دستخط کرانے تھے۔ وہ ان لوگوں کو غور سے دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دور جا کر واپس پلٹا۔ اس کی نظریں ان افسروں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان میں آئی جی کون ہے؟ وہاں کھڑے تمام افسروں نے ایک جیسا کرتہ اور شلوار پہن رکھی تھی۔ اس نے ان کے گرد تین

چار چکر لگائے مگر آئی جی کو پہچاننے میں ناکام رہا۔ ظاہری حلیے سے وہ سب ایک جیسے ہی نظر آتے تھے۔ آخر تنگ آ کر ان افسروں کے پاس پہنچا اور کہا اگر برا نہ منائیں تو براہ کرم اتنا بتا دیجئے کہ آپ میں سے سب سے "بڑا صاحب" کون ہے؟ ایک افسر نے آئی جی کی طرف اشارہ کیا اور یوں اس کی مشکل حل ہوئی۔" (قومی ڈائجسٹ، ص۴۲)

تھانیدار کی اذان:

حضرت مفتی صاحبؒ کے دور میں چیف منسٹر ہاؤس کی پولیس گارڈ کا انچارج تھانیدار پانچوں وقت کی نماز کے لئے بڑی باقاعدگی اور اہتمام سے اذان دیتا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ لان میں گھاس پر بیٹھے ہوتے۔ اردگرد کئی ملنے والے عام شہری اور سرکاری افسر بھی موجود رہتے۔ جب فضا میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی تو وزیر اعلیٰ کی اقتداء میں رعایا با جماعت نماز ادا کرتی۔ آج یہ نظارے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہیں۔

جس وقت جس نے چاہا آ جگایا:

حضرت مولانا ضیاء القاسمی فرماتے ہیں:

" جن دنوں آپ وزیر اعلیٰ تھے، میں نے بہت قریب سے دیکھا کہ بڑے مناصب پر فائز لوگوں کے لئے تو ان کے ہاں قواعد وضوابط یار کھا ؤ ہوتا تھا مگر کسی کارکن یا غریب سائل یا عام شہری کے لئے ان کے ہاں کوئی پروٹوکول یا ضابطہ نہیں تھا۔ جس وقت جس نے چاہا آ جگایا۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور عوام کی درخواستوں پر خندہ پیشانی سے آرڈر ہو رہے ہیں اور کوئی آنے والا اس احساس میں مبتلا نہیں ہوتا کہ میں وزیر اعلیٰ سے ملاقات کر رہا

ہوں اور چیف منسٹر ہاؤس میں کھڑا ہوں۔"

تمیز آقا و غلام نہ رہے:

بلکہ بعض اوقات تو میں نے یہ لطیفہ بھی دیکھا کہ باتھ میں تشریف لے گئے اور واپس آئے تو ایک پگڑی باندھے ہوئے پٹھان سائل آپ کی وزارتِ اعلیٰ کی کرسی پر براجمان ہے۔ مفتی صاحبؒ آتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر وہیں بیٹھا رہتا ہے اور مفتی صاحبؒ بیٹھنے کے لئے دوسری کرسی تلاش کرتے ہیں۔ شاہ جہان خان آپ کا سیکرٹری مشکل سے مفتی صاحب کے تشریف رکھنے کے لئے کرسی خالی کراتا ہے مگر مفتی صاحب ہیں کہ برابر مسکرائے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی فرما رہے ہیں کہ میں نے کرسی کو حقیقی معنی میں عوام کے لئے وقف کر دیا ہے تاکہ انہیں تمیز آقا و غلام نہ رہے۔" (ترجمان اسلام، ص ۱۲۰)

درویش وزیر اعلیٰ کی بلند اخلاقی:

حضرت مولانا سید محمد شاہ امروٹی، حضرت مفتی صاحبؒ کی درخشندہ زندگی کے تذکرے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ دوران وزارت بین الصوبائی اجلاس میں شرکت کے لئے ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے اور یوں پہنچے کہ نہ کوئی ساتھی، نہ خادم، نہ باڈی گارڈ، نہ سیکرٹری۔ تن تنہا وزیر اعلیٰ بنفس نفیس، اُن کے بس میں ہوتا تو اپنے سائے کو بھی چھوڑ آتے۔ انہوں نے کراچی کے بعد پھر کوئٹہ جانا تھا۔ مجھے صوبہ سندھ کے امیر ہونے کی حیثیت سے یہ محسوس ہوا کہ ہمارے قائد اکیلے کوئٹے تک کا سفر کریں، یہ نامناسب بات ہے۔ بس یہی سوچ کر میں

ان کے ساتھ ہولیا۔ وہاں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ ان دنوں بلوچستان میں سردار مینگل کی حکومت تھی۔ گیسٹ ہاؤس میں سرکاری کھانا چنے جانے سے کچھ دیر پہلے وہاں کے احباب جماعت نے خواہش کا اظہار کیا کہ مفتی صاحب بلوچستان کی جماعت کی جانب سے کھانا قبول فرمائیں۔ مفتی صاحب نے بخوشی اس دعوت کو منظور کیا اور کہا کہ گیسٹ ہاؤس میں تیار ہونے والا کھانا پولیس اور دوسرے ملازمین کو کھلا دیا جائے۔

وہ ڈرائیور کہاں ہے؟:

جمعیت نے مولانا شمس الدین شہیدؒ کی کوٹھی پر انتظام کیا تھا۔ میز پر کھانا چنا گیا تو دفعۃً مفتی صاحب نے پوچھا کہ: "کار کا وہ ڈرائیور کہاں ہے جو ہمیں گیسٹ ہاؤس سے یہاں تک لایا ہے، اس کو بھی بلالیں۔"

میں نے عرض کیا کہ ڈرائیور باہر ہے، اس کو کھانا پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے اصرار کر کے ڈرائیور کو بلایا۔ وہ آ کر ایک کرسی پر، جو مفتی صاحب سے فاصلے پر تھی، بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے انتہائی شفقت سے ڈرائیور کو مخاطب کیا اور کہا کہ میرے ساتھ والی کرسی پر آ جاؤ۔ یوں سب نے کھانا کھایا۔

ڈرائیور دیر تک حضرت مفتی صاحبؒ کو حیرت سے تکتا رہا کہ آج تک تو ایسے وزراء دیکھنے میں تو کیا، سننے میں بھی نہیں آئے۔ یہ کیسا وزیر اعلیٰ ہے؟ لیکن اسے کون بتلاتا کہ یہ وہ وزیر اعلیٰ ہے جو مسجد کی صفوں پر ہی نہیں دستر خوان پر بھی مساوات کا قائل ہے۔

وزیر اعلیٰ پان کی دکان میں:

اس رات عشائیہ بھی کالعدم جمعیت علماء اسلام کی جانب سے دیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد واپس گیسٹ ہاؤس آنے لگے تو مفتی صاحبؒ کی جیپ کے آگے پائلٹ جیپ تھی، پیچھے آئی جی پولیس کی گاڑی۔ غرض پروٹوکول کا پورا منظر تھا۔ دوران سفر ایک پان کی دکان نظر آئی تو مفتی صاحبؒ نے گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ اب صورت یہ تھی کہ اگلی گاڑیاں تو آگے نکل گئیں اور پیچھے آنے والی گاڑیاں ہمارے ساتھ ہی رک گئیں۔

گاؤں کی کھلی فضا میں:

اچانک درویش وزیر اعلیٰ کی درویشی پوری شدت سے عود کر آئی اور مفتی صاحبؒ کہنے لگے کہ شاہ صاحب! ان گیسٹ ہاؤسوں کے آہنی گیٹوں اور مرمر کی سلوں سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے، مجھے ان سے نجات دلاؤ۔ میں ان کی سنگینی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔ اسی وقت ہی یہ طے ہوا کہ ساتھ والے گاؤں کی کھلی فضا میں جہاں مفتی صاحب کے رشتہ داروں اور عزیزوں کے کچے مکانات تھے، جایا جائے۔ گاؤں میں پہنچے تو آئی جی پولیس کی آنکھ حیرانی کا مرقع بن چکی تھی کہ مفتی صاحب کہاں چلے آئے۔ یہ معلوم کر کے کہ آج مفتی صاحب یہیں قیام فرمائیں گے، آئی جی پولیس نے کہا کہ ہم اسی دیہات میں حفاظتی پہرہ مقرر کر دیتے ہیں۔ میں نے اس بے چارے کو تسلی دی کہ آپ سب لوگ چلے جائیں، ہمیں کوئی خطرہ نہیں، ہم لوگ صبح پروگرام کے مطابق گیسٹ ہاؤس پہنچ جائیں گے۔

وزیر اعلیٰ ایک چادر پر لیٹے رہے:

اب جس مکان میں ہم پہنچے تو وہاں کے مکین مفتی صاحبؒ کو دیکھ کر نہال ہو گئے۔ ایک گھر میں ایک بچے کو اس کے والد نے سکول سے ناغہ کرنے اور تعلیمی عدم توجہی کی پاداش میں زنجیر سے باندھا ہوا تھا۔ مفتی صاحبؒ نے کہا میں نے کراچی میں آ کر سیاسی قیدیوں کو رہا کیا ہے، اب یہاں اس بچے کو آزاد کرتا ہوں اور پھر انہوں نے بڑی شفقت اور محبت سے بچے کو تعلیم کی افادیت سمجھائی اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ اپنی تعلیم پر پوری توجہ دے گا۔

پھر اس رات وہ وزیر اعلیٰ گیسٹ ہاؤس کے نرم گرم بچھونے، ساری راحتیں اور آسائشیں چھوڑ کر زمین پر کپڑا بچھا کر لیٹا رہا ہے اور چشم فلک حیرت سے اس مرد کوہستانی کو تکتی رہی۔" (ترجمان اسلام، ص ۱۵۷)

حضرت مفتی صاحبؒ کے معالج کا بیان:

حضرت مفتی صاحبؒ کے معالج ڈاکٹر سرجن محمد رحمٰن فرماتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ وزیر اعلیٰ سرحد اور قائدِ حزبِ اختلاف ہونے کے باوجود انتہائی سادہ تھے۔ صوفیانہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کی سادگی کا ایک واقعہ مجھے مدتوں یاد رہے گا۔

۱۹۷۷ء میں آپ بذریعہ ہوائی جہاز کوئٹہ جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ آپ پر بیماری کا حملہ ہوا۔ میرے پاس ہسپتال میں فون آیا کہ مفتی صاحب کو دیکھ لیں۔ جب میں اور ڈاکٹر عبد الصمد پہنچے تو انہیں 102 اور 103 درجے کا

بخار تھا۔ دایاں پاؤں سوجا ہوا تھا۔ آپ انتہائی تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے فرمایا: "میں نے کوئٹہ ایک اہم میٹنگ میں جانا ہے، جلدی سے دیکھ لیں۔"

میں ٹیکسی میں آجاؤں گا:

میں نے کہا: "اس حالت میں سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔" اتفاق سے وہ پرواز جس سے آپ نے کوئٹہ جانا تھا، منسوخ ہوگئی۔

میں نے مفتی صاحبؒ کو ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیا اور کہا کہ میں آپ کو اپنے ساتھ ہسپتال لے چلتا ہوں۔

فرمانے لگے: "میرے پاس تو کار نہیں ہے، میں ٹیکسی میں آجاؤں گا۔" یہ مفتی صاحبؒ کی سادگی کی انتہا تھی۔

پرائیویٹ روم کی فیس ادا نہیں کر سکتا:

ہسپتال میں داخلے کے وقت حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "مجھے جنرل وارڈ میں داخل کرنا۔"

میں نے عرض کیا: "کیوں؟"

فرمایا: "میں پرائیویٹ روم کی فیس ادا نہیں کر سکتا، غریب آدمی ہوں۔"

میں نے کہا: "حضرت! آپ ایسے بڑے آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ جنرل وارڈ میں داخل ہوں۔" صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کراچی آئے تو انہوں نے فون کیا کہ مفتی صاحب کے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا جائے نماز:

ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "آپ کو دینے کے لئے میرے پاس آپ کے لائق کوئی چیز نہیں ہے، یہ جائے نماز لے لیں۔"

حضرت مفتی محمودؒ کا دیا ہوا پھٹا ہوا جائے نماز ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے یہ بڑی سعادت ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی جبین مبارک کے سجدوں کے نشان والی جائے نماز میرے حصہ میں آئی۔ قحط الرجال کے اس دور میں جید عالم دین اور راست باز انسان کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ موصوف سے ہماری صرف اڑھائی سال رفاقت رہی۔ اس قلیل عرصہ میں، میں نے موصوف کو جیسا آدمی پایا بیان سے باہر ہے۔

(ترجمان اسلام، ص ۴۵۰)

ان کے پاس اپنی جیپ بھی نہیں:

۱۹۷۷ء کے الیکشن میں جب حضرت مفتی مولانا محمودؒ قومی اتحاد کے سربراہ تھے تو ان کا مقابلہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو سے تھا، اس حیثیت سے بھی کہ ڈی آئی خان میں ان کے مقابلے میں وزیر اعظم بھٹو قومی اسمبلی کے امیدوار تھے اور اس حیثیت سے بھی کہ بھٹو حزبِ اقتدار میں تھے اور وزیر اعظم تھے۔ مولانا مفتی محمودؒ حزبِ اختلاف یعنی قومی اتحاد کے سربراہ تھے اور مستقبل کے متوقع وزیر اعظم تھے۔ احقر کی طالب علمی کا زمانہ تھا، احقر اس وقت درجۂ موقوف میں دار العلوم حقانیہ میں زیر تعلیم تھا۔ استاذی المکرّم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کے محلّہ کی مسجد کے قریب حضرت شیخ الحدیثؒ

کے بھائی کے گھر کے بالاخانہ میں احقر قیام پذیر تھا، دوپہر کو چھٹی ہوئی، قیام گاہ پر آیا اور معمول کے مطابق حاجی عبدالقدوس کی دکان پر نئے اخبار کا مطالعہ شروع کیا تو یہ بات اب تک لوحِ قلب پر نقش ہے کہ روزنامہ نوائے وقت نے اولین صفحہ پر یہ سرخی باندھی کہ:

> " وقت کے وزیراعظم اور مطلق العنان حکمران کے مقابلے میں قومی اتحاد کے سربراہ اور مستقبل کے متوقع وزیراعظم مولانا مفتی محمودؒ انتخاب لڑ رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس اپنی انتخابی مہم چلانے کے لئے اور ملک میں تحریک کی قیادت کرنے کے لئے اپنی ذاتی جیپ بھی موجود نہیں۔ "

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

وزارتِ علیا سے استعفیٰ:

حضرت مفتی صاحبؒ نیپ کے ساتھ ایک معاہدے کی رُو سے صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ بنے۔ جب وزیراعظم بھٹو نے بلوچستان میں نیپ کی حکومت توڑ دی تو حضرت مفتی صاحبؒ نے بھی فوراً استعفیٰ دے دیا۔ حالانکہ اگر وہ استعفیٰ نہ دیتے تو ان پر کوئی جبر نہ تھا بلکہ بھٹو صاحب نے منتیں کیں کہ مفتی صاحب استعفیٰ نہ دو بلکہ آرام سے حکومت کرو۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب دیا ہم نے حکومت مزے اور آرام کے لئے قبول نہیں کی تھی بلکہ یہ عوام کی بہتری اور اصولوں کی پاسداری کا ایک جذبہ تھا۔

استعفیٰ میں تین منٹ:

ارباب سکندر خان خلیل جو صوبہ سرحد کے گورنر تھے، حضرت مفتی صاحبؒ کے

استعفیٰ کی کہانی لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> " مجھے یقین تھا کہ میری گورنری کے دن گنے جا چکے ہیں، اب میں گورنر کے عہدے پر زیادہ عرصہ فائز نہیں رہوں گا۔ چنانچہ میں نے اپنا مختصر سا ساز و سامان تیار کر کے باندھ لیا۔ صبح سویرے نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا کہ ملٹری سیکرٹری کا فون آیا۔ اس نے جھجکتے جھجکتے بتایا: "آپ کے نام ایوان صدر سے ایک خط آیا ہے۔" میں نے کہا: لے آؤ۔ لفافے میں میری برطرفی کے احکام تھے۔ لکھا تھا: اگر میں چاہوں تو دس دن تک گورنر ہاؤس میں قیام کر سکتا ہوں۔ میں نے کاغذ پر دستخط کر کے اُسے واپس دے دیا۔ جب گورنری چھوڑ دی تو پھر دس دنوں تک گورنر ہاؤس میں کیا رکتا۔ مفتی صاحبؒ کی رہائش گاہ گورنر ہاؤس کے قریب ہی تھی۔ میں اپنا سامان اٹھا کر وہاں چلا گیا۔ انہیں اپنی برطرفی کا کاغذ دکھایا۔ ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ بلوچستان حکومت کی برطرفی کی خبر بھی آ گئی۔ مفتی صاحبؒ نے یہ خبر سن کر بے ساختہ کہا: ہم بہت بے غیرت ہوں گے اگر ہم نے استعفیٰ نہ دیا، آخر اس ملک میں جمہوریت کے لئے کچھ تو کرنا ہے۔ ان کے وزیر قانون امیر زادہ اور وزیر اطلاعات محمد افضل بھی وہیں موجود تھے۔ ان سے کہا: لکھو استعفیٰ۔ تین منٹ میں استعفیٰ لکھ کر دستخط کر دیے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ ہم لوگ وزارت اور گورنری پر تین حرف بھیج کر باہر آ گئے۔ (قومی ڈائجسٹ، ۱۰۶)

حضرت مفتی صاحبؒ نے وزارتِ علیا اور قومی اسمبلی کی ممبری کو ایک لمحے کے لئے بھی ذاتی منفعت، مفادات اور اقربا پروری کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اتنے بڑے

منصب پر فائز ہونے کے باوجود کچے گھر میں رہتے رہے۔

کیا حسن نے سمجھا ہے، کیا عشق نے جانا ہے
ہم ایسے فقیروں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

کرسی اقتدار پر تین حرف:

وزارتِ علیا سے استعفیٰ کے بعد جماعتی اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

" میں نے کرسی اقتدار کو لات مار کر عوام کے ہاتھوں سے علماء کی داڑھیوں کو بچالیا ہے۔ میں نے علماء کے وقار کو تحفظ دیا ہے۔ اگر میں بہر طور اقتدار سے چمٹا رہتا تو لوگ کیا کہتے۔ ہمارے اکابرین کا ماضی شاندار اور درخشاں ہے۔ لوگ ان کے متعلق کیا رائے قائم کرتے۔ لوگوں نے ہمارے اکابر کو ہمارے آئینہ میں دیکھنا ہے۔"

محبوبیت ومقبولیت:

" حضرت مفتی صاحبؒ طبقہ علماء میں بھی مقبول ومحبوب تھے اور عوام الناس میں بھی۔ فرمایا کرتے جب میں نے وزارت سے استعفیٰ دیا تو مبارکبادی کے اتنے پیغامات اور تار موصول ہوئے کہ وزیر اعلیٰ بننے پر اتنے پیغامات اور مبارک بادیں موصول نہیں ہوئی تھیں۔

پھر اپنی الیکشن میں کامیابی کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا: میرے لئے ان گنت لوگوں نے، جوانوں نے، بچوں نے، بوڑھوں نے، عورتوں نے اور بچیوں نے دعائیں کیں اور منتیں مانیں۔ کامیابی کے بعد مجھے دیکھنے اور مبارکباد دینے بڑی دور دراز سے ایک بوڑھی اور کبڑی عورت آئی جو لاٹھی کے

سہارے چل رہی تھی اور ایک بکرا بھی ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ کر فرطِ نشاط سے رو پڑی اور کہنے لگی کہ میں یہ بکرا آپ کے لئے لائی ہوں۔ میں آپ کی کامیابی کے لئے رات کو دعائیں مانگا کرتی تھی اور منت مانی تھی اگر خدا تعالیٰ میرے مفتی محمود کو کامیاب فرمائے تو ایک بکرا نیاز دوں گی اور مفتی محمود کو پیش کر دوں گی۔ یہ وہی بکرا ہے، قبول فرمائیے، حالانکہ قبل ازیں میں اس مائی کو نہیں پہچانتا تھا۔"

(ترجمان اسلام، ص ۲۸۴)

اماں جی مرحومہ پر حضرت مفتی صاحبؒ کی خصوصی عنایت:

احقر دسویں جماعت میں تھا کہ ۱۹۷۰ء کا الیکشن ہوا۔ جمعیت علمائے اسلام کے رہنماؤں میں حضرت مفتی صاحبؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی صاحبؒ اور حضرت درخواستیؒ کے علاوہ استاذی المکرم حضرت مولانا قاضی عبدالکریم مدظلہ اور حضرت مولانا قاضی عبداللطیف کے ناموں سے کان آشنا ہوئے۔

ان حضرات نے ہمارے علاقہ (چودھوان) کا انتخابی دورہ کیا تو ان کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ احقر سکول کا طالبِ علم تھا، عمر بھی اتنی نہیں تھی لیکن حضرت مفتی صاحبؒ کی انتخابی مہم کے لئے اپنی بساط تک ہر ممکن کوشش کی، بھاگ دوڑ میں حصہ لیا۔

اس مہم میں اماں جی مرحومہ کی دعائیں بھی میرے ساتھ اور تعاون بھی۔ خواتین میں اماں جی مرحومہ و مغفور حضرت مفتی صاحبؒ کی پولنگ ایجنٹ تھیں اور الیکشن کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے مرحومہ کی بہترین کارکردگی پر انہیں دوپٹہ بھی تحفتاً ارسال

فرمایا تھا۔

قرون اولیٰ کے مسلمان حکمرانوں کی مثال:

حضرت مفتی صاحبؒ کے استعفیٰ کے بعد کراچی کے روزنامہ جسارت نے اپنے اداریے میں لکھا:

" اپنے عہدِ وزارت میں انہوں نے قرن اولیٰ کے مسلمان حکمرانوں کی سی درویشانہ شان کا مظاہرہ کیا۔ اپنی مجموعی سیاسی زندگی میں انہوں نے ایک چیز بہت واضح طور پر ثابت کی کہ قدیم اسلامی طرز کی درسگاہوں کے فارغ التحصیل علماء جدید دنیا کی انتہائی شاطرانہ جمہوری فضا میں حزبِ اختلاف کے پلیٹ فارم سے یا ایوان حکومت کے اندر ہوشمندانہ اور دیانتدارانہ سیاست چلانے کی پوری اہلیت وصلاحیت رکھتے ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ کی شخصیت کے ساتھ علماء، پاکستان میں پہلی بار سیاسی تحریکات پر غالب آئے اور ان کی موجودگی نے سیاست کے انداز، اطوار اور نعرے سب بدل ڈالے اور پھر ان ہی کی قیادت میں برصغیر کی ۸۰ سالہ جدید تاریخ کی سب سے زیادہ پر جوش اور ولولہ انگیز تحریک، تحریک نظام مصطفیٰ چلی اور مفتی صاحبؒ نے وزارت سے استعفیٰ دیکر جمہوریت اور اصول پسندی کی اعلیٰ روایت قائم کی۔"

(ترجمان اسلام، ص ۳۸۹)

حضرت مفتی صاحبؒ کی پوری زندگی ہمارے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی پوری زندگی ہمارے لئے درس ہے۔ ان کی زندگی کا تذکرہ بھی مبارک

ہے۔ اگر ہم ان کا تذکرہ نہیں کریں گے، ان کے کردار و عمل کی باتیں نہیں کریں گے، ان کی تعلیمات کو عام نہیں کریں گے تو ہمارے اندر فکر و عمل کے محرکات کیسے پیدا ہوں گے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی ہمارے لئے تعلیم ہے، فلسفہ ہے، نظریہ حیات ہے اور ان کا کردار ہمیں پکار رہا ہے .... ؎

ہم نے تو دل جلا کے سرراہ رکھ دیا
اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی

باب : ۱۱

لطافت وظرافت، حاضر جوابی علمی مباحث اور لطیف چٹکلے

لطافت وظرافت انسانی فطرت ہے۔ لطیف و پاکیزہ مزاح خود محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ کبھی کبھار آپؐ بے تکلفی سے نہایت لطیف و پاکیزہ مزاح فرماتے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ایک بڑھیا کو مخاطب کر کے فرمایا: "**لا يدخلها عجوز**" (جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہ ہوگی) بڑھیا بہت حیران ہوئی، پریشان ہوئی۔ پریشانی کے عالم میں عرض کیا یارسول اللہ! کیا واقعی بڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی؟ فرمایا: ہاں! بڑھیا جنت میں داخل نہ ہوگی۔ پھر مسکرا کر فرمایا: کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ﴿**اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا**﴾ (ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے اور ہم نے ایسا بنایا کہ وہ کنواریاں ہیں) یعنی جنت میں داخل ہوتے وقت وہ بڑھیاں نہیں رہیں گی بلکہ انہیں نوجوان اور باکرہ بنا دیا جائے گا۔

اسی طرح محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض یافتہ صحابہؓ بھی دل لگی، مزاح

اور خوش طبعی کیا کرتے۔ صحابہ کرامؓ متین ولطیف ظرافت، بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بادشاہ تھے۔ وہ آپس میں ایسا لطیف وپاکیزہ مزاح فرماتے جس سے چہروں پر بشاشت آجاتی۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ اکٹھے اس طرح چل رہے تھے کہ حضرت علیؓ حضرات شیخینؓ کے درمیان میں تھے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے مزاحاً فرمایا: **"علی بیننا کالنون فی لنا"** (علی ہم دونوں کے درمیان ایسے ہیں جیسے لنا کے درمیان نون) یعنی ایک طرف لام اور ایک طرف الف اور درمیان میں نون۔ اس بات سے حضرت علیؓ کے قد مبارک کی طرف اشارہ تھا کہ وہ شیخینؓ کے مقابلے میں پستہ قامت تھے اور شیخینؓ بلند قامت۔ حضرت علیؓ نے برجستہ فرمایا: **"لولا کنت بینکما لکنتما لا "** (اگر میں تمہارے درمیان نہ ہوتا تو تم **لا** ہوجاتے) یعنی کچھ بھی نہ رہتے کیونکہ "لنا" کا "نون" نکل جانے کے بعد "**لا** " باقی رہ جاتا ہے جس کے معنی ہیں "نہیں" یعنی تم میرے بغیر کچھ نہیں۔

گل افشانی گفتار:

صحابہؓ کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ کرام، علماء ربانیین، عارفین، زاہدین، عابدین اور اہل اللہ سب ہی زندہ دل، خوش طبع، لطیفہ گو، بذلہ سنج اور ہنس مکھ رہے ہیں۔

قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ بھی ایک عہد، ایک ادارہ، ایک انجمن اور ایک تاریخ تھے۔ گفتگو طرازی میں ان کا مثیل ملنا مشکل ہے۔ وہ خاص صحبتوں میں بالکل ایک ادیب، ایک فقیر، ایک درویش، ایک متکلم، ایک صوفی، ایک نقاد اور پیکر حکمت وظرافت ہوتے تھے۔ ان میں سے جس تار کو بھی چھیڑ دو، نغمے پھوٹنے لگتے تھے۔ پھر گل افشانی گفتار بہار کی طرح پھیلتی جاتی تھی۔ انہوں [illegible] اکابر کی عقل [illegible]

ذکاوت وذہانت، مزاح وخوش طبعی کے واقعات کے اتنے انبار لگائے اور محفلوں میں سنائے جنہیں اگر مرتب کیا جائے تو اکابر کے لطائف وظرائف کا حسین مجموعہ بن سکتا ہے۔

ہاتھ سے کھانا سنت ہے:

حضرت مفتی صاحبؒ کو اسلاف کے ایسے لطیفے بہت پسند تھے جن میں دقتِ نظر ہو۔ ایک دفعہ فرمانے لگے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ چمچے سے کھا رہے تھے، ایک شخص نے ان سے کہا کہ ہاتھ سے کھانا سنت ہے۔ مولانا سندھیؒ نے فوراً برجستہ جواب دیا: کیا میں پاؤں سے کھا رہا ہوں۔

چند حکیمانہ اور ظریفانہ مرقّعے:

بعض لوگ ظرافت کو شانِ درویشی اور شانِ علم کے منافی سمجھتے ہیں، حالانکہ ہمارے اکابر نے جس طرح عبادت وریاضت کے نمونے دکھلائے اس طرح مزاح وخوش طبعی کے نمونے بھی دکھائے۔ اکابر کی خوش طبعی اور سنجیدگی کی آمیزش لئے ہوئے چند حکیمانہ اور ظریفانہ مرقّعے بھی نذرِ قارئین ہیں۔

تم بھی تو ضعیف ہو:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کانپور میں ایک بڈھے نے پوچھا کہ حضرت وتروں کے بعد **سبحان الملك القدوس** کہنا کیسا ہے؟ حضرت نے فرمایا: ہاں! مسنون ہے، حدیث سے ثابت ہے۔ وہ بوڑھا کہنے لگا حضرت! وہ حدیث تو ضعیف ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ظرافت سے کہا۔ تم بھی تو ضعیف ہو، تم کہاں

کے قوی ہو۔

اب دال:

حضرت تھانویؒ سے عرض کیا گیا کہ فلاں صاحب کو اپنے ابدال ہونے کا خیال ہو گیا ہے۔ فرمایا: ہاں! پہلے گوشت تھے، اب دال ہو گئے ہیں۔

میں تو رسول نہیں ہوں:

ماضی قریب میں ہمارے اکابر میں سے ایک بزرگ اپنی گفتگو میں ایسے چٹکلے بیان کرتے کہ محفل کشت زار بن جاتی تھی۔ دورانِ درس و تقریر کبھی کبھی کوئی لطیفہ سنا دیتے تھے جس کو سن کر بڑے سے بڑے سنجیدہ آدمی کے لئے بھی ہنسی کو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا تھا اور اس سے درسی و علمی اور بعض اوقات ثقیل مضامین کی تفہیم میں شگفتگی پیدا ہو جاتی تھی۔

ایک مرتبہ وہ اڈے پر کسی سواری کے انتظار میں بیٹھے تھے تو چند بریلوی حضرات نے دیکھا کہ یہ دیوبندی عالم ہیں، تو بار بار ان کے سامنے سے گذرتے اور پڑھتے "**الصلوٰة والسلام عليك يا رسول الله**" دو تین مرتبہ جب انہوں نے ایسا کیا تو ہمارے حضرتؒ نے برجستہ فرمایا: بھائیو! آپ لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے، میں تو رسول اللہ نہیں ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو مدینہ منورہ میں آرام فرما ہیں۔

محفل زعفران:

حضرت مفتی صاحبؒ بھی اپنے اکابر کی طرح نہایت خوش مزاج اور لطیف طبع تھے۔ اپنی خاص محفلوں میں خوش رہنا اور خوش رکھنا ان کا خاص مزاج تھا۔ اکثر اپنے ہم

مجلسوں کو لطائف سنایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی محفل زعفران کا اہتمام کرتے۔ اس محفل میں قرون اولیٰ سے لیکر عہد حاضر تک کے بڑے بڑے ظریفوں کے حالات ہوتے، لطائف ہوتے، ظریفانہ اور علمی باتیں ہوتیں، طفیلیوں کے قصے ہوتے، درباریوں کے واقعات ہوتے، بہادروں کی داستانیں ہوتیں، بزدلوں کے حیلے ہوتے، ظریفوں کی تاریخی ستم ظریفیاں ہوتیں۔ بات سے بات نکلتی، لطیفے سے لطیفہ پیدا ہوتا، چٹکلے سے چٹکلہ نکلتا اور محفل میں ایک سرور پیدا ہو جاتا اور یہ بھی تو اکابر کا وطیرہ اور سلفِ صالحین کا معمول رہا ہے۔ ابن جوزیؒ کی لطائفِ علمیہ اس کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

طلبہ سے محبت اور بے تکلفی:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد موسیٰ روحانی البازیؒ اپنے دورِ طالب علمی کی یادیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حضرت مفتی صاحبؒ طلبہ سے انتہائی نرم رویہ رکھتے تھے تو طلباء کرام بھی ان سے محبت، اطاعت، بے تکلفی اور بعض اوقات کھلا مذاق کرتے۔ ایک دفعہ حضرت مفتی صاحبؒ طلبہ سے ناراض ہو گئے، تمام طلبہ نے اکٹھے ہو کر فیصلہ کیا کہ مفتی صاحبؒ کی ناراضگی ختم کرنی چاہیئے اور انہیں منانا چاہیئے۔ تمام طلبہ جمع ہو گئے مگر حضرت مفتی صاحبؒ نہ مانے۔ ہم نے بڑی کوشش کی اور بڑی منت سماجت کی لیکن انہیں بہت غصہ آ گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم نے انہیں اس قدر غضب ناک ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے ساتھ کوئٹہ کا ایک طالب علم عبداللہ جان تھا جو حضرت مفتی صاحبؒ کا رشتہ دار بھی تھا اور مذاق کرنے میں پیش پیش رہتا تھا۔

مفتی صاحب! آپ ہم غریبوں کو کیوں تنگ کرتے ہیں:

"ہم نے اس سے کہا تم ہی حضرت مفتی صاحبؒ کو راضی کرنے کے لئے کوئی ترکیب سوچو ورنہ کم ازکم ایک دو روز اسباق میں بدمزگی رہے گی۔ وہ کہنے لگا فکر نہ کرو، میں نہ صرف انہیں راضی کرلوں گا بلکہ ابھی ابھی انہیں ہنسانے کا بھی بندوبست کرلیتا ہوں۔ وہ ہمارے ساتھ ایک بار پھر حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں گیا۔ خود ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کہے گا، ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں حضرت مفتی صاحبؒ زیادہ ناراض نہ ہو جائیں۔ عبداللہ جان انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولا: "مفتی صاحب! آپ ہم غریبوں کو کیوں تنگ کرتے ہیں، یا تو آپ ٹھیک ہو جائیں، ورنہ ہم ابھی ریلوے اسٹیشن پر جاکر بابو سے کہیں گے یہ شخص ٹکٹ تو ایک آدمی کا لیتا ہے اور جگہ دو تین آدمیوں کی گھیرتا ہے۔" بس پھر کیا تھا، ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ وہ پھر بولا: "آپ کتنے بڑے آدمی ہیں، نہ علم کا حساب ہے، نہ جسم کا، میں نے آپ کا واسکٹ پہنا تو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے چھوٹے بچے نے دادا کا کوٹ پہن لیا ہو۔" مفتی صاحبؒ پہلی ہی بات پر ہنس پڑے تھے، اب ہنستے ہنستے ان کے آنسو نکل آئے اور وقتی طور پر جو ناراضگی ان کے دل میں ہنسی مذاق سے پیدا ہوئی تھی، وہ ہنسی مذاق ہی سے ختم ہوگئی۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۱۸۶)

مجھے تو کونین نہیں ملتی:

مولانا موصوف اپنے دورِ طالب علمی کا ایک دوسرا نہایت دلچسپ واقعہ بیان

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ایک دفعہ طالب علمی کے زمانے میں حضرت مفتی صاحبؒ سے میں نے استدعا کی کہ وہ مشکوٰۃ کی شرح لکھ دیں۔ اس پر فرمایا: " بھئی عجیب آدمی ہو، مجھے کونین نہیں ملتی اور تم مشکوٰۃ کی شرح کی باتیں کرتے ہو۔ " مفتی صاحبؒ کو اس وقت بہت بخار اور نزلہ تھا۔ وہ اس وقت کونین کے متلاشی تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی شاگرد آئے تو کونین منگوالیں۔ جب میں آیا تو میں نے آتے ہی مشکوٰۃ کی شرح لکھنے کا مطالبہ کردیا۔ اس پر حضرت مفتی صاحبؒ نے مذکورہ جملہ ارشاد فرمایا۔ میں نے اس جملے کو ضرب المثل بنادیا مگر یہ محاورہ میرے اور مفتی صاحبؒ کے درمیان ہوتا تھا، کوئی دوسرا اسے نہیں سمجھتا تھا۔ کبھی مجلس میں کسی بڑی چیز کے حصول کا ذکر آتا تو میں کہتا: " بھئی، مفتی صاحب، آپ بھی عجیب آدمی ہیں، ہمیں کونین نہیں ملتی اور آپ یہ باتیں کرتے ہیں۔ " مفتی صاحبؒ سمجھ کر ہنس پڑتے اور انہیں ماضی کی بھولی بسری باتیں یاد آجاتیں۔ " (قومی ڈائجسٹ، ص ۱۸۴)

کلیوں کا تبسم:

حضرت مفتی صاحبؒ کے سفر و حضر کے رفیق اور ڈرائیور جناب عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں:

" بیماری اور مصروفیات انسان کو چڑچڑا بنادیتی ہے لیکن مفتی صاحبؒ کی ذات تو چڑچڑاہٹ پر دف تھی۔ وہ نہ بیماری سے متاثر ہوتے تھے، نہ مصروفیات سے۔ وہی لطافت، وہی شگفتگی، وہی شادابی جو چہرے کو گلاب

گلاب رکھتی۔ کلیوں کا تبسم ان کے لبوں کا احاطہ کیے رکھتا۔ آنکھیں مسکراہٹ کا مفہوم سمجھاتی رہتیں اور نطق وظرافت بغل گیر ہوتے رہتے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سفر میں ایک کار ہم سے آگے نکل گئی۔ اتفاق سے اسے ایک خاتون ڈرائیو کر رہی تھی۔ بس پھر کیا تھا، میں مفتی صاحب کے لطیف طنز کی زد میں آ گیا۔ وہ مجھ سے بار بار فرماتے کہ تم اچھے ڈرائیور ہو کہ ایک خاتون تم سے بازی لے گئی ہے۔ ہر چند کہ میں نے اپنی کار اس خاتون سے آگے نکال لی مگر مفتی صاحبؒ کئی روز تک اس بات سے لطف اندوز ہوتے رہے۔" (ترجمان اسلام، ص ۱۴۴)

آج ہم سب ثرید کھائیں گے:

" مولانا مفتی محمود صاحبؒ کا رویہ شروع ہی سے اپنے طالب علموں سے خاصا بے تکلفانہ تھا۔ ہمیشہ ان میں گھل مل کر رہتے۔ ایک بار درس حدیث میں مصروف تھے، پڑھاتے پڑھاتے ایک حدیث میں کہیں ثرید کا ذکر آ گیا۔ ثرید، گوشت کے شوربے میں گندم کی کوٹی ہوئی روٹی کو کہتے ہیں۔ اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ یہ کھانا دوسرے تمام کھانوں پر اس طرح فضیلت رکھتا ہے جس طرح حضرت عائشہؓ دوسری خواتین پر۔ حضرت مفتی صاحبؒ درس دیتے دیتے رک گئے۔ چند لمحے کچھ سوچا، پھر بولے: "اس حدیث پر تو آج ہی عمل ہونا چاہیئے۔" انہوں نے کتاب ایک طرف رکھ دی، جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اپنے داہنی طرف بیٹھے ایک طالب علم کو دیتے ہوئے بولے: "یہ لو میری طرف سے دس روپے، باقی پیسے تم

لوگ ڈالو، رات کو آج ہم سب ثرید کھائیں گے تا کہ اس سنت پر عمل ہو جائے۔"

مبارک ہو، بھائی پیدا ہوا ہے:

" چند دن بعد دوبارہ ثرید کا دور چلا لیکن اس مرتبہ تمام خرچہ حضرت مفتی صاحبؒ کو برداشت کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ دارالحدیث میں بیٹھے تھے کہ ایک نوعمر شاگرد لفافہ لایا اور کہا: گھر سے چٹھی آئی ہے، ذرا پڑھ دیجئے کیا لکھا ہے۔ مفتی صاحبؒ نے لفافہ چاک کیا، اندر سے کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ نکلا، اس پر صرف چند حروف لکھے تھے "تمہارا بھائی پیدا ہوا ہے، مبارک ہو" حضرت مفتی صاحبؒ اسے خط پڑھ کر سنا رہے تھے کہ اِدھر اُدھر سے کئی اور طالب علم بھی وہاں آ گئے اور لگے دریافت کرنے کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ خوشخبری انہیں بھی سنا دی کہ اس لڑکے کا بھائی پیدا ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا، سب لڑکے اس طالب علم کے گرد ہو گئے اور لگے تقاضا کرنے کہ نکالو پیسے، اس خوشی میں دعوت ہونی چاہیئے۔ لڑکے نے کچھ پس و پیش کی لیکن پھر مفتی صاحب کے کہنے پر پیسے نکال کر دے دیئے۔ ان پیسوں سے ثرید تیار ہوئی۔ سب نے مل کر خوب مزے سے کھائی۔

مفتی صاحب عصر کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں آنے لگے تو وہ نوعمر طالب علم بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا جسے صبح انہوں نے خط پڑھ کر سنایا تھا۔ اس نے کہا حضرت! میرا باپ تو عرصہ ہوا فوت ہو چکا ہے، یہ بھائی کہاں سے پیدا ہو گیا، میرے پیسے واپس کر دیجئے، میں غریب آدمی ہوں۔ مفتی صاحبؒ

نے تحقیق کی تو اس کی بات درست نکلی۔ دوسرے ساتھیوں نے اعتراف کرلیا کہ انہوں نے ثرید کھانے کے لئے یہ چکر چلایا تھا۔ اُسے جھوٹ موٹ ایک خط لکھ کر بے چارے سے پیسے اینٹھے گئے تھے۔ اب اس کا اصرار تھا کہ میرے پیسے واپس کیے جائیں، میں غریب آدمی ہوں، میں نے تو حضرت مفتی صاحب کے کہنے پر پیسے دیے تھے، وہی پیسے واپس دلائیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی جیب سے یہ رقم ادا کی تب اس نے اطمینان کی سانس لی۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص ۳۶)

چائے کھائیے:

حضرت مفتی صاحب خود ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ گھر میں ایک رشتہ دار نے چائے پیجئے کے بجائے چائے کھائیے کہدیا۔ اس پر دوسرے رشتہ دار نے کہا کہ چائے کے لئے پینا ہی بولا جاتا ہے کیونکہ وہ پی جاتی ہے، کھائی نہیں جاتی۔ دوسرے صاحب نے جواب ضرور دیا لیکن بات بے وزن رہی۔ حضرت مفتی صاحبؒ گھر میں بیٹھے یہ گفتگو سن رہے تھے، انہوں نے خود ہی مفتی صاحبؒ سے رجوع کیا۔ مفتی صاحبؒ نے اس غریب کی وکالت کی جس نے چائے کے لئے کھانے کا لفظ استعمال کیا تھا اور کئی ایک دلیلیں دیں۔ مثلاً "شراب" پی جاتی ہے، کھائی نہیں جاتی لیکن فارسی میں شراب نوش کو "مے خوار" یعنی شراب کھانے والا کہا جاتا ہے اور قرآن پاک میں پانی کے لئے بجائے لفظِ "شرب" کے "طعام" استعمال فرمایا گیا ہے۔ دوسرے پارے کے آخر میں یہ آیت آئی ہے:

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ﴾ (جس

نے اس میں سے پانی پی لیا وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہے)

اس طرح اس عزیز کی نجات ہوئی جو جواب دینے سے قاصر رہ گیا تھا۔

پراسرار آدمی، پراسرار اشارے:

قومی ڈائجسٹ کے نائب مدیر محمد شریف کیانی رقم طراز ہیں:

" وزارتِ علیا سے الگ ہونے کے بعد مولانا مفتی محمودؒ نے بڑے بھرپور انداز میں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے آئین کی تشکیل اور قادیانی مسئلے کے محاذ پر اسمبلی کے اندر اور باہر تاریخی جنگ لڑی۔ سی آئی ڈی کے کارندے دن رات سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے رہتے اور انہیں ہر طرح سے ہراساں کرنے کی کوشش کی جاتی، لیکن مولانا مفتی محمودؒ کے عزم اور حوصلے کو کوئی چیز کم نہ کر سکی۔

ایک بار مولانا عبیداللہ انورؒ کی درخواست پر لاہور تشریف لائے اور ان کی مسجد واقع شیرانوالہ گیٹ میں دورہ تفسیر شروع کیا۔ رمضان کے دن تھے، گرمی زوروں پر تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے لئے مسجد کے ایک کونے میں پنکھا لگا دیا گیا تھا جہاں وہ نمازِ تراویح سے پہلے سنتیں اور نوافل ادا کرتے۔ مولانا علم الدین شیرانی بھی ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے اور مسجد شیرانوالہ ہی میں نمازِ تراویح ادا کرتے۔ مولانا علم الدین شیرانی کا تعلق قبائلی علاقے سے تھا اور مفتی صاحبؒ سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک رات وہ نماز سے پہلے حوض پر بیٹھے وضو کر رہے تھے کہ اچانک دو آدمیوں پر نظر پڑی۔ دونوں نے عام سے کپڑے پہن رکھے تھے، ان کی نقل وحرکت بڑی پراسرار نظر آتی تھی۔

مولانا علم الدین شیرانی وضو کرتے کرتے رک گئے اور کنکھیوں سے ان کی حرکات کا جائزہ لینے لگے۔ ایک آدمی نے آہستہ سے کچھ اشارہ کیا، اس پر دوسرے ساتھی نے شہادت کی انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔ مولانا شیرانی نے اس طرف نظر اٹھائی تو دیکھا مولانا مفتی محمود اکیلے کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ معاً خیال گزرا یہ لوگ کسی اچھی نیت سے نہیں آئے، کہیں مفتی صاحب کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ پریشانی نے آگھیرا۔ جوں توں کر کے نماز تو مکمل کر لی لیکن اس دوران خیال حضرت مفتی صاحبؒ کی طرف لگا رہا۔ نماز ختم ہوئی تو لپک کر مفتی صاحبؒ کے پاس پہنچے۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس انتظار میں ایک طرف کھڑے تھے کہ مولانا عبید اللہ انورؒ اپنے مریدوں سے ملکر فارغ ہوں تو وہ ان کے ساتھ ہی مسجد سے باہر نکلیں۔ مولانا شیرانی نے حوض پر پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل سنائی اور اپنے خدشات سے آگاہ کیا تو حضرت مفتی صاحبؒ بڑے زور سے ہنس پڑے اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے: ''اللہ کے بندے! وہ سی آئی ڈی کے آدمی ہیں، میں روزانہ پنکھے والی جگہ پر نماز ادا کرتا ہوں لیکن آج میں نے وہاں سے ہٹ کر نماز پڑھی۔ وہ مجھے اپنی مخصوص جگہ پر نہ پا کر پریشان ہو گئے کہ یہ مولوی کدھر غائب ہو گیا۔ ان میں سے ایک بالکل نیا آدمی ہے، آج ہی ڈیوٹی پر آیا ہے۔ دوسرا ساتھی اُسے اشارے سے بتا رہا تھا کہ وہ رہا مفتی محمود، اس پر نظر رکھنی ہے۔'' جب تک مولانا عبید اللہ انورؒ اپنے مریدوں سے فارغ ہو کر ان کے ساتھ نہیں

آ ملے، حضرت مفتی صاحبؒ اور مولانا شیرانی کھڑے اس واقعہ کو یاد کر کے ہنستے رہے۔" (قومی ڈائجسٹ، ص ۴۹)

زاہدِ خشک:

سابق وفاقی وزیر جناب جاوید ہاشمی رقم طراز ہیں:

" مولانا مفتی محمود زاہدِ خشک نہیں تھے بلکہ اپنے اندر مزاح کا ایک خاص انداز رکھتے تھے۔ جب تمام رہنماؤں کو مری کے ریسٹ ہاؤس میں حکومت نے حفاظتی نظر بندی میں رکھا ہوا تھا، ہم ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ ہمارے ساتھ آموں کے ٹوکرے بھی تھے۔ مفتی صاحبؒ ہنس کر فرمانے لگے: " مجھے ڈاکٹروں نے آم کھانے سے منع کیا ہوا ہے لیکن ایک دن میں صرف ایک آم کھانے کی اجازت ہے۔" پھر نوابزادہ نصر اللہ خاں صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ یہ مجھے بہت آم کھلاتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس طرح جلد کرسی ان کے لئے خالی کر دوں گا لیکن میرے خیال میں اس کے لئے ابھی انہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ تمام لوگ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ مفتی محمود قومی اتحاد کے صدر تھے اور نوابزادہ صاحب نائب صدر۔"

عملی ثبوت بھی ہونا چاہیئے:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

" مولانا مفتی محمودؒ بہت ہی زیادہ شگفتہ مزاج تھے۔ اکثر آپ اپنے ہم مجلسوں کو لطائف سنایا کرتے تھے۔ اسمبلی کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جس سے آپ کی ظرافت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اسمبلی میں ایک دفعہ نکاحِ بیوگان کا

مسئلہ زیر بحث تھا اور مختلف طرف سے اس سلسلے میں تقاریر ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک خاتون رکن (غالباً بیگم نون تھیں) نے کھڑے ہو کر کہا (جو کہ خود بھی بیوہ تھیں) اب یہ مسئلہ ایسا نہیں رہا کہ اس میں بحث کی جائے کیونکہ اب عورتوں کو خود اس بات کا احساس ہو گیا ہے اور وہ اب دوسری خواتین کو اس سلسلے میں ترغیب دیتی ہیں کہ وہ نکاح کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحبؒ اٹھے اور فرمایا کہ صرف زبانی ترغیب اور تبلیغ سے کیا ہوتا ہے، کوئی عملی ثبوت بھی ہونا چاہیئے۔ ہاہاہا (قومی ڈائجسٹ، ص ۲۶۱)

حضرت مفتی صاحبؒ کا درس، وعظ، خطاب اور عام گفتگو بڑی پر مغز، معلومات آفرین اور نپے تلے جملوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ انہیں ہر موضوع سے متعلق علمی لطائف و ظرائف بھی کثرت سے یاد تھے جس کی وجہ سے ان کی محفل میں شگفتگی اور دلچسپی برقرار رہتی تھی۔

حضرت مفتی صاحبؒ بڑے ظریف، نکتہ سنج، حاضر جواب، سبک روح اور خوش مذاق تھے۔ لیکن ان کے مذاق و مزاح میں بھی علمی شان نمایاں ہوتی تھی۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت و ذہانت میں ان کی مثال مشکل ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی پرسوز ایمانی و روحانی گفتگو اور لطائف و ظرائف اس قابل ہیں کہ اگر ان کو قلم بند کر لیا جائے تو ہزاروں انسانوں کی رہنمائی اور طبیعت کا تکدر دور کرنے کے لئے علاج اور سرمایہ حیات ثابت ہو سکتے ہیں۔

حاضر جوابی اور علمی گرفت:

حاضر جوابی میں حضرت مفتی صاحبؒ اپنا جواب آپ تھے۔ کوئی بڑے سے بڑا

مسئلہ درپیش ہوتا، آپ فی البدیہہ ایسا جواب دیتے کہ سائل حیران رہ جاتا۔ مناظرہ، مباحثہ اور گفتگو کے دوران حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی و استدلالی گرفت بہت مضبوط اور شدید ہوتی کہ فریق مخالف کے لئے اس گرفت سے نکلنا نہایت مشکل ہو جاتا۔

حضرت مفتی صاحبؒ جو بات بھی فرماتے، مدلل اور اگر کسی کی بات کو تسلیم کرتے تو وہ بھی دلائل کی بنیاد پر۔ ان کے دلائل اس قدر مضبوط ہوتے، چاہے بحث آیات قرآنیہ سے متعلق ہوتی یا احادیثِ نبویہ سے یا فقہی احکامات سے، حضرت مفتی صاحبؒ اتنے جامع اور مدلل جوابات دیتے کہ بڑے سے بڑے آدمی کے لئے بھی ان دلائل کو تسلیم کئے بغیر کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا۔

لکڑی کو سونا ثابت کر دیں:

حضرت مولانا محمد اسفندیار صاحب لکھتے ہیں کہ:

" حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مفتی محمودؒ ہمارے قائدین میں سے تھے۔ ان دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے، میں نے ایک بار مولانا ہزارویؒ سے عرض کیا کہ آپ ان اختلافات کو شوریٰ میں کیوں حل نہیں کرتے۔ مفتی صاحبؒ تو کہہ چکے ہیں کہ شوریٰ میں بیٹھ جاؤ اور جو فیصلہ ہو دونوں منظور کر لیں۔ ہزاروی صاحبؒ نے جواب میں فرمایا کہ بھائی! تم نہیں جانتے مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دلائل کی کتنی قوت دی ہے، وہ اگر چاہیں تو لکڑی کو سونا ثابت کریں اور وہ اس پر بھی قادر ہیں اور کوئی ان کے دلائل کو رد نہیں کر سکے گا، شوریٰ میں تو سراسر ان کی جیت ہے۔ "

(قومی ڈائجسٹ، ص ۱۵۲)

حریف کو ماننے بغیر چارہ کار نہ رہتا:

حضرت مفتی صاحبؒ جب کسی موضوع پر گفتگو کا آغاز کرتے تو دلائل کا انبار لگا دیتے اور کوئی ضروری پہلو نظر انداز نہ ہونے دیتے اور ایسے غیر دلآزارانہ، مشفقانہ اور محبوبانہ انداز میں مکمل، مدلل اور موثر بحث فرماتے کہ کسی کے لئے اعتراض وانکار کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ اپنی گفتگو میں حقائق و معارف اور علم کے دریا بند کر دیتے کہ بڑے بڑے جبال علم اور اہل کمال دنگ رہ جاتے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی بات میں ایسا عجیب وغریب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا کہ حریف کو ماننے بغیر چارہ کار نہ رہتا اور حضرت مفتی صاحبؒ کی گفتگو غیر معمولی ذکاوت وذہانت کی آئینہ دار ہوتی۔

تیری حاضر جوابی سے ہر اک مسرور ہوتا تھا
ترا سادہ سا فقرہ مصرعہ منثور ہوتا تھا

پوری اسمبلی میں ایک ہی مرد:

مولانا عبدالمجید ندیم رقم طراز ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ حزب اختلاف میں گزرا ہے۔ ہر دور میں حکومت کے غلط فیصلوں پر انہوں نے تنقید کی، مگر ان کی تنقید میں شائستگی، متانت اور دلائل کا رنگ غالب رہا۔ اندازِ بیان کبھی پایہ ثقاہت و شرافت سے نہیں گرا۔ ان کے حاسدین نے مختلف محاذوں پر انہیں بدگوئی کا نشانہ بنایا مگر حضرت مفتی صاحبؒ نے ہمیشہ ان کے زہریلے الزامات کا شریفانہ مگر مسکت جواب دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سیاسی مخالفین کے دل میں بھی ہمیشہ مفتی صاحبؒ کا احترام رہا۔

ایوب خان اسمبلی میں جب عائلی قوانین کے مسئلہ پر حضرت مفتی صاحبؒ سرکاری پالیسی پر شدید نکتہ چینی کر رہے تھے تو ایک مرتبہ سرکاری ممبران نے مفتی صاحب مرحوم کے خلاف یہ منصوبہ تیار کیا کہ جب مفتی صاحب اسمبلی میں قدم رکھیں تو خواتین ممبران پردہ کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ جونہی اسمبلی میں داخل ہونے لگے، خواتین ممبران نے چادروں سے چہرے ڈھانپ لئے اور سرکاری بینچوں سے آوازے کسے گئے اور قہقہے بلند ہوئے۔

بنگال کے مولوی فرید احمد مرحوم نے بتایا تھا کہ یہ صورتحال دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا کہ ایک مایہ ناز عالم دین اور جلیل القدر فقیہ کی اس بیہودہ انداز میں تضحیک بڑی دلخراش حرکت تھی۔

مگر حضرت مفتی صاحبؒ بڑے وقار اور سنجیدگی سے اپنی نشست کی طرف بڑھتے رہے اور اس طوفان بدتمیزی سے بے نیاز ہو کر اپنی نشست پر پہنچتے ہی مائک پر کھڑے ہو گئے اور بولے:

" مسٹر سپیکر اور معزز ارکانِ اسمبلی! آج میں آپ سب فرزندان اسلام کو مبارکباد کہتا ہوں کہ مسلم خواتین کی نمائندگی کرنے والی ممبر عورتوں کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ اسلام نے غیر محرم مرد سے پردہ کرنے کا جو حکم دیا ہے وہ بالکل صحیح اور واجب التعمیل ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا آج انہوں نے اس پر عمل کرتے ہوئے پردہ کرلیا ہے۔"

اس پر آواز آئی کہ مفتی صاحب! صرف آپ سے کیوں؟ مفتی صاحبؒ

نے برجستہ جواب دیا: "شاید پوری اسمبلی میں انہیں میرے سوا کوئی مرد نظر ہی نہیں آیا اور اس سے جو معزز ارکان کی توہین ہوئی اس پر مجھے بے حد افسوس ہے۔" (ترجمان اسلام نمبر، ص ۱۸۰)

قومی اسمبلی کا ممبر کسے بننا چاہیئے؟:

اپریل ۱۹۶۲ء میں صدر ایوب خان نے بی ڈی سسٹم کے تحت قومی اسمبلی کے پہلے انتخابات کرائے تو حضرت مفتی صاحبؒ نے بھی ان انتخابات میں انفرادی حیثیت سے حصہ لیا کیونکہ سیاسی جماعتوں پر ابھی تک پابندی تھی۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کا ایک جلسہ تھا۔ اس میں تمام امیدوار مدعو تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے ایک مدمقابل نے جنہیں اپنی قانون دانی پر بہت ناز تھا، بنیادی جمہوریتوں کے ارکان سے ووٹ کی اپیل کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ پر چوٹ کی اور کہا:

"مجھے کسی کے علم وتقویٰ پر اعتراض نہیں لیکن یہ قانون ساز اسمبلی کا معاملہ ہے، یہاں وہی نمائندہ آپ کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جو قانون جانتا ہو۔ دیکھئے اگر آپ کو ہوائی جہاز کے لئے کسی پائلٹ کی ضرورت ہو تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اس فن میں کتنی مہارت رکھتا ہے؟ اس کا نمازی ہونا یا پابندِ صوم وزکوٰۃ ہونا آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔"

حضرت مفتی صاحبؒ کے بولنے کی باری آئی تو انہوں نے اس مقرر کے خوب لتے لئے۔ فرمایا:

" مجھے اپنی فاضل دوست کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ ہر کام کے لئے اس فن کے ماہر کو منتخب کرنا چاہیئے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ قانون ساز

اسمبلی میں قانون دان حضرات کو بھیجنا چاہیئے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اس ملک میں کوئی اور قانون جاری کرنا ہے یا مروجہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا مطلوب ہے، اگر اسلامی اور صرف اسلامی قانون ہی بنوانا مقصود ہے تو پھر انہی لوگوں کو بھیجئے جو اسلامی قانون میں مہارت رکھتے ہیں۔"

فقہ اور قانون کا ماہر کون؟:

حضرت مفتی صاحبؒ کے ان الفاظ نے ہال کی کایا پلٹ دی۔ اصول بتانے والے حضرت منہ تکتے رہ گئے۔ محفل میں ایک اور بڑے وکیل صاحب بھی موجود تھے جو خود بھی امیدوار تھے۔ وہ پینترا بدل کر بولے:

" مفتی صاحب نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ اسلامی قانون صرف وہی جانتے ہیں۔ ہم لوگوں کو بھی اسلامی قانون پڑھایا جاتا ہے اور مشہور یونیورسٹیاں ہمیں اسلامی فقہ کی سند جاری کرتی ہیں۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اسلامی قانون کیا ہے؟"

اس پر حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا:

" میں نے شخصیات کی بحث نہیں کی۔ ایک اصول بتلایا ہے۔ رہی شخصیات کی بات تو یہ فیصلہ بنیادی جمہوریتوں کے ان ممبروں نے کرنا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کس پر اعتماد کریں۔ اگر یہ لوگ آپ پر اسلامی فقہ کے ماہر ہونے کا اعتماد کرتے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

بنیادی جمہوریت کے ارکان نے حضرت مفتی صاحبؒ کے دلائل پلے باندھ لئے۔ پولنگ کا دن آیا تو حضرت مفتی صاحبؒ کو دھڑا دھڑ ووٹ پڑنے لگے۔ نتیجہ

نکلا تو حضرت مفتی صاحبؒ ڈیرہ اسماعیل خان میں تھے، انہوں نے اپنی کامیابی کی خبر وہیں سنی اور وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ (قومی ڈائجسٹ، ص ۳۷)

صدر ضیاء الحق لاجواب ہو گئے:

حضرت مفتی صاحبؒ کے دیرینہ خادم اور جمعیت علمائے اسلام کے رہنما حافظ عبدالقیوم نعمانی رقم طراز ہیں:

" ہم قومی اتحاد کی تحریک میں ڈیرہ اسماعیل خان جیل میں تھے۔ ہمارے ساتھ اٹک سازش کیس کے دو فوجی افسر بھی تھے، ایک بریگیڈیئر تھا اور ایک کوئی بڑا افسر تھا۔ ایک کو پانچ سال سزا تھی اور ایک کو چھ سال۔ انہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کو درخواست دی کہ ہمیں بھی رہائی ملنی چاہیئے اس لئے کہ بھٹو کے جتنے مخالف تھے وہ سب رہا ہو گئے، ہم پر بھی یہی جرم تھا لہٰذا ہمیں رہا کیا جائے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس وقت کے صدر جنرل ضیاء الحق سے بات کی۔ ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ حضرت مفتی صاحب! یہ ہمارے فوجی ہیں اور ہم نے اپنے فوجی قانون کے مطابق ان کے کیس کی سماعت کی اور جج میں خود تھا اور میں نے ان کو صفائی کے تمام مواقع دیئے۔ یہ صفائی پیش نہیں کر سکے اور یہ جو سزا دی ہے میں نے صحیح سزا دی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے جب ان کی بات سن لی تو فرمایا: ان کا جرم کیا تھا؟ ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ ایک منتخب حکومت کے خلاف انہوں نے فوجی بغاوت کی سازش کی اور اس کی سزا جو ہم نے دی ہے یہ کم ہے، میں نے بڑی رعایت کی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا بھئی جو جرم انہوں نے کیا وہی آپ نے

کیا۔ جو جرم انہوں نے سازش کا کیا وہ آپ نے بھی کیا، ان کی سازش پکڑی گئی وہ اسیر ہیں اور آپ صدر مملکت ہیں، قصور میں دونوں کا کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ آپ صدر ہیں اور وہ بے چارے عام فوجی۔ ضیاء الحق لاجواب ہو گئے۔ ان کے دلائل کے سامنے بڑے بڑے لوگ لاجواب ہو جاتے تھے۔

حرام اور پلید کا فرق:

حضرت مفتی صاحبؒ نے بھٹو جیسی حکومت میں شراب پر سینہ تان کر وہ پابندی عائد کی کہ رہتی دنیا تک مثال رہے گی۔

وزیر اعظم بھٹو کے ایک سوال کا جواب:

جب وزیر اعظم بھٹو نے کہا کہ شراب کو قرآن نے کہاں حرام کہا ہے؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: ﴿**يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ**﴾ (اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے کے تیر یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں۔ ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم فلاح یاب ہو) شراب کو قرآن حکیم نے پلید کہا ہے۔ وزیر اعظم بھٹو نے کہا کہ اس کو پلید کہا ہے، حرام کہاں کہا؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: جو چیز حرام ہوتی ہے ضروری نہیں کہ وہ پلید بھی ہو لیکن جو چیز پلید ہوتی ہے وہ ضروری ہے کہ حرام بھی ہو۔ چوری کا نوٹ حرام ہے لیکن پلید نہیں۔ پیشاب پاخانہ پلید اور نجس ہے اور حرام بھی

ہے۔ بھٹو حیران ہو گیا کہ کیسے عجیب دلائل ہیں۔"

(مفتی صاحب ایک قومی رہنما، ص ۲۵۷)

واک آؤٹ کا شرعی ثبوت:

ایک بار حضرت مفتی صاحبؒ نے قومی اسمبلی سے واک آؤٹ کیا تو حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا: مفتی صاحب! واک آؤٹ کا اسلام میں کوئی ثبوت ہے؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے برجستہ کہا: ہاں! اس کا ثبوت قرآن میں موجود ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی ﴿**فلا تقعد بعد الذكرىٰ مع القوم الظالمين**﴾ (یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھو) مولانا ہزارویؒ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور اس کے بعد واک آؤٹ کے موقع پر انہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔

مقیم کی موجودگی میں مسافر کی امامت:

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

" قائدِ ملت حضرت مفتی صاحبؒ ایک مرتبہ جامعہ حقانیہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق ؒ کی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے طلبہ کے سامنے حضرت مفتی صاحبؒ کی عظمت اور ملکی و ملی خدمات کا تذکرہ فرماتے ہوئے انہیں ملک کی نامور علمی اور مذہبی شخصیت قرار دیا۔ (یہ حضرت مفتی صاحبؒ کے عنفوان شباب کی بات ہے) حضرت مفتی صاحبؒ کچھ دیر جامعہ میں رہے، دن کا کھانا وہیں تناول فرمایا۔ ظہر کے

وقت مجھے شیخ الحدیث صاحبؒ نے بھیجا کہ دیکھو مسجد میں جماعت ہوگئی ہے یا نہیں؟ میں مسجد گیا تو معلوم ہوا جماعت ہوچکی ہے۔ ان حضرات نے وہیں جماعت کے لئے صف بنائی۔ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو نماز پڑھانے کے لئے آگے کردیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے دو رکعت پڑھا کر سلام پھیرا اور فرمایا: میں مسافر ہوں، آپ اپنی نماز پوری کرلیں۔ مقتدیوں میں سے ایک صاحب (جو کہ عالم دین بھی تھے) نماز پوری کر کے سلام پھیرنے کے بعد سخت غصہ میں کہنے لگے: مقیم کی موجودگی میں مسافر کو کیوں امام بنایا؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے برجستہ فرمایا: تاکہ تمہیں یہ مسئلہ معلوم ہوجائے کہ مقیم کی موجودگی میں بھی مسافر امام بن سکتا ہے۔ اعتراض کرنے والے صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔"

ہل اور تلوار:

جب ۱۹۷۷ء کا الیکشن ہوا تو بھٹو صاحب کا انتخابی نشان تلوار اور حضرت مفتی صاحبؒ کا انتخابی نشان ہل تھا۔ بھٹو صاحب نے انتخابی جلسوں میں کئی مقامات پر کہا: یہ مشینوں کا دور ہے، ٹریکٹروں کا دور ہے اور مفتی صاحب ہل کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی رجعت پسندی اور بیک ورڈ ہونے کی دلیل ہے، وہ ترقی کرنا نہیں چاہتے اور قوم کو پیچھے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے جب یہ بات سنی تو فوراً جلسہ عام میں کہا: بھٹو صاحب! ہم نے ٹریکٹروں کے دور میں ہل کو تھاما ہوا ہے تو ہم دقیانوس اور قدامت پسند ہیں اور آپ اس ایٹمی دور میں، میزائل اور جدید اسلحہ کے دور میں بھی تلوار پکڑ کر جدت پسند اور ترقی پسند ہیں۔ یہ تضاد اور دوہرا معیار کیوں؟

تمہاری زلف میں پہنچی تو حُسن کہلائی

وہ تیرگی جو میرے نامہ سیاہ میں ہے

آئندہ آپ کا مقابلہ نہیں کروں گا:

جب الیکشن کے بعد پنڈی انٹر کانٹ میں حضرت مفتی صاحبؒ کی اور وزیراعظم بھٹو کی ملاقات ہوئی تو بھٹو نے ہنستے ہوئے مفتی صاحبؒ سے کہا:

"تلوار تو میرا نشان تھا مگر تلوار کی کاٹ آپ کی زبان کو حاصل ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ آپ کا مقابلہ نہیں کروں گا۔"

اس قسم کے کئی واقعات پیش آئے جن میں بالآخر حضرت مفتی صاحبؒ کی فقید المثال ذہانت اور ذکاوت کا سب کو قائل ہونا پڑا۔ واقعی حضرت مفتی صاحبؒ جیسی مجموعہ علم وفضل اور قابل قدر ہستیاں شاذ ونادر ہی پیدا ہوتی ہیں۔

باب : ۱۲

سفر آخرت

موت انسانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جہاں ہر انسان قدرت خداوندی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس سے دنیا کے بڑے بڑے انسانوں، ہفت اقلیم کے بادشاہوں، خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون و نمرود، سکندر و دارا اور قیصر و کسریٰ کو بھی مفر نہ ہوا۔ اور جب موت کے آہنی پنجہ نے آ کر ان کا گلا دبایا تو شوکت و حشمت، دولت و حکومت اور سطوت و ثروت کوئی چیز ان کے کام نہ آئی۔ دنیا کے جلیل القدر انسانوں، پیغمبروں، ولیوں اور متقی و پرہیز گاروں کو بھی موت کی آغوش میں جانا پڑا اور خداوندِ کائنات کا یہ فرمان پورا ہوا کہ ﴿ **کل نفس ذائقة الموت** ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

> " اے لوگو! جو تم میں سے (بالفرض والمحال) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتے تھے تو وہ جان لیں کہ حضور اکرم ؐ وفات پا چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے تھے اللہ زندہ اور قائم ہے۔ "

اللہ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق حضرت مفتی صاحبؒ نے بھی تقریباً تریسٹھ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مولیٰ کو پیارے ہو گئے۔ **فانا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔**

حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات اسلامی دنیا کا حادثہ عظیمہ ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ علم و عمل کا روشن آفتاب، دین و مذہب کا مجسم پیغام، حق و معرفت کی آواز، قصر حریت کے معمار، نفاذ اسلام کے علم بردار اور پاکستان بلکہ عالم اسلام کی تاریخ نو کا ایک اہم باب تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی ملک و قوم خصوصاً ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک سرمایہ تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ قائد ملت بیک وقت عالم دین، مفسر قرآن، خطیب و ادیب، مدبر و مجاہد، دردمند خادم خلق، پیکر ایثار اور نظام اسلام کے نفاذ کے علم بردار تھے۔ قائدِ ملت حضرت مفتی صاحبؒ اپنے علم و فضل اور عظیم الشان دینی و ملی خدمات کے اعتبار سے علمائے حق کے عظیم اور تاریخی سلسلہ ولی اللّٰہی کی آخری کڑی تھے۔ اس سلسلہ مبارکہ کے علماء میں قرون اولیٰ اور بزرگان سلف کی سی ہمہ گیری ہوتی تھی۔ یہ دین اور دنیا دونوں ہی کی ذمہ داریاں محسوس کرتے اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے دامن بچاتے ہوئے خود کو ﴿ **انی جاعل فی الارض خلیفة** ﴾ کا صحیح مصداق بناتے اور انسانیت کی اس معراج کو چھوتے جہاں فرشتے بھی سر جھکاتے ہیں۔

قائدِ ملت حضرت مفتی صاحبؒ اسی سلسلہ ولی اللّٰہی کی روایات کا بھرم تھے۔ اس گوہر آب دار کے تراشے ہوئے پہلوؤں میں شاہ ولی اللہؒ کا فکر، شاہ عبدالعزیزؒ کا تقویٰ، شاہ عبدالقادرؒ کی بے باکی، شاہ رفیع الدینؒ کی سلاست روی، شاہ اسماعیلؒ کا جذبہ جہاد، سید احمد شہیدؒ کی استقامت، امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا سوز دروں، قاسم نانوتویؒ

کی تواضع، رشید احمد گنگوہیؒ کا تفقہ، انور شاہ کشمیریؒ کی محدثانہ جلالتِ قدر، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ادبیت، مفتی کفایت اللہؒ کی جرأت، حضرت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت اور حضرت سید حسین احمد مدنیؒ کی مدبرانہ سیاست جھلکتی تھی۔ کردار کی جامعیت نے انہیں ہر طبقہ خیال میں ممدوح ومقبول بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ قومی اتحاد کی تحریک میں وہ مختلف الخیال سیاسی جماعتیں جو دن رات آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں، ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر آپ کی قیادت میں متحد ہو گئیں۔ یہی بوریا نشین جب قوم کا رہبر اور حکمران بھی بنا **تو سید القوم خادمھم** کی زندہ تصویر بن کر......

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

اپنے اساتذہ اور اکابر اہل علم سے بارہا سنا ہے کہ اہل اللہ کی زندگی کے آخری لمحات بڑے قیمتی اور قرب ومعرفت اور سلوک ووصال کے اعتبار سے قابل رشک ہوتے ہیں۔ کشتہ گان عشق الٰہی، محبان ذاتِ رسالت پناہی اور واصلان بارگاہِ الٰہی کی آخری ساعات کی روئیداد اہل علم ہمیشہ محفوظ اور شائع کرتے چلے آئے ہیں۔

ذیل میں ہم اپنے اکابر اور ائمہ امت کی اتباع میں قائدِ ملت حضرت مفتی صاحبؒ کے آخری لمحات کے بعض حالات، حکایات، کیفیات اور عین وفات کے عینی شاہدوں کی عینی شہادتیں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں کیونکہ محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "**انما الاعمال بالنیات**" اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے۔

لطفِ الٰہی کا انتخاب:

حکیم العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کے عینی شاہد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"حق تعالیٰ شانہ کے لطف و کرم اور اس کی قدرتِ کاملہ کا تماشا دیکھو کہ تھانہ بھون کے ایک شیخ زادے کو اٹھاتے ہیں اور اُسے عرب و عجم کا شیخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بنا دیتے ہیں۔ گنگوہ کے ایک انصاری خاندان کے ایک فرد پر نظرِ عنایت ہوتی ہے، اُسے **قطبیتِ** کبریٰ کے مقام پر فائز کر کے امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بنایا جاتا ہے۔ کشمیر کی سنگلاخ سرزمین سے ایک گمنام خاندان کے ایک فرد کو لایا جاتا ہے اور علوم نبوت کا پورا کتب خانہ اس کے سینے میں انڈیل کر اُسے امام العصر مولانا محمد انور شاہؒ بنایا جاتا ہے۔ گوجرانوالہ کے ایک گاؤں سے ایک نو مسلم کو لاتے ہیں اور اُسے ولایتِ کبریٰ اور مقام صدیقیت پر فائز کر کے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ بنا دیتے ہیں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک غیر معروف قصبہ سے ایک فرد کو کھینچتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُسے عالم، حافظ، قاری، فقیہ، مفتی، محدث، متکلم اور پھر وزیر اعلیٰ سے لے کر قائدِ حزب اختلاف تک بنا دیتے ہیں۔ اس صدی (اور گذشتہ صدیوں) کے اکابر کا ابتدائی حالات کا مشاہدہ کیجئے تو بظاہر اسباب کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نونہال کا سایہ ایک عالم پر محیط ہوگا۔ اس سے واضح ہوا کہ مشیتِ الٰہی حفظِ دین اور پاسبانی ملت کا انتظام ظاہری اسباب سے بالاتر کرتی ہے اور لطفِ الٰہی خود ایسے افراد کا انتخاب کرتا ہے جن

سے دین قیم کی خدمت کا کام لیا جائے۔

چودہویں صدی کے آخری حج کیلئے سفر:

قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ حرمین شریفین کے لئے عازم سفر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی علالت اور ضعف و ناتوانی کے علی الرغم چودہویں صدی کے آخری حج میں شرکت کریں اور خانہ کعبہ جا کر بارگاہِ ربِ ذوالجلال میں بصد عجز و نیاز یہ التجا کریں کہ پوری صدی میں امت سے جو کوتاہیاں، جو لغزشیں اور تقصیریں ہوئی ہیں، حق تعالیٰ شانہ اپنی رحمت بے پایاں اور اپنے محبوب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے امت کے پوری صدی کے گناہوں کو معاف کر دیں۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کی مشیت و تکوین شاید یہ چاہتی تھی کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے اس حسن و اخلاص اور حسن نیت کی وجہ سے اس صدی کا خاتمہ ہی "محمود" پر کر دیا جائے۔ "یا الٰہی عاقبت محمود گرداں"

اس لئے حرمین شریفین کے لئے پرواز سے ٹھیک ۲۴ گھنٹے پہلے ان کی بے تاب و بے چین روح اس صدی کے مسلمانوں کی سفارش لے کر سیدھی بارگاہ ربِ ذوالجلال میں پہنچ گئی۔

﴿ یا ایتها النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربک راضية مرضية . فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ﴾

حضرت مفتی صاحبؒ 11 اکتوبر، یکم ذوالحجہ بروز ہفتہ کراچی پہنچے۔ 15 اکتوبر، ۵ ذوالحجہ کی پرواز میں ان کی نشست محفوظ ہو چکی تھی۔ دن کو بیشتر

قیام جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے مہمان خانہ میں رہتا تھا اور رات کو اپنے مخلص دوست جناب حاجی محمد حنیف صاحب کے یہاں پی ای سی ایچ سوسائٹی میں تشریف لے جاتے تھے۔

۱۴۔ اکتوبر، ۴ ذوالحجہ کو بروز دوشنبہ صبح غسل فرمایا اور مکان پر بعض سیاسی رفقاء سے ملاقات فرمائی۔ ۱۱ بجے مدرسہ تشریف لائے۔ آج حضرت مفتی صاحبؒ معمول سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے یاد فرمانے پر جناب مولانا محمد رفیع عثمانی مہتمم دارالعلوم کراچی اور مولانا محمد تقی عثمانی قانونِ زکوٰۃ کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے لئے تشریف لائے اور قریباً ساڑھے بارہ بجے رفیق محترم جناب مولانا محمد جمیل خان صاحب راقم الحروف کو باصرار حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں لے گئے۔ اس ناکارہ کو ان حضرات کی تشریف آوری کا علم نہیں تھا اور نہ موضوع گفتگو کے بارے میں کچھ خبر تھی۔ اس وقت مجلس میں یہ حضرات موجود تھے...... جناب مولانا محمد طاسین صاحب ناظم مجلس علمی کراچی، مولانا مفتی احمد الرحمٰن، مولانا محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، صاحبزادہ مولوی محمد بنوری اور مولانا محمد جمیل خان۔ تھوڑی دیر بعد جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر بھی تشریف لے آئے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ ان کو بھی حضرت مفتی صاحبؒ نے بطور خاص یاد فرمایا تھا) کوئی پندرہ بیس منٹ تک لطف و مزاح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران چائے آئی تو صاحبزادہ مولانا محمد رفیع عثمانی اور صاحبزادہ مولانا محمد تقی عثمانی نے چائے سے معذرت کی اور ٹھنڈا مشروب

نوش کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا گو میں خود چائے پیتا ہوں مگر جو حضرات نہیں پیتے ان کو اچھا سمجھتا ہوں۔ جناب مولانا محمد تقی عثانی صاحب نے پان کے بٹوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! ہمارے ساتھ یہ علت لگی ہوئی ہے۔ فرمایا یہ اس سے بھی بدتر ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے چائے کی پیالی نوش فرمالی تو مولانا محمد تقی عثانی نے پان پیش کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے قبول فرمالیا۔ اِدھر مولانا محمد طاسین صاحب سے دریافت کیا کہ نماز کس وقت ہوگی؟ ڈیڑھ بجے کا وقت بتایا گیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "پھر میرا خیال ہے کہ تھوڑی سی گفتگو نماز سے پہلے ہو جائے" پان بمشکل ایک یا دو منٹ منہ میں رہا ہوگا کہ اگالدان میں ڈال دیا۔ خوب کلی کی اور فرمایا:

غلطی سے رجوع کرلوں گا:

"اس وقت ہماری گفتگو خالص شرعی نقطہ نظر سے ہے۔ کوئی سیاسی ذہن یا تعصّب اس میں کارفرما نہیں ہونا چاہیئے اور میں اپنی ذات کے بارے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے اپنی غلطی معلوم ہوگئی تو میں اس سے رجوع کرلوں گا۔"

تین اعتراض:

یہ کہہ کر فرمایا کہ آپ حضرات نے میرے فتوے کا جواب لکھا ہے، گو اس میں صراحۃً میری تردید نہیں کی گئی مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میرے فتوے کا جواب ہے، مجھے آپ حضرات پر تین اعتراض ہیں۔

پہلے نکتے کی جو تشریح فرمائی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

" آپ حضرات نے یہ فرمایا کہ بینکوں میں جو روپیہ جمع کر دیا جاتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اموال ظاہرہ میں داخل ہو جاتا ہے بلکہ وہ اموال ظاہرہ سے بڑھ کر حکومت کی ضمانت و حفاظت میں داخل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بینک میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے وہ ربوی قرض ہوتا ہے۔ چنانچہ بینک بھی اس کو قرض سمجھتے ہیں اور کھاتے دار بھی یہی سمجھتے ہیں اور قرض کی رقم کا حکم یہ ہے کہ وہ قرض دہندہ کی ملک سے خارج ہو کر مستقرض کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے، وہ اس میں مالکانہ تصرف کرتا ہے۔ اگر وہ رقم ضائع ہوتی ہے تو مستقرض کی ضائع ہوتی ہے اور فقہ کا ایک جزئیہ بھی ایسا نہیں جس کے مطابق مستقرض کو قرض دہندہ کی جانب سے اس رقم کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حق حاصل ہو۔ پس جب بینک میں جمع شدہ رقم قرض دہندہ گان کی ملکیت ہی نہیں بلکہ بینک کی ملکیت ہے تو اس کو اموال ظاہرہ میں کس طرح شمار کیا جا سکتا ہے اور بینک کو اس رقم پر قرض دہندہ کی طرف سے زکوٰۃ وضع کرنے کا حق کس شرعی اصول سے دیا جا سکتا ہے؟ یہ رقم اموال ظاہرہ میں شامل ہے یا اموال باطنہ میں؟ یہ بحث تو اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ وہ رقم قرض دہندہ کی ملک میں ہو لیکن جب وہ رقم قرض دہندہ کی ملک سے خارج ہو کر بینک میں داخل ہو گئی ہے تو اس رقم پر اموال ظاہرہ یا اموال باطنہ کا اطلاق کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔ "

حضرت مفتی صاحبؒ ابھی پہلے نکتے ہی کی تشریح فرما رہے تھے، ان کی تقریر بڑے ربط و تسلسل سے جاری تھی۔ اس ناکارہ کو حضرت مفتی صاحبؒ

کی گفتگو سننے کا موقع پہلے بھی کئی بار ملا لیکن حاضر دماغی، حسن ربط و سلیقہ اور جس حسن استدلال سے وہ آج اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر رہے تھے، اس کا تجربہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔

آسان ترین موت:

قریباً دس منٹ تک وہ اس نکتہ پر تقریر فرماتے رہے، درمیان میں نہ کوئی حشو و زائد لفظ آیا، نہ کسی لفظ پر اٹکن یا لکنت محسوس ہوئی۔ خدا جانے وہ پہلے نکتہ کی تشریح کر چکے تھے یا اس سلسلہ میں ابھی کچھ اور وضاحت فرمانا چاہتے تھے کہ فقرہ مکمل کر کے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئے، بایاں ہاتھ پیشانی پر رکھا اور یکایک بائیں پہلو کی طرف مائل پیچھے کو گر گئے۔ اس جانب جناب صاحبزادہ مولوی محمد بنوری بیٹھے ہوئے تھے، ان کی گود میں آ رہے۔

ہم نے آج تک کسی کو اتنی آسانی سے مرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے کسی کو وہم بھی نہیں ہوا کہ حضرت مفتی صاحبؒ زبان حال سے "**لست علی صحبتکم بحریص**" (سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے تاریخی فقرے کی طرف اشارہ ہے۔ اپنے وصال سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے گورنروں اور فوجی حکام کے نام ایک گشتی فرمان لکھا کہ اسلام کے کچھ شرائع اور ارکان ہیں۔ زندہ رہا تو تمہارے سامنے اس کی تشریح کروں گا لیکن اگر میرا وقت موعود آ پہنچا تو تمہارے پاس رہنے کا خواہش مند بھی نہیں ہوں) کہتے ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں۔ ہم سب یہی سمجھے کہ دل کے دورہ کی وجہ سے سکتہ کی سی بے ہوشی ہوگئی ہے اس لئے مولانا محمد طاسین صاحب

نے منہ میں پانی ڈالا۔ راقم الحروف نے زور سے مقام قلب کو مسلنا شروع کیا۔ ڈاکٹرعبدالرزاق صاحب اور مفتی احمد الرحمٰن نے پاؤں کی مالش شروع کردی۔ مولانا محمد رفیع عثمانی نے زبان کے نیچے وہ دوائی رکھی جو شدید دورۂ قلب میں دی جاتی ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا محمد بنوری اور مولانا محمد جمیل خان ڈاکٹروں کی طرف دوڑے مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے وقفہ وقفہ سے دو چار ہچکیاں لیں اور ابدی نیند سو گئے۔ **انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔**

راقم الحروف نے مصنوعی دانت اپنے ہاتھ سے نکالے اور آنکھوں سے چشمہ اتارا۔ زندگی کی تمام علامتیں ختم ہو چکی تھیں اور یقین آچکا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی روح پرواز کر چکی ہے۔ لیکن ان کے معالج ڈاکٹر کا اصرار تھا کہ انہیں ہسپتال ضرور لایا جائے۔ چنانچہ ہسپتال لے گئے اور آدھے گھنٹے تک نظام تنفس جاری کرنے کی کوشش کی گئی، بالآخر اشک بار آنکھوں سے جناب ڈاکٹر اسلم صاحب اور ان کے رفقاء نے موت کی تصدیق کردی۔ **ان للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ و کل عندہ باجل مسمّٰی۔**

لائق رشک موت:

یوں تو موت سنت بنی آدم ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ یہاں جو بھی آیا جانے ہی کے لئے آیا۔ لیکن بعض حضرات کی زندگی کی طرح ان کی موت بھی لائق رشک ہوتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی موت کئی لحاظ سے حسن خاتمہ کی علامت ہے۔ ایک تو وہ سفر میں تھے اور سفر میں مومن کی موت معنوی

شہادت ہے۔ پھر یہ سفر بھی سفر حج تھا۔ گویا یہ موت فی سبیل اللہ تھی۔ پھر ایک دینی و شرعی مسئلہ کی وضاحت و تشریح کرتے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔ دینی مسائل کا مذاکرہ ذکرِ الٰہی کی ایک فرد ہے۔ پس ان کا خاتمہ ذکرِ الٰہی پر ہوا اور مفتی کی حیثیت سے جو خدمت حق تعالیٰ نے ان کو تفویض فرمائی آخری لمحہ تک اس میں مشغول رہے۔ پھر ان کی طائر روح نے جس سرعت سے پرواز کی وہ بجائے خود حیرت انگیز ہے۔ راقم الحروف کا احساس یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ جب فقرہ پورا کر کے خاموش ہوئے تو اسی لمحے بیٹھے بیٹھے ان کی روح پرواز کر گئی۔ اتنی آسانی سے روح کا قبض ہو جانا اس ناکارہ کے لئے بالکل ہی نیا مشاہدہ تھا کہ نہ موت سے پہلے کسی تکلیف کی شکایت نہ کسی درد و کرب کا اظہار۔ شیخ عطارؒ کے درویش کا واقعہ کتابوں میں پڑھا سنا تھا کہ ان کی دہلیز پر سر رکھ کر لیٹ گئے اور کہا کہ ہماری روح تو یوں قبض ہو جائے گی مگر اس کا چشم دید مشاہدہ حضرت مفتی صاحبؒ کے وصال سے ہوا کہ مرنے والے یوں بھی مر کر دکھا دیا کرتے ہیں۔" (ماہنامہ بینات)

حضرت مفتی صاحبؒ سے آخری ملاقات:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ، حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کے چشم دید مشاہدات بیان فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" ذیقعدہ کے آخر میں مفتی صاحبؒ سفر حج پر جانے کے لئے کراچی تشریف لائے تو شروع میں ہمیں تشریف آوری کا علم نہ ہوا۔ ایک رات حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ کے صاحبزادے جناب محمد بنوری

صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے مفتی صاحبؒ کی تشریف آوری کی اطلاع دی اور ساتھ ہی حضرت مفتی صاحبؒ کا پیغام پہنچایا کہ انہوں نے ہم دونوں (احقر اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب) کو زکوٰۃ کے مسئلے پر گفتگو کے لئے بلایا ہے۔ اگلے دن بارہ بجے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں ملاقات طے ہوگئی اور ہم دونوں تقریباً ساڑھے بارہ بجے بنوری ٹاؤن پہنچے تو مفتی صاحبؒ مہمان خانے میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ مفتی صاحبؒ کے ساتھ آخری ملاقات ہوگی، وہاں مولانا محمد طاسین صاحب، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مولانا احمد الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد بنوری پہلے سے موجود تھے۔

وقت کی پابندی:

حسب معمول حضرت مفتی صاحبؒ بڑی شفقت اور تپاک سے ملے، اٹھ کر معانقہ فرمایا اور تقریباً بیس منٹ تک بڑے شگفتہ ماحول میں باتیں ہوتی رہیں۔ جناب محمد بنوری نے کہا یہ تقریباً نصف گھنٹہ تاخیر سے پہنچے ہیں اس لئے ان پر جرمانہ ہونا چاہیئے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "نہیں بھائی، پاکستان میں ایک گھنٹہ تک تاخیر معاف ہے اور یہ لوگ تو یوں بھی شہر سے دور رہتے ہیں۔" پھر فرمانے لگے کہ "ہماری یہ حالت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی شخص پابندی وقت کا اہتمام کرے تو لوگ اسے طعنے دیتے ہیں کہ اس میں "انگریزیت" ہے حالانکہ یہ تو اچھی صفت ہے مگر ہم لوگوں نے اچھی باتیں انگریز کے کھاتے میں ڈال دی ہیں، اور پھر ہم وہ اچھی باتیں واپس لینے کو بھی تیار نہیں اور بری

باتیں ان سے لینے کو تیار ہیں۔" احقر نے طبیعت کا حال پوچھا تو فرمایا کہ "الحمد للہ! اب طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے، بس دوا اور پرہیز جزو زندگی بن چکے ہیں اس کی پابندی کروں تو طبیعت ٹھیک رہتی ہے، البتہ دوا یا پرہیز کا ناغہ ہو جائے تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

افراد کا احرام:

پھر سفر حج کا ذکر آ گیا تو فرمایا کہ: "انشاء اللہ کل حج کے لئے روانگی ہے، میں نے اس مرتبہ افراد کا احرام باندھنے کا ارادہ کیا ہے کیونکہ ہجوم کے زمانے میں ضعف کی بنا پر طواف میرے لئے مشکل ہوتا ہے۔ افراد میں پہنچنے کے بعد صرف ایک طواف کرنا ہوگا اور طواف وداع کے بارے میں بھی میرا ارادہ یہ ہے کہ منیٰ سے واپس سیدھا مدینہ طیبہ چلا جاؤں گا اور وہاں سے واپس آ کر طواف وداع کروں گا کیونکہ اس وقت ہجوم کم ہو چکا ہوگا۔"

پان، چائے سے بھی بدتر:

اتنے میں چائے آ گئی، احقر اور بھائی صاحب چونکہ دن میں ایک سے زیادہ مرتبہ چائے نہیں پیتے اس لئے ہم نے چائے سے عذر کیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "میں اگرچہ چائے پیتا ہوں لیکن جب کسی کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چائے نہیں پیتا تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔" احقر کے ہاتھ میں پان کا بٹوہ تھا، میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا کہ "حضرت! یہی معاملہ ہمارا اس چیز کے ساتھ ہے" فرمانے لگے: "ہاں بھائی! یہ تو چائے سے بھی بدتر چیز ہے۔"

چند منٹ کے مہمان:

غرض تقریباً بیس منٹ تک بڑی شگفتہ باتیں ہوتی رہیں۔ مفتی صاحبؒ بڑے ہشاش بشاش تھے، چہرے پر نشاط کے آثار تھے اور سنجیدگی کے ساتھ خوش طبعی، جو مفتی صاحبؒ کی عام عادت تھی، بات بات میں جھلک رہی تھی بلکہ بعض باتیں نہایت بے تکلفی کے ماحول میں ایسی ہوئیں کہ بار بار محفل کشتِ زعفران بنی۔ اس وقت کسی کے حاشیہ وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ مفتی صاحبؒ اب صرف چند منٹ کے مہمان ہیں اور اس کے بعد یہ محفل ہمیشہ کے لئے ویران ہو جائے گی۔

ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ "اچھا، اب نمازِ ظہر سے پہلے اصل مسئلے سے متعلق کچھ بات کر لی جائے؟" ہم نے تائید کی اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔

خالص دینی فقہی نقطۂ نظر سے گفتگو ہو:

مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "سب سے پہلے تو مجھے عرض کرنا ہے کہ زکوٰۃ کا مسئلہ چونکہ خالص دینی مسئلہ ہے اس لئے ہمیں اس پر خالص فقہی نقطہ نظر سے گفتگو کرنی چاہیئے اور کسی بھی دوسرے نقطہ نظر یا کسی قسم کی نفسانیت کو درمیان میں نہیں آنا چاہیئے۔ الحمد للہ، مجھے اس پر اطمینان ہے کہ اگر آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی تو اِسے قبول کرنے میں مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا اور یہی امید بحمد اللہ آپ سے بھی ہے کہ اگر میری بات آپ کی سمجھ میں آ گئی تو آپ اپنی بات پر اصرار نہیں کریں گے اور اسی امید پر میں نے زبانی گفتگو مناسب سمجھی ہے

تا کہ اگر فتووں میں اتفاق کی صورت پیدا ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔"

ہم نے عرض کیا کہ "ہم خود اس کے خواہش مند ہیں کہ اس مسئلے پر خالص فقہی انداز سے گفتگو کر کے کسی متفقہ نتیجے پر پہنچ جائیں۔" فرمانے لگے کہ "ہاں! پچھلی مرتبہ آپ ہسپتال میں آئے تو بیماری اور ہسپتال کے ماحول کی وجہ سے کسی تفصیلی بات کا موقع نہ تھا اس لئے وہاں یہ بات نہ ہو سکی۔ بہر حال اب بحمد اللہ اس کا موقع مل گیا ہے اور اب یہ بات ہونی چاہیئے۔"

تین اشکالات:

اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ "میں نے آپ کی (یعنی مجلس تحقیق مسائل حاضرہ) کی تحریر غور سے پڑھی ہے اور اس پر مجھے صرف تین اشکالات ہیں۔ اگر وہ تین اشکالات حل ہو جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں یہ تینوں اشکالات آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر حضرت مفتی صاحبؒ نے پہلے اشکال کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ: "آپ حضرات نے بینک اکاؤنٹ کو اموال ظاہرہ میں شمار کیا ہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ بینک میں جو رقم رکھوائی جاتی ہے وہ فقہی اعتبار سے امانت نہیں، بلکہ قرض ہوتی ہے اور جب کسی کو کوئی رقم بطورِ قرض دے دی جائے تو وہ قرض دینے والے کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بینک کی رقوم اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتیں اسی لئے اُن پر زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہیں جب تک اکاؤنٹ ہولڈر اس رقم کو واپس نہ لے لے، لہٰذا نہ بینک کو جو مقروض ہے یہ

حق حاصل ہے کہ وہ از خود اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف سے زکوٰۃ وضع کر لے اور نہ مصدق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بینک کی رقم سے جو بینک کی ملکیت ہو چکی ہے اکاؤنٹ ہولڈر کی زکوٰۃ وصول کر لے۔"

پیغام اجل:

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس نکتے کی وضاحت بڑی تفصیل کے ساتھ مدلل انداز میں فرمائی۔ اس پوری گفتگو میں کسی ادنیٰ کمزوری، غائب دماغی یا کسی جسمانی یا ذہنی تکلیف کا مطلق احساس نہیں ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ اپنے پہلے نکتے سے فارغ ہو چکے تھے اور وہ دوسرے نکتے کو بیان کرنے سے پہلے بات کو سمیٹ رہے تھے کہ احقر نے جوان کے بالکل سامنے بیٹھا تھا، چہرے پر اچانک معمولی سی کمزوری اور سفیدی محسوس کی اور چند لمحوں کے لئے ہونٹوں میں ہلکی سی لرزش بھی پیدا ہوئی۔ اسی حالت میں اچانک حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنا بایاں ہاتھ پیشانی اور سر پر رکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی بائیں کروٹ پر گر گئے۔

یہ سب کچھ چند ثانیوں میں اس قدر آناً فاناً ہو گیا کہ ہم سب حیران و پریشان رہ گئے، کسی نے منہ میں پانی ڈالا، کسی نے قلب کی مالش شروع کر دی، کوئی ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑا، حواس مجتمع کرنے پر اندازہ یہ ہوا کہ دل کا دورہ ہوا ہے، اس کے باوجود کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب صرف چند لمحوں کے سانس باقی رہ گئے ہیں۔ دل کی تکلیف کے وقت جو فوری دوا دی جاتی ہے وہ بھی زبان کے نیچے رکھ دی گئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نبض اور سانس دونوں

غائب تھے۔ امراض قلب کے ہسپتال میں فون کیا گیا تو ڈاکٹر صاحبان نے صورتِ حال سننے کے بعد فوراً ہسپتال لانے کا مشورہ دیا۔ ہم انہیں لے کر ہسپتال پہنچے، وہاں ڈاکٹر صاحبان ہسپتال سے باہر پہلے سے منتظر تھے اور انہوں نے گاڑی میں ہی اپنی کارروائی شروع کردی۔ بعد میں ایمرجنسی وارڈ میں لے جا کر تقریباً نصف گھنٹے تک ڈاکٹر صاحبان کوشش کرتے رہے۔ یہ نصف گھنٹہ انتہائی امید و بیم کی حالت میں گزرا لیکن پیغام اجل آ پہنچا تھا، تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر سید سلیم صاحب نے باہر نکل کر افسردہ لہجے میں بتایا کہ کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکی، حضرت مفتی صاحبؒ کی روح ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی پرواز کرچکی تھی۔ **انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔**

مبارک خاتمہ:

یہ تمام واقعات ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مدت میں اس طرح پیش آگئے کہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے پاس بلانے کے لئے ایسے وقت کا انتخاب فرمایا کہ وہ سفرحج کے لئے پا بہ رکاب تھے، بلکہ ان کا سفر تو شروع ہو چکا تھا، ایک دینی مدرسے کی مبارک فضا تھی، علماء طلباء کا مجمع تھا، آخر دم تک ایک خالص دینی اور فقہی مسئلے کی تحقیق میں مشغول رہے اور یہی گفتگو ان کی آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا حسین اور مبارک خاتمہ نصیب فرمایا جو ہر مسلمان کے لئے قابل رشک ہے۔ دین متین کا یہ خادم و مجاہد جو قال اللہ و قال الرسول کے ماحول میں پروان چڑھا، قال اللہ و قال الرسول کی بات کرتا کرتا دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اللّٰھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ و ابدلہ دارا خیرا من دارہ و اھلا خیرا من اھلہ و نقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس و باعد بینہ و بین خطایاہ کما باعدت بین المشرق و المغرب ، آمین ۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی)

تہجد بھی قضا نہ ہوئی:

حضرت مولانا محمد جمیل خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

" حضرت مفتی صاحبؒ حج کے سفر کے ارادہ سے کراچی تشریف لائے۔ آپ کا قیام کراچی میں شیخ محمد حنیف کے ہاں ہوتا تھا۔ ۱۱/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو آپ کراچی پہنچے۔ ایئر پورٹ سے سیدھے جامعہ بنوری تشریف لے گئے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے دو خادم حسن حسین فوراً خدمت کرنے لگے۔

۱۴/اکتوبر کی تاریخ سے پہلی رات حضرت مفتی صاحبؒ نے رات گیارہ بجے مختلف رہنماؤں سے ملاقات کی۔ آپ نے رات کا کھانا بھی پیر صاحب پگاڑا کے یہاں کھایا۔ گیارہ بجے شیخ محمد حنیف صاحب نے آپ کو بہت کہا کہ آرام کریں کیونکہ نو بجے پھر ولی خان سے ملنا ہے۔ آپ ان کے بے حد اصرار پر سونے کے لئے تشریف لے گئے مگر بچوں سے پتہ چلا کہ آپ تقریباً ایک بجے کے قریب سوئے۔ صبح تہجد کے وقت آپ حسبِ معمول اٹھ گئے اور نماز وغیرہ میں مشغول ہوگئے۔ بیماری کے بعد آپ چونکہ رات کو کم سوتے تھے، اس بنا پر آپ فجر کی نماز کے بعد تھوڑی دیر آرام فرماتے اور تقریباً آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ فرماتے۔ اس دن آپ نے سونے کا ارادہ نہیں فرمایا،

شیخ صاحب نے بہت کہا مگر آپ نے ٹال دیا۔ ناشتہ کے بعد آپ نے خلافِ معمول شیخ صاحب سے فرمایا کہ میں کپڑے بدلوں گا، آپ غسل کا بندوبست فرمایئے۔ غسل کے بعد کپڑے بدلے، خوشبو وغیرہ لگائی۔ نو بجے خان صاحب سے ملاقات شیخ صاحب کے گھر پر ہوئی۔ گیارہ بجے مفتی صاحبؒ نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ جامعہ بنوری ٹاؤن جانا ہے۔

شیخ صاحب نے عرض کیا کہ آپ آج بہت تھک چکے ہیں، آج آرام فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ "دو بجے واپس آجاؤں گا، جامعہ ضرور جانا ہے۔" کیا پتہ تھا کہ آپ کی موت کی جگہ کے لئے جامعہ کے نام قرعہ فال نکلا ہے۔

وفات سے قبل:

حضرت مفتی صاحبؒ وفات والے دن بہت زیادہ ہشاش بشاش تھے۔ صبح آپ نے غسل فرمایا۔ پھر مدرسہ آتے وقت آپ کو لاٹھی پیش کی گئی تو فرمایا کہ آج مجھے لاٹھی کی ضرورت نہیں۔ مدرسہ جب تشریف لائے تو معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے چہرے پر انوار برس رہے ہیں یہاں تک کہ مجلس میں ایک شخص نے کہا بھی کہ حضرت مفتی صاحبؒ آج بہت خوبصورت معلوم ہو رہے ہیں۔ دورانِ گفتگو آپ نے اپنے سر مبارک پر ہاتھ رکھا اور پشت کی طرف لڑھک گئے۔ ہم لوگ یہ سمجھے کہ دورہ وغیرہ پڑا ہے۔ عجیب سی کیفیت تھی اور یوں دیکھتے دیکھتے مفتی صاحبؒ ہماری آنکھوں کے سامنے رخصت ہو گئے۔ دو بجے حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کا اعلان کر دیا گیا۔ ساتھی جمع ہوئے کہ

آپ کی تدفین کہاں کی جائے۔ ملتان میں صاحبزادہ فضل الرحمٰن صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع دی گئی اور ان کی رائے کے مطابق میت کو ڈیرہ اسماعیل خان لے جانے کی تیاری کی گئی۔ احباب جمع ہوئے کہ جہاز چارٹر کرایا جائے۔ اتنے میں گورنر صاحب کی طرف سے ٹیلیفون آیا کہ صدر صاحب کو اطلاع مل گئی ہے اور انہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمات کو محسوس کرتے ہوئے ان کے لئے فضائیہ کا جہاز بھیجنے کی پیشکش کی ہے اور وہ جہاز چھ بجے روانہ ہوگا اس لئے نمازِ جنازہ کا اعلان عصر کے بعد کیا گیا۔

غسل اور نمازِ جنازہ:

بعد میں معلوم ہوا کہ ائیر فورس کا طیارہ رات کو ملتان ائیر پورٹ پر نہیں اتر سکتا، اس لئے دوسرے دن صبح جہاز پر میت جائے گی۔ عشاء کی نماز کے بعد جنازہ کا اعلان کر دیا گیا۔ مدرسہ کے اسی مہمان خانہ میں غسل کا اہتمام کیا گیا جس میں آپ تشریف رکھتے تھے۔ قاری عبدالحق صاحب اور مولانا عبدالقیوم نے طلبہ کی امداد سے حضرت مفتی صاحبؒ کو غسل دیا۔ آپ کے کپڑے مفتی صاحبؒ کے مستقل خادم حسن و حسین کے حوالہ کر دیئے گئے۔ رومال راقم الحروف کے حصہ میں آیا۔ غسل کے بعد آپ کی میت کو جامعہ بنوری ٹاؤن کے دارالحدیث میں دیدار کے لئے رکھ دیا گیا۔ عشاء کی نماز تک ہزاروں افراد نے آپ کا آخری دیدار کیا۔ عشاء کی نماز میں پوری مسجد اور مدرسہ لوگوں سے بھر گیا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد جنازہ نماز کے لئے رکھا گیا۔ گورنر سندھ، نواب زادہ صاحب، ولی خان

صاحب، پگاڑا صاحب اور ملک کے دوسرے بڑے بڑے رہنما آپ کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ جنازہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ قبلہ ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب نے پڑھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی نماز جنازہ پڑھانا میرے لئے باعثِ نجات ثابت ہوگا۔

آخری دیدار:

جنازہ کے بعد نعش مبارک دارالحدیث میں دیدار کے لئے رکھ دی گئی۔ تمام رات ہزاروں افراد آپ کی زیارت کرتے رہے۔ جامعہ بنوری ٹاؤن کے طلباء تمام رات آپ کے سرہانے تلاوت کلام پاک میں مصروف رہے۔ طلباء نے جس نظم وضبط کا مظاہرہ کیا وہ قابل ستائش ہے۔ صبح نماز فجر سے پہلے آپ کی میت ایمبولینس میں رکھ دی گئی۔ ایمبولینس میں مفتی احمد الرحمٰن صاحب، راقم الحروف، حسن وحسین اور طالب علم محمد ابراہیم سوار تھے۔ عبدالستار ایدھی صاحب ممتاز سماجی کارکن اپنی ایمبولینس اور بس کے ساتھ ہمراہ تھے۔ یہ سوگوار قافلہ ایئر پورٹ پہنچا۔ ایئر پورٹ پر مفتی احمد الرحمٰن کی اقتداء میں نمازِ فجر ادا کی گئی۔ نمازِ فجر کے بعد میت کو جہاز میں رکھا گیا۔ اس سے قبل ایئر فورس کی طرف سے میت کو سلامی پیش کی گئی۔ تقریباً سات بجے جہاز اڑا اور پونے آٹھ بجے جہاز ملتان ایئر پورٹ پر اترا۔ ملتان ایئر پورٹ پر ہزاروں افراد کا غم زدہ ہجوم موجود تھا۔ میت کو ایک ٹرک پر رکھ کر اسپورٹس گراؤنڈ ملتان لے جایا گیا۔ نمازِ جنازہ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ نے

پڑھائی۔ ہجوم کا اصرار تھا دیدارِ عام کرایا جائے مگر ڈیرہ اور عبدالخیل جانے کی وجہ سے ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ نو بجے ڈیرہ کی طرف جانا تھا مگر پتہ چلا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب ڈیرہ میں مفتی صاحبؒ کا خود استقبال فرمائیں گے۔ جہاز تین گھنٹہ مؤخر کر دیا گیا۔ اتنے میں مولانا عبید اللہ انور صاحبؒ اور میاں طفیل صاحب وغیرہ ایئر پورٹ پر پہنچ گئے۔ اس لئے ایئر پورٹ پر تیسری مرتبہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور یہ نماز مولانا عبید اللہ انور صاحبؒ نے پڑھائی۔ ایئر پورٹ سے جہاز روانہ ہوا اور پون گھنٹے بعد ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ گیا۔ ڈیرہ میں گورنر سرحد، اعلیٰ سول اور فوجی حکام اور ہزاروں افراد موجود تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں مکمل تعطیل تھی اور ایئر پورٹ سے جنازہ گاہ تک ہزاروں افراد کھڑے تھے۔ ڈیرہ میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ وہاں سے مفتی صاحبؒ کی میت کو ایک کھلی ویگن میں رکھ کر ہزاروں گاڑیوں کے جلوس میں عبدالخیل لے جایا گیا۔ عبدالخیل میں ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ صدرِ پاکستان بھی کچھ دیر بعد پہنچنے والے ہیں۔ تین بجے کے قریب صدر صاحب پہنچے اور نمازِ جنازہ کی تیاری ہوئی۔ نمازِ جنازہ سے قبل صاحبزادہ فضل الرحمٰن صاحب کی دستار بندی کی گئی۔ صاحبزادہ فضل الرحمٰن نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ نماز کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ کو ان کی آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا گیا۔ صدرِ پاکستان نے جنازے کو کندھا دیا۔ مفتی صاحبؒ کو عبدالخیل کے عام قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ سنت کے مطابق کچی قبر بنائی گئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے جنازہ کے ہمراہ کراچی سے پچیس افراد اور

ملتان سے بیس افراد جہاز میں تشریف لے گئے تھے۔ مولانا عبداللہ درخواستی صاحبؒ ملتان سے عبدالخیل تک ساتھ رہے اور نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کراچی سے عبدالخیل تک جنازہ کے ہمراہ رہے۔

جناب ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ کے تاثرات:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ فرماتے ہیں:

" حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ سے میری براہِ راست ملاقات اور تعارف اتفاق سے کبھی نہ پیش آیا۔ مگر ان کے علمی، دینی اور سیاسی کارنامے وقتاً فوقتاً میری نظروں سے گزرتے رہے اور علمائے کرام کی محافل میں اکثر ان کا تذکرہ آتا رہا۔ وہ ایک عظیم عالم دین، بہترین محدث اور بلند پایہ فقیہ اور مفتی تھے۔ ان کی علمی شخصیت اتنی بلند و برتر تھی کہ اس کا انکار دشمن بھی نہیں کرے گا۔ انہوں نے اپنی زندگی دین اور اسلام کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ آپ سیاست میں بلند و بالا مقام رکھتے تھے۔ سیاست ایسی چیز نہیں کہ جس میں سب لوگ کسی سے اتفاق کریں بلکہ اس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہوتی ہے، اس لئے بہت سارے لوگوں نے ان کی سیاست سے اختلاف کیا ہوگا مگر اس اختلاف سے ان کی شخصیت کسی طور متاثر نہیں ہوسکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علمیت اور فقاہت میں بہت بڑا مقام عطا کیا تھا کہ علمائے کرام مسائل کے سلسلے میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بڑا مقام تھا اور یہ ان کے عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کی گفتگو اور آخری مجلس اس موضوع کو مقرر کیا جو ان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو تھا، یعنی ایک فقہی اور دینی مسئلہ ("زکوٰۃ")۔

میرے نزدیک ان کا سب سے نمایاں وصف فقہ اور حدیث کی مہارت کا تھا اور یہ چیز بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، خصوصاً اہل سیاست کو۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان کی وفات سے مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ یہ بات بھی میرے لئے باعثِ سعادت اور اُخروی نجات کے ذخیرہ میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نمازِ جنازہ کے لئے مجھے منتخب فرمایا۔ جنازے کا قصہ بھی بلا ارادہ خدا کی توفیق سے ہوا۔ میں نے حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کی خبر سنی مگر اپنی ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی کہ جنازے میں شرکت کر سکوں۔ ایک ازدھام کا خوف، دوسرے اپنی حالت کا احساس، مگر عشاء کے وقت وضو کر کے باہر نکلا تو میرے بڑے صاحبزادے نے کہا کہ میں جنازے میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں۔ میرے دل میں یہ خیال ہوا کہ جب وضو کر ہی لیا تو چلو جنازے میں شرکت کر لوں۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن پہنچا تو اتنا ازدھام کہ دروازے میں داخلہ مشکل، مگر اسی وقت ایک آدمی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ازدھام میں سے راستہ بناتا ہوا مجھے جنازے کے قریب لے گیا۔ وہاں منتظمین میں سے مفتی احمد الرحمٰن صاحب مجھے دیکھ کر فرمانے لگے کہ ہم آپ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جنازہ آپ ہی نے پڑھانا ہے۔ اس طرح بلا ارادہ اور بلا نیت اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت میرے حصے میں رکھی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ

کی مغفرت فرمائے۔

شاید! تیاری ہو جائے؟:

" حضرت مولانا علم الدین شیرانی، مفتی صاحبؒ کو حج پر جانے سے پہلے الوداع کہنے کے لئے عبد الخیل پہنچے۔ عبد الخیل پہنچ کر مولانا شیرانی نے حضرت مفتی صاحبؒ سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ عرض کیا: سنا تھا آپ حج پر جا رہے ہیں تو الوداع کہنے آ گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے کہا: اللہ کے بندے! میں حج پر نہیں جا رہا۔ مولانا شیرانی چپ ہو گئے۔ شام کے وقت قاضی عطاء اللہ اور مولوی فتح خان (ٹانک) بھی مفتی صاحبؒ سے ملنے آ گئے۔ ان کے ساتھ دو ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے کہا: مفتی صاحب! ہم نے بھی چند دنوں تک جانا ہے، آپ مدینہ منورہ میں جہاں ٹھہریں گے وہاں کا پتہ لکھوا دیجیے تاکہ ملاقات کے لئے حاضر ہو سکیں۔ مفتی صاحبؒ نے پتہ لکھوا دیا۔ اس پر مولانا شیرانی نے اعتراض کیا: آپ عجیب آدمی ہیں، مجھ سے کہتے ہیں میں حج پر نہیں جا رہا لیکن دوسری طرف لوگوں کو وہاں کا پتہ بھی دیا جا رہا ہے۔ مفتی صاحبؒ مسکرائے، اللہ کے بندے! کیا پتہ، شاید تیاری ہو جائے؟! تھوڑی دیر بعد مولانا ایوب جان بنوری اور دو افغان مہاجر بھی وہاں پہنچ گئے۔ خوب محفل جمی، رات ایک بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب محفل برخاست ہوئی اور حضرت مفتی صاحبؒ اٹھ کر اندر جانے لگے تو مولانا شیرانی بھی ساتھ چلنے لگے۔ انہوں نے کمرے سے باہر نکل کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: میں صبح سویرے پہلی گاڑی سے واپس چلا

جاؤں گا۔ اس وقت آپ زنانے میں ہوں گے، شاید ملاقات نہ ہو، اس لئے ابھی سے خدا حافظ اور الوداع۔

مولانا مفتی محمودؒ نے ان کا ہاتھ چھوڑ کر دایاں شانہ آہستہ سے دباتے ہوئے کہا: اللہ کے بندے! ابھی دوبارہ ملاقات ہوگی، یہ الوداع اور خدا حافظ کیسا! پھر ہنس کر پشتو میں کہنے لگے: "ولے خیال مکوہ زہ بہ نہ مرم" (دل میں اندیشہ مت لاؤ، میں نہیں مروں گا) مفتی صاحبؒ نے دوبار یہ فقرہ کہا اور اندر جانے کے لئے مڑ گئے۔ مولانا شیرانی چند لمحے وہیں کھڑے انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر واپس آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔

حضرت مفتی صاحب زندہ رہیں گے:

چند دن بعد...... مفتی صاحبؒ کی حج کے لئے ملتان اور کراچی روانگی کی اطلاع آئی، پھر ایک دن ان کی موت کی خبر آ گئی۔ مولانا شیرانی بھاگم بھاگ عبدالخیل پہنچے۔ وہاں سوگواروں کا ہجوم تھا۔ مفتی صاحبؒ کی بیٹھک میں قدم رکھا تو بے اختیار ان سے ۱۸ اکتوبر کی اپنی ملاقات کا منظر نظروں میں گھوم گیا اور کانوں میں ان کے آخری الفاظ گونجنے لگے "**ولے خیال مکوہ زہ بہ نہ مرم، ولے خیال مکوہ زہ بہ نہ مرم**" جذبات میں ہلچل سی مچ گئی اور پلکوں پر ننھے ستارے جھلملانے لگے، دماغ نے کہا: موت سے کسے رستگاری ہے، آج وہ کل ہماری باری ہے۔ دل سے آواز آئی مفتی صاحبؒ کو تو نہ مرنے کا زعم تھا...... "زہ بہ نہ مرم" پھر آج یہ کیا ہو گیا۔ اسی لمحے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور وہ آہستہ سے زیر لب بڑبڑائے مفتی صاحبؒ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا زہ

به نه مرم، میں نہیں مروں گا، وہ مر بھی نہیں سکتے جب تک یہ ملک باقی ہے، یہاں کے لوگ زندہ ہیں، تاریخ زندہ ہے، مفتی صاحبؒ بھی زندہ رہیں گے...... تاریخ بن کر...... لوگوں کے دلوں میں۔"

(قومی ڈائجسٹ، ص۵۲)

زعیمِ جہاد و عزیمت:

حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات پر ملک بھر کے اخبارات و جرائد نے اپنے ادارتی کالموں میں جس بڑے پیمانے پر اظہار رنج وغم کے ساتھ ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ کو خراج تحسین پیش کیا۔ وہ حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کے فوراً بعد اخبارات کے خصوصی نمبرات اور فوراً شائع ہونے والی سوانحات کا حصہ بن چکے ہیں۔ ہم یہاں کتاب کے آخر میں **وختامه مسک** کے طور پر صرف مرکزِ علم دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم اور ماہنامہ الحق کے مدیر استاذِ مکرم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی ادارتی تحریر نذرِ قارئین کر رہے ہیں

رفتم واز رفتنم یک عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چوں رفتم بزم برہم ساختم

واویلاہ، وامصیبتاہ، حیف صد حیف۔ ۴/ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ کو چودھویں صدی کا ٹمٹماتا ہوا چراغِ آخرِ شب اپنے ساتھ علم وعمل اور جہاد وسیاست کا ایک تابندہ و درخشندہ ستارہ بھی لے کر رخصت ہوا جو ایک عرصہ تک ہر نازک بحرانی اور ظلماتی لمحات میں ہدایت و رہنمائی کا پیغام اور مینارِ رشد و ہدایت بنتا رہا۔ ظلم وعدوان سے برسرِ پیکار قوتوں کے لئے ان کی ذات سنگِ میل رہتی

جو علمی و دینی، قومی و ملی کاموں کے لئے ایک قطب الرحی بن گئے تھے اور جو پاکستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں ملکی اتحاد و یکجہتی کی علامت اور یکتا و منفرد قدرِ مشترک بن چکے تھے اور جس نے اپنے وجود اور دل آویز شخصیت کی شکل میں دین و سیاست کا ایک ایسا حسین امتزاج پیش کیا جس نے عملاً دین و سیاست کی دوئی کو مٹا کر رکھ دیا اور جس نے اپنی متنوع اور جامع شخصیت کی صورت میں یہ ثابت کر دکھایا کہ قدیم علوم و فنون اور اسلامی مدارس کا ایک فارغ التحصیل مولوی عصر حاضر کے نہایت عیارانہ اور شاطرانہ جمہوری ماحول مغرب کی میکاؤلی سیاست کی فضا میں کس ہوشمندی، تدبر و بصیرت، وقار و متانت اور دیانت و امانت کے اصولوں اور مومنانہ صفات کو سینہ سے لگائے ہوئے بھی قائدانہ اہلیت و صلاحیت کے ساتھ ماحول پر غالب آ سکتے ہیں۔

علماء، جنہیں معاشرہ کا عضو معطل، ملائے مسجد و مکتب اور "دو رکعت کا امام" سمجھا اور بنایا گیا تھا اور آج اسے ملکی سیاست اور قومی معاملات کا ایک اہم ترین عنصر سمجھا جا رہا ہے اور کوئی چاہے یا نہ چاہے علمائے کرام کی اہلیت اور صلاحیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کا دائرۂ عمل مسجد و خانقاہ سے پھیل کر ایوانِ حکومت اسمبلی اور ہر سیاسی قومی پلیٹ فارم تک وسیع ہو گیا ہے۔ تو اس انقلابِ احوال میں حضرت مفتی محمود صاحب قدس سرہ العزیز کے طویل اور صبر آزما ہمہ پہلو جہاد اور جدوجہد اور روشن و تابناک کردار کا بھی بنیادی دخل ہے۔ اس مخلصانہ اور بے لوث جدوجہد نے مروجہ سیاست کے اطوار و انداز بدل دیئے اور ایک نئی نیو رکھ دی۔

صدی کی موت:

حضرت مفتی صاحبؒ کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے ایسی بے بہا اور بے حد و حساب صلاحیتیں جمع فرما دی تھیں جنہوں نے واقعی انہیں اس عہد کی تاریخ ساز شخصیت بنا کر رکھ دیا تھا، جنہیں دیکھ کر کسی نے سچ کہا ہے کہ آپ کی وفات حقیقت میں صدی کی موت ہے۔

وسیع النظر عالم، فقیہ النفس مفتی، روشن دماغ اور روشن ضمیر رہنما، ہمت و استقامت کے کوہِ گراں، جرأت و شجاعت کے سد آہنی جب کسی موقف پر ڈٹ جاتے تو پرائے تو کیا، اپنوں نے بھی اگر ہزار اختلاف رائے ظاہر کیا لیکن آپ کی سختی اور استقامت کو ذرا بھر جنبش نہ ہوتی اور وہ گردو پیش سے متاثر ہوئے بغیر اپنا سفر جاری رکھتے۔ اس کے ساتھ وسعتِ ظرف اور وسیع المشربی اور نرمیٔ مزاج، معاملہ فہمی اور عاقبت اندیشی ایسی کہ مختلف الخیال اور مختلف متضاد مکاتبِ فکر کو ساتھ لے کر چلتے اور منزل مقصود تک پہنچ کر دم لیتے۔ وہ برصغیر کی سب سے بڑی زوردار اور ہمہ گیر تحریک نفاذِ اسلام کے ہیرو اور قافلہ سالار تھے۔ اس وقت کروڑوں انسانوں نے، علماء اور سیاستدانوں نے ان کی قیادت و زعامت پر اعتماد کیا۔ وہ بلندیٔ نگاہ، دلنوازی گفتار اور جان پرسوز کا متاع سفر لے کر میر کاروان کی صفات پر پورے اترے۔

کاروانِ جہاد و عزیمت کے آخری جرنیل:

وہ چودھویں صدی کے اس قافلہ صدق و صفا اور کاروان جہادِ عزیمت کے آخری جرنیل تھے جسے شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ نے ترتیب دیا اور جس

کو حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے مضبوط اور مستحکم کیا اور جس کے سالاروں میں حضرت شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ شامل تھے۔ اس جماعت حقہ کی شخصیات کو برقرار رکھنے اور اس قافلۂ تسلیم و رضا کے جہاد و عزیمت، علم و عمل، استقامت و ایثار، اخلاص و قربانی کی امانتیں حضرت مفتی محمود صاحبؒ نے چودھویں صدی کے اختتام پر پندرھویں صدی کی دہلیز تک پہنچا دیں تاکہ نئی صدی میں اپنے قابل فخر اسلاف کے مشن پر چلنے والوں کے لئے یہ چیزیں متاع عمل اور سرمایہ نجات بنی رہیں۔ ان کی ہمہ گیر اور جامع شخصیت نئی صدی میں دعوت عمل کا کام دیتی رہے گی۔" (ماہنامہ الحق، اکتوبر نومبر ۱۹۸۰ء)

فانیؔ صاحب کا لافانی مرثیہ:

سفر آخرت کی عبرت انگیز کہانی کے آخر پر برادر مکرم حضرت مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی صاحب کا لافانی مرثیہ بھی نذرِ قارئین ہے۔

آفتاب علم و حکمت ضوء فشاں جاتا رہا ملت بیضاء کا مخلص پاسبان جاتا رہا
سوئے علیین مخدوم جہاں جاتا رہا مفتی محمودؒ محمودِ زماں جاتا رہا

حیف مے خانہ تہی ہے گردش ساقی نہیں
بزم آرائی نہیں، شوق جنوں باقی نہیں

آبروئے بزمِ گیتی نیرِ صبح زمن واقفِ رمز سیاست شمعِ تہذیبِ کہن
پیکر صدق و صفا تھے گوہر یکتائے فن جن کی شخصیت تھی اپنی ذات میں اک انجمن

نازش محمودؒ و قاسمؒ آہ رخصت ہوگیا
مردِ مومن مردِ حق آگاہ رخصت ہوگیا

کوہِ استقلال و ہمت اے ہمالائے وقار اے زعیم ملک وملت حق شناس وحق شعار
تاجدارِ فقر تو صبر و رضا کے شاہکار حضرت شیخ اسیر مالٹا کی یادگار

بوذرؓ و سلمانؓ کی زندہ نشانی آپ ہیں
عزم و ہمت میں مجدد الف ثانی آپ ہیں

و صلی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ محمد
و الہ و صحبہ اجمعین

القاسم اکیڈمی کی تازہ، عظیم اور شاہکار علمی پیش کش

شرح شمائل ترمذی

(تین جلد مکمل)

ایک نادر تحفہ

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ایک عظیم خوشخبری

حدیث کی جلیل القدر کتاب شمائل ترمذی کی سہل و دلنشین تشریح، سلجھی ہوئی سلیس تحریر، اکابر علماءِ دیوبند کے طرز پر تفصیلی درسی شرح، لغوی تحقیق اور مستند حوالہ جات، متعلقہ موضوع پر ٹھوس دلائل و تفصیل، رواۃِ حدیث کا مستند تذکرہ، متنازعہ مسائل پر تحقیق اور قول فیصل، معرکۃ الآراء مباحث پر جامع کلام، علماءِ دیوبند کے مسلک و مزاج کے عین مطابق، جمالِ محمد ﷺ کا محدثانہ منظر، نہایت تحقیقی تعلیقات اور اضافے، اردو زبان میں پہلی بار منصۂ شہود پر ...... جدید ایڈیشن میں تمام حوالہ جات اور عربی عبارات کا بھی اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

صفحات : **1608** .... ریگزین ...... قیمت : **750** روپے

القاسم اکیڈمی ' جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ سرحد پاکستان